

# سچا فریب

---



محی الدین نواب

# سچا فریب

اسے سرخ رنگ بہت پسند تھا، اس کی محبوبہ کو سرخ لہو میں ڈبو دیا گیا تو اس نے قسم کھائی کہ خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لے گا..... مگر قاتل نے اسے ایسا فریب دیا کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس فریب سے نہ بچ سکا۔

ڈاک بنگلے سے وہ حویلی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور ایک چھوٹی سی پہاڑی کی بلندی پر ننھے سے گھروندے کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ جب رات کی تاریکی گہری ہو جاتی اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تو اس وقت حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے داہرے ادھر سے روشن ہو جاتے۔ روشنی کے وہ چھوٹے چھوٹے وسیعے یوں لگتے جیسے رات کے کالے جسم پر کوڑھ کے ابلے دھبے پھیل گئے ہیں۔

بستی کے لوگوں کا خیال تھا کہ شائستہ وزانی شاید کوڑھ کی مریضہ ہے یا پھر ایک بد صورت عورت ہے جو اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے اوپری منزل کے کمروں میں روپوش رہتی ہے۔

آج تک کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کے ملازم بھی اسے چہرے سے نہیں پہچانتے تھے۔ کسی کو اوپری منزل میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف ایک لیڈی سیکرٹری مسز گرانٹ تھی جو اس کے ساتھ ایسٹ پون لندن سے آئی تھی۔ وہی کال ہل کی آواز پر اس کی خدمت گزاری کے لئے اوپری منزل پر جایا کرتی تھی۔

دو ماہ قبل وہ حویلی اور اس کے آس پاس کا علاقہ مظفر ٹی ایسٹ کھانا تھا۔ اس کے مالک راجہ مظفر علی تھے۔ پھر چائے کے باغات میں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں نے سنا کہ راجہ صاحب شہر میں ریس کے گھوڑوں پر داد لگاتے لگاتے دیوالیہ ہو گئے ہیں اور اب ٹی ایسٹ فروخت کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد چائے کے کارخانے سے پرانا بورڈ ہٹا دیا گیا اور درانی ٹی ایسٹ کا نیا بورڈ لگا دیا گیا۔ نام کی مناسبت سے اس حویلی میں کسی مرو ورائی کو آنا چاہئے تھا لیکن وہاں دو عورتیں آئیں۔ ایک عیسائی عورت اور دوسری مسلمان خاتون۔ وہ دونوں دو گھوڑوں کی گھسی میں آئی تھیں۔ کبھی کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ ٹی ایسٹ کا پرانا نیجر کارخانے کا چارج مین اور مشین مین ان کے استقبال کے لئے

حویلی کے پورچ میں موجود تھے مگر وہ اپنی نئی مالکہ کو نہیں دیکھ سکے۔ کبھی کا ورواڑہ کھول کر پہلے مسز گرانٹ باہر آئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملازموں کو دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ نیچک (نزویک) میں نئی آؤ۔ بس اندر جانا مانگنا ہے۔ راستہ وہ.....“

تمام لوگ دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ کبھی سے ایک برقعہ پوش خاتون باہر آئی اور تیزی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ وہ برآمدے میں پہنچ کر نقاب اٹے گی اور ایک مالکہ کی حیثیت سے اسٹیٹ کے پرانے ملازموں سے خطاب کرے گی، لیکن وہ آوم ہزار معلوم ہوتی تھی۔ برقعے کے پیچھے سے بھی اس نے سر اٹھا کر کسی کی جانب نہیں دیکھا۔ کبھی کی قید سے نکل کر آئی اور حویلی کے اندر جا کر روپوش ہو گئی۔

اس دن کے بعد سے اس عورت کو تو کیا، اس کے برقعے کو بھی کسی نے نہ دیکھا۔ منیجر اور چارج مین کی گھروالیاں اس سے ملنے آئیں لیکن مسز گرانٹ نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت سوری۔ ڈاکٹر کا آرڈر نئی ہے۔ بیگم صاحبہ کسی سے نئی ملے گا.....“

پتہ نہیں وہ کون ڈاکٹر تھا بس نے ایک عورت کو دوسری عورتوں کے سامنے آنے سے روک رکھا تھا۔ نئی مالکہ مئی روپوشی ہر ایک کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔

عورتیں، مردوں سے زیادہ تجسس پسند ہوتی ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طور سے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بڑی کوششوں کے بعد دو ماہ کے عرصے میں اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اس کا نام شائستہ درانی ہے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور وہ سات برس تک انگلینڈ میں رہنے کے بعد اپنے ملک واپس آئی ہے۔

لیکن اس چٹکی بھر معلومات سے کسی کو تسفی نہ ہوئی۔ سب ہی اپنے طور پر جھنجھلا کر سوچنے لگے۔ وہ بد صورت ہے، اسی لئے کسی کو اپنی شکل نہیں دکھاتی ہے۔ وہ کوڑھ کی مرینہ ہے۔ یا پھر انگریزوں کے ملک سے منہ کالا کر کے آئی ہے۔ اس کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ اوپری منزل میں اپنے گناہ کو چھپائے بیٹھی ہے۔

جتنے منہ اتنی باتیں..... باتیں بھی ایسی کہ شائستہ درانی کو ون بہ ون پراسرار

بنائے جا رہی تھیں۔ بستی کی عورتیں اور مروجہ حویلی کے قریب سے گزرتے تو مراٹھا کرپھاڑی کی بلندی پر ضرور دیکھتے۔ ایک نئی امید اور نئے یقین کے ساتھ دیکھتے کہ وہ معرہ حل ہو جائے گا لیکن حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں پر اندھے شیشے لگے ہوئے تھے۔ ان کے آہ پار کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دن کے وقت اوپری منزل کی کھڑکیاں اور بیرونی بالکونی کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ رات کو کھڑکیوں کے ایک دوپٹ کھل جاتے تھے۔ اگر موسم کچھ زیادہ ہی گرم ہوتا تو بالکونی کا دروازہ بھی کھل جایا کرتا تھا مگر پھر بھی وہاں رات کی تاریکی سیاہ پردے کی طرح پڑی رہتی تھی۔

اوپر اندھیرا اور نیچے روشنی..... چلی منزل میں چلی کے قہقہے روشن رہتے تھے۔ ان روشنیوں کی چکاچوند میں اوپر کی تاریکی اور گہری ہو جاتی تھی۔ وہاں ایک پرانی کماوت کے خلاف چراغ تلے اندھیرا نہیں تھا، بلکہ چراغ کے اوپر اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

ہاں، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بالکونی کے ساتھ والے کمرے میں موسیٰ شمعیں روشن ہو جاتیں۔ ان کی روشنی اندھے شیشوں سے ٹکرا کر باہر آنے کی کوشش کرتی اور کمرے کے محدود ماحول میں ہی اپنی مالکہ کی طرح قید ہو کر رہ جاتی۔ انسان ساری زندگی خاموشی اختیار کر لے۔ خود کو اسرار کے دبیز پردوں میں چھپا لے، پھر بھی شیس چھپتا۔ کبھی خاموشی کی کوئی اوابول پڑتی ہے یا کبھی اس کا ماحول طویل خاموشی سے بوکھلا کر چیخ پڑتا ہے۔

بند کمرے کا وہ ماحول اکثر ریکارڈ پلیئر کی زبان سے اس پراسرار لڑکی کے سزاج کی چغلی کھابا کرتا تھا۔

رات کی خاموشی میں ہلکی ہلکی موسیقی اوپری بالکونی سے سسکتی ہوئی آتی تھی۔ کسی گلوکار کی درو بھری آواز زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی، اندھے شیشوں کو پھلانگتی ہوئی حویلی کے اطراف منڈلاتی اور بد رتج و دھیمی پڑتی ہوئی پہاڑی کے دامن میں اتر جاتی تھی۔

”میں کہاں آ گیا ہوں۔“

اے میری بے حیا تقدیر! تو مجھے کہاں لے آئی ہے۔

میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر ایک گناہ گار کی طرح منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔

کیا مجھے موت نہیں آئے گی۔

میرے دشمن تو کہاں چلا گیا ہے؟

”ٹو میری جان کا دشمن ہے..... آ..... مجھے اس زندگی سے نجات دلاوے.....“  
 دیکارڈ پائیز پر کوئی مرو ہمیشہ یہی گیت گاتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے اندھے  
 شیشوں پر روشنی کے زاویے یوں بدلتے رہتے تھے جیسے وہ لڑکی شمع دان ہاتھ میں اٹھائے  
 ادھر سے ادھر کسی بے چین روح کی طرح بھٹک رہی ہے۔ یا پھر اپنے قاتل کو تلاش  
 کر رہی ہے۔

”آ..... میری جان کے دشمن مجھے اس زندگی سے نجات دلاوے.....“

☆-----☆-----☆

قیصر مراد ڈاک بنگلے کے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے دور بین لگائے  
 دور حویلی کی اوپری منزل کو دیکھ رہا تھا۔

رات کی تاریکی میں اسے اتنا ہی نظر آیا کہ اندھے شیشوں پر روشنی کے زاویے  
 بدل رہے ہیں۔ کوئی ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف لالٹین یا شمع دان اٹھائے  
 بھٹک رہا ہے۔ اس نے دور بین کو آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔  
 ”تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ لڑکی ہے؟ دیکھو شیخ! تمہاری رپورٹ نے مجھے  
 الجھا دیا ہے، تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر بتاؤ اس حویلی میں کوئی مرو ہے یا نہیں؟“

حامد شیخ نے اپنی واڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ صرف وہی لڑکی ہے، جو اس  
 حویلی کی مالکہ بن کر آئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں راجہ مظفر علی کا جیکرٹری رہ چکا  
 ہوں۔ حویلی کی خرید و فروخت کے سلسلے میں جو دستاویز تیار ہوئی تھی، اس میں خریدار کا  
 نام آمنہ شاکستہ درانی بنت رئیس احمد درانی لکھا گیا ہے۔ اس کے ماں باپ مرچکے ہیں۔  
 دوسرے بھائی یا بہنیں نہیں ہیں۔ وہ اتنے بڑے لی اسٹیٹ کی واحد مالکہ ہے۔“

قیصر مراد کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ آنکھوں سے الجھن اور چہرے سے  
 جھنجھلاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ وہ برآمدے سے پلٹ کر اندر چلا آیا۔ کمرے میں روزی تاش  
 کے پتوں سے کھیل رہی تھی۔ اس نے مراٹھا کر مراد کو دیکھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ  
 درمیانے قد کے لوگ ہمیشہ اسے سراٹھا کر دیکھتے تھے مضبوط بازو، چٹان کی طرح چوڑا  
 سینہ..... اور جنسی مخالف کے لئے اس کے چہرے اور شخصیت میں عرواگی کوٹ کوٹ  
 کر بھری ہوئی تھی۔

روزی نے اسے نشلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اسکاچ وپسکی کی بوتل سامنے سے اٹھائی اور اس کے لئے ایک بیگ بنانے لگی۔ قیصر مراد نے دور بین کو صوفے پر پھینک دیا۔ پھر اس نے روزی کے ہاتھ سے بوتل جھپٹ لی اور اسے منہ سے لگا کر غٹا غٹ پینے لگا۔ روزی نے مسکرا کر شکایت کی۔

”یو آر روڈ اینڈ رف..... عورتوں کے معاملے میں تمہیں سوچنا چاہئے۔“  
”پھوں!“ مراد نے ”اونٹہ“ کہنے کے انداز میں پھنکار ماری تو شراب کی ہلکی سی پھوار روزی کے چہرے پر آکر بکھر گئی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے اسکارف سے چہرے کو صاف کرنے لگی۔

”سوفٹ!“ وہ غرا کر بولا۔ ”میں یہاں دسیم احمد درانی کی لاش گرانے آیا ہوں اور تم سستی ہو کہ مجھے تم جیسی عورتوں کے لئے سوم کی طرح ملائم ہونا چاہئے۔ کرس آن یو..... یہاں بھی عورت، وہاں بھی عورت۔ وہاں دسیم احمد درانی کو ہونا چاہئے مگر اس کی جگہ کوئی شائستہ درانی منہ چھپائے بیٹھی ہے۔“  
وہ ایک جھٹکے سے روزی پر جھکا اور اس کی گروں کی پشت پر ہاتھ لے جا کر اس کے بالوں کو منہ میں جکڑ کر اپنی طرف اٹھانے لگا۔

”تم کیا مجھے احمق سمجھتی ہو۔ میری کھوپڑی سوفٹ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اس حویلی میں کوئی شائستہ نہیں ہے۔ وہاں دسیم چھپا بیٹھا ہے۔ میرا..... بزدل..... دشمن.....“

اس نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ روزی صوفے پر گر پڑی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے پھر اسی تشدد کا انتظار کر رہی ہو۔

مراد بوتل سے منہ لگا کر گھونٹ بھر رہا تھا۔ دو چار گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے پھر زہریلے سانپ کی طرح پھنکار ماری اور بھاری قدموں کی دھمک پیدا کرتا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے کہا۔

”میرے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی ہے۔ میں اس سردپنے کو حویلی کی چار دیواری سے کھینچ کر لاؤں گا۔ اس سستی کے لوگوں کو دکھاؤں گا کہ وہ مرد ہو کر برقعے میں چھپا پھرتا ہے۔ پھر..... پھر میں اسے گولی مار دوں گا.....“

ہوٹل پھر اس کے ہونٹوں تک پہنچ گئی۔ روزی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھتی ہوئی بولی۔

”سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ مراد۔ تم جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہے ہو۔ تمہیں قانون کی نظروں سے بچ کر انتقام لینا چاہئے۔“

وہ آنکھیں سیڑ کر روزی کو تکتے لگا۔ خالص وہسکی پینے کے باعث گھوپڑی گھوم رہی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی روزی بھی ادھر سے ادھر ڈول رہی تھی۔ اس نے ذرا سنجیدگی سے سوچا کہ وہ واقعی بمبک رہا ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر ایسا انتقام لینا چاہئے کہ سانپ بھی مرے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ وہ ڈمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور صوفے پر آکر دھپ سے بیٹھ گیا۔

روزی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کا بازو تھام کر بولی۔ ”وہ لڑکی دسیم کی بہن ہوگی۔ تم نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ اس کی ایک چھوٹی بہن تھی۔“

”جی، مگر اب نہیں ہے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ بارہ برس کی عمر میں مر گئی تھی۔“ اس نے ہوٹل کو منہ سے لگالیا۔

”تم نے سنا تھا مراد..... مگر سنی سنائی باتیں اکثر غلط ہو جاتی ہیں۔ تم یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ وہ زندہ ہے، ورنہ یہ شائستہ درانی کہاں سے آجاتی۔“

وہ ہوٹل کو ایک جھٹکے سے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”لعنت ہے شائستہ درانی پر۔ اگر وہ زندہ ہے تو میرے لئے کیا فرق پڑے گا۔ مجھے دسیم کی تلاش ہے۔ صرف دسیم کی۔ سات سال کے بعد اسے انگلینڈ سے واپس آنا تھا مگر اس کی بہن آئی ہے۔ وہ کم بخت کہاں مر گیا؟“

”ہو سکتا ہے کہ مر گیا ہو۔“

”نہیں!“ اس نے جھلا کر اسے پرے دھکیل دیا۔ ”وہ نہیں مر سکتا۔ مرے گا تو صرف میرے ہاتھوں سے..... میرے ہاتھوں سے.....“

وہ ہوٹل اٹھا کر پھر بیٹھ لگا۔ روزی نے ناراضگی سے کہا۔

”تم میرے ساتھ جنگیوں کی طرح پیش آؤ گے تو میں صبح واپس چلی جاؤں گی۔“

وہ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میرے پہلو میں آنے والی ہر عورت



یہی کہتی ہے۔ ٹھیک ہے، چلی جانا لیکن شائستہ سے ملنے کے بعد.....

وہ حیرانی سے بولی۔ ”میں اس سے کس طرح مل سکتی ہوں؟ سنا ہے کہ مسز گرانٹ کسی کو ڈرائنگ روم سے آگے بڑھنے نہیں دیتی ہے۔ وہیں سے باتیں بنا کر ٹال دیتی ہے۔“

”تم کو شش کرو گی تو وہ تمہیں نہیں ٹال سکے گی۔ تم کیسی عورت ہو؟ صرف مردوں کو بھانا جانتی ہو۔ کسی عورت کی کمزوری سے کھیلنا نہیں جانتی..... کل صبح تم ضرور وہاں جاؤ۔ وہاں چھپی ہوئی ہستی سے ملاقات ہو یا نہ ہو، مگر اس کی کوئی کمزوری ڈھونڈ کر لاؤ.....“

وہ بول اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ روزی بڑی لگن سے اسے دیکھ رہی تھی اور اپنا ہاتھ گردن کی پشت پر لے جا کر ہولے ہولے اس جگہ کو سلا رہی تھی، جہاں مراد لے اس کی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ وہاں دھیمادھیماسا درود اور مٹھی مٹھی سی جہن ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بل کھاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔

مراد دروازے کی جانب پشت کئے ایک سوٹ کیس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ روزی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلنگ کے پاس آئی اور انگڑائی لیتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ انگڑائی کے کھنچاؤ پر ذرا دیر تک اس کا بدن چٹخا رہا۔ پھر اس نے کروت بدل کر مراو کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شراب دو آتشہ کے لئے نمود ہی کشاں کشاں چلا آئے گا لیکن مراو کے سلٹنے سوٹ کیس سے جھانکنے والے سوخ لباوے کو دیکھتے ہی وہ مرجھا گئی۔

وہ سرخ رنگ کا ادنیٰ لبادہ تھا۔ مراد اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھائے بڑے ہی جذباتی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں کچھ ٹوٹنے کی لالی تھی اور کچھ سرخ لباوے کا عکس جھلک رہا تھا، جن کی وجہ سے آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں۔ پھر وہ لبوے کو سینے سے بھیج کر بڑوانے لگا۔

”تم میری پہلی اور آخری محبت تھیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ میں انتقام لوں گا.....“

درمیانے قد، بھرے بھرے گداز جسم اور گوری رنگت کا نام ٹینہ تھا۔

جب وہ سرخ لہادے کو شانوں پر ڈال کر اسٹیج پر آئی تو لہادے کی لالی اس کی گوری رنگت میں کھل کر دھیسے دھیسے حسن کو شعلے کی طرح بھڑکا دیتی تھی۔ سامعین اس کی مسحور کن آواز میں گیت سننے آتے تھے اور اس کے حسن کو دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتے تھے۔

ہزاروں لاکھوں سامعین کے دلوں پر حکومت کرنے والی حسینہ ان دنوں قیصر مراد پر مہمان تھی۔ مراد کا وہ پہلا عشق تھا اور نامراد ٹینہ کا ساتواں عشق..... کبھی عمر ہو اور محبت میں بھی کچا پن ہو تو محبوب کے عیب نظر نہیں آتے۔ مراد بائیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کے مقابل کتنی تجربہ کار عورت ہے یہ اس نے کبھی نہیں سوچا، بلکہ ٹینہ نے اپنی آرزوہ اداؤں سے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

والدین نے اسے سمجھایا کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے لیکن جوانی میں والدین کی نصیحتیں صدیوں پرانی معلوم ہوتی ہیں۔ دنیا والوں نے طعنے دیئے تو اس نے سوچا کہ ظالم زمانہ اپنی حادث کے مطابق محبت کا دشمن بن گیا ہے۔ ٹینہ نے اسے اس طرح اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا کہ اسے ساری دنیا جھوٹی اور فریبی نظر آتی تھی۔

وہ اپنی زلفوں کی چھاؤں میں بڑے ہی درد بھرے انداز میں کستی تھی۔ "یہ دنیا والے میری شہرت سے جلتے ہیں۔ مجھے خواہ خواہ بدنام کرتے ہیں کہ میں عاشق بدلتی رہتی ہوں۔ تمہاری قسم مراد! جن عاشقوں کے نام لے کر مجھے بدنام کیا جاتا ہے، ان سے میرے صرف کاروباری تعلقات تھے۔ ان میں سے کوئی میری تنہائی میں کبھی نہیں آیا۔ تم پہلے شخص ہو۔ تم میرے دل و دماغ پر چھا گئے ہو۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ قسم کا کہ کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑو گے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ تم بھی میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہو۔ اب میں نے پہلی بار تمہیں سرخ لہادے میں دیکھا تو میرے دل نے کہا کہ تم صرف میرے لئے پیدا کی گئی ہو۔ صرف میرے لئے..... مجھے سرخ رنگ بہت پسند ہے۔ اس رنگ کا عکس تمہارے چہرے پر پڑتا ہے تو تم سرخ گلاب کی طرح کھل جاتی ہو۔"

"مگر تمہیں سرخ رنگ پسند ہے تو میں ہمیشہ اسی رنگ کا لباس پہنا کروں گی۔"



لیکن اس کا قیام کہاں ہو گا؟

”تمہارے ہاں۔ اگر وہ میرے پاس رہے گا تو گھر کے بزرگ کسی پٹی نصیحتیں سنانا کر اسے مولوی بنا دیں گے۔ یہ تمہاری کوٹھی ہے۔ یہاں ہماری مخالفت کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ تمہارا دوست جب تک چاہے یہاں رہ سکتا ہے۔“

دوسرے دن وہ دسیم احمد ورائی کو لینے ایئر پورٹ گئے۔ اسے دیکھ کر شینہ ذرا الجھ ہی گئی، کیونکہ دسیم احمد ورائی کا نام بہت بڑا تھا اور جسم نہایت ہی مختصر وہ چھوٹے سے قد اور دبے پتے جسم کی وجہ سے ایک کم عمر چھوٹا نظر آتا تھا۔ چہرے پر واڑھی مونچوں کی جگہ مکمل روئیدگی نہیں تھی۔ غور سے دیکھنے پر کہیں کہیں ریشم جیسے مین سنہری بال افشاں کی طرح جھلک جاتے تھے۔

تعارف کے دوران شینہ نے اس سے مصافحہ کیا تو دسیم کے ہاتھ بالکل سرو تھے۔ وہ ایک عورت سے ہاتھ ملانے وقت بری طرح جھینپ رہا تھا۔ مراو نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جساتے ہوئے کہا۔

”یار! کیا شرماتے ہو۔ یہ تمہاری ہونے والی بھالی ہیں۔ ان سے شراؤ گے تو کام نہیں چلے گا۔ تمہیں انہی کی کوٹھی میں قیام کرنا ہے۔“

دسیم نے خوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی قیام کے سلسلے میں رسمی طور پر شینہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ شینہ اسے اچھی نہیں لگی۔ یا پھر وہ سرو مری برتنے کا ماوی تھا۔

دہ تینوں کار کی اگلی حیث پر آکر بیٹھے تو شینہ ان کے درمیان تھی۔ وہ دائیں طرف سے مراو کو اور بائیں طرف سے دسیم کو اپنے بدن کی نرمی و گرمی کا احساس دلا رہی تھی۔ دسیم سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جگہ کی تنگی کے باعث سمٹنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شینہ اس نوجوان میں کبھی دلچسپی نہ لیتی لیکن مراو سے وعدہ کر چکی تھی کہ دسیم کو آدمی بنانے میں اس کی مدد کرے گی۔ اسی خیال سے وہ جان بوجھ کر دسیم کی طرف زیادہ جھکی ہوئی تھی۔ مراو جو کام دوسری لڑکیوں سے لینا چاہتا تھا، وہ شینہ خود ہی انجام دے رہی تھی لیکن اس طرح کہ مراو کو اس کے ہر جانی پن کا علم نہ ہو۔

وسیم ایک ماہ کے لئے آیا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران ٹینے اپنے تمام آزمودہ حربے استعمال کرتی رہی اور وسیم اس سے بدکتا رہا۔ جتنا وہ دور ہوتا تھا اتنی ہی اس کی ضد بڑھتی جاتی تھی۔ عورت ناکام ہو کر کبھی ہمت نہیں ہارتی بلکہ اس بار کو جیت میں بدلنے کے لئے پلٹ پلٹ کرنے نئے نئے واؤ آزماتی رہتی ہے۔

وسیم اس کے ہاں مہمان بن کر مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اپنی میزبان سے کھل کر نفرت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روز سراسر سے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے شکایت کی۔ ”مراد! تم جہاں بھی مجھے تفریح کے لئے لے جاتے ہو، وہاں ٹینے کو بھی ساتھ کر لیتے ہو کبھی ہم دونوں کو بھی تنہائی میں وقت گزارنا چاہئے۔“

اس نے ہسکرا کر کہا۔ ”ٹینے! ازاے سویٹ گرل۔ اس کے بغیر کسی تفریح میں مزہ نہیں آتا۔“

وسیم نے اداسی سے اسے دیکھا، پھر ناگواری سے بولا۔ ”تم اسے لڑکی کہتے ہو، مجھے تو وہ کوئی ادھر عمر کی عورت نظر آتی ہے۔ نہ جانے تمہیں اس کی کون سی اداسپند آگئی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

مراد نے چونک کر اسے دیکھا اس وقت وسیم کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ ٹینے کی برائی سن کر اسے ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیتا۔ اس نے غصے کو قمعوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔ ”تم ابھی چھو کرے ہو۔ لڑکی اور عورت کے فرق کو سمجھ سے زیادہ نہیں سمجھتے ہو۔ بعض عورتیں بعض معاملات میں لڑکیوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ تعجب ہے کہ تم ٹینے سے نفرت کیوں کرتے ہو؟ اچھا چچ بٹاؤ جب وہ سرخ یا نارنجی رنگ کا لباس پہنتی ہے تو کیا اس وقت بھی تمہیں خوبصورت نہیں لگتی؟“

وسیم نے سر جھکا کر اہستگی سے کہا۔ ”میں بھول گیا تھا کہ تمہیں سرخ رنگ پسند ہے۔ تم ٹینے سے نہیں، اس کے اوپر چڑھے ہوئے سرخ غلاف سے عبت کرتے ہو۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔ ”میں ٹینے سے محبت کرتا ہوں۔ جو محبت کرتے ہیں وہ محبوبہ کی سجاوٹ کو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ مجھے سرخ لباس میں بہت اچھی لگتی ہے۔ میری نظروں میں یہ لباس ہی اس کی سجاوٹ ہے۔ اس کا سنگار ہے۔ اب کبھی وہ ایسا لباس پہنے تو تم اسے میری آنکھوں سے دیکھنا۔ وہ تمہیں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آئے

گی۔“

وسیم خاموشی سے اور سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے دوست کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کی خاموشی نے بحث کو اسی وقت ختم کر دیا لیکن اس کے دل و دماغ میں عجیب سی الجھن مچی ہوئی تھی۔ مراد کی یہ بات دماغ میں گونج رہی تھی کہ شینہ سرخ لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

اس رات شینہ اور مراد تھا تفریح کے لئے گئے۔ وسیم سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ اس نے مراد سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسرے دن واپس چلا جائے گا۔ شینہ کو اس کی داپسی کا علم ہوا تو وہ بے چین ہو گئی۔ ایک نو عمر لڑکا اسے شکست دے کر چلا جائے اور اس کے تمام حروں کو رنگ آلود کر دے، یہ تو بینہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی کاحیالی کی جدوجہد کے لئے صرف ایک رات..... ایک آخری رات رہ گئی تھی۔ وہ اس رات کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہذا اس نے بھی مراد سے جمانہ کیا کہ صبح اسے ریکارڈنگ کے لئے جانا ہے۔ وہ رات کو زیادہ دیر تک باہر نہیں رہے گی۔ چونکہ ریکارڈنگ کا معاملہ تھا اس لئے مراد اسے نہ روک سکا۔ ڈر کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

شینہ اپنی کونھی میں آئی اور سیدھی وسیم کے کمرے میں چلی گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ بستر کی ٹمکن آلود چادر پنا رہی تھی کہ وہ بہت دیر تک وہاں پڑا کباب تیج کی مانند کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے بستر کو چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔ یعنی وہ ابھی ابھی کیس گیا تھا۔ اس نے ہاتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا وہاں بھی وہ موجود نہیں تھا۔

شینہ کمرے سے باہر آگئی اور یہ سوچ کر اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد ملازمہ کو بلا کر اس کے متعلق پوچھے گی لیکن وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر ٹھک گئی۔

دردازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں ہر طرف سرخ اور نارنجی رنگ کے ملبوسات بکھرے ہوئے تھے اور ان غطلوں کی طرح دھکتے ہوئے کپڑوں کے درمیان وسیم کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہی سرخ لبوہ تھا جسے شینہ پن کر اسٹیج پر جلیا کرتی تھی۔ لبوہ کی پشت پر سنہری گوت سے ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ وہ دروازے کی طرف پشت



”کیوں آئے تھے میرے کمرے میں..... بولو کیوں آئے تھے؟ بزدل.....“

نامرود.....؟“

ایک عورت کی زبان سے نامرود کا لفظ دھماکہ بن کر اس کی کھوپڑی میں گونجنے لگا۔ اس نے تڑپ کر ٹینے کو قالین پر گر ادیا اور اس کے منہ پر طمانچے اور گھونٹے مارے ہوئے بیچنے لگا۔ ”میں مرد ہوں..... میں مرد ہوں..... بولو۔ بولو میں مرد ہوں۔“

مار پڑتے ہی ٹینے کے دماغ میں بات آگئی کہ اسے کس طرح بھڑکایا جاسکتا ہے۔ وہ پھر لٹکارتی ہوئی بولی۔ ”تم مرد نہیں ہو۔ میں ہزار بار کہوں گی کہ تم عورت ہو..... عورت سے بھی گئے گزروے ہو.....“

دسیم کا سارا بدن تھرا گیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”عا..... عورت۔ نہیں..... مم..... میں عورت نہیں ہوں..... لک۔ کون کتاب ہے کہ میں عورت.....“

وہ فرش پر بیٹھی ہوئی بولی۔ ”عورت..... عورت..... تم عورت ہو.....“ وہ تیزی سے پلٹ کر ہانپتے کانپتے سنگار میز پر رکھے ہوئے پیتل کے گلدان کے پاس آیا۔ اس کے پیچھے ٹینے چیخ رہی تھی۔

”میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میرے پاس آؤ ورنہ میں ساری دنیا سے کہہ دوں گی کہ تم عورت ہو۔ اسی لئے ایک عورت سے دور بھاگتے.....“

کھٹاک کی زور دار آواز کے ساتھ پیتل کا گلدان اس کی پیشانی سے ٹکرایا اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ویدے پھیل گئے۔ پیشانی سے خون کی دھاریں بہتی ہوئی آنکھوں میں اترنے لگیں۔

دسیم نے دونوں ہاتھوں سے گلدان کو اپنے سر سے اونچا کیا اور جنوبی انداز میں چیخ کر بولا۔ ”میں مرد ہوں..... بول میں.....“

کھٹاک! دوسری بار گلدان اس کی ناک پر پڑا اور وہ پیچھے کی طرف قالین پر پڑے ہوئے سرخ لبادے پر گر کر پھڑپھڑانے لگی۔ اس کا چہرہ لبو سے تر ہو گیا تھا۔ ناک سے خون کا باریک فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی کراہوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جان کنی کے وقت کتنی اذیت میں مبتلا ہے۔



اے تڑپے دیکھ کر دسیم کے ہاتھوں سے گلہان چھوٹ گیا۔ اس کی وحشت گھبراہٹ میں بدل گئی اور اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ ذرا دیر بعد شینہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے بہتا ہوا لہو لباوے پر آ رہا تھا اور اس کی سرخی سے ہم رنگ ہو رہا تھا۔ چاروں طرف بکھرے ہوئے سرخ کپڑے دسیم کی آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں چاروں طرف خون ہی خون پھیلا ہوا ہے۔

اسی وقت گھری ملازمہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ دروازے پر کھڑی خوفزدہ نظروں سے کبھی دسیم کو اور کبھی اپنی مالکن کو دیکھ رہی تھی۔ دسیم لڑکھڑاتا ہوا اس کی جانب بڑھا تو وہ چیخ ہوئی بھاگ گئی۔ دسیم کے بدن پر ایسی کچکی ملاری ہو گئی تھی کہ وہ اسے روکنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ نہ سکا۔ وہ ڈمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دروازے تک آیا اور دیوار کا سہارا لے کر جلدی جلدی باہر کی طرف جانے لگا۔ شینہ کی لاش نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کے دل کی گھبراہٹ اور وحشت ذرا کم ہو گئی۔ کم از کم اتنی قوت بحال ہو گئی کہ اب وہ ہوش دحواس سے کام لے کر قانون کی پہنچ سے دور جاسکتا تھا۔

وہ ہانپتا کانپتا اور ڈمگاتا ہوا پورچ میں آیا۔ شینہ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کار میں بیٹھ کر اسے اشارت کیا اور دوسرے ہی لمحے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔

دو گھنٹے بعد شینہ کی کوٹھی میں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی تھی۔ واردات والے کمرے میں ملازمہ پولیس انسپکٹر کو اپنا بیان دے رہی تھی کہ ایک سپاہی قیصر مراد کو بھی بلا کر لے آیا تھا۔ شینہ کی لاش دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ غصے سے کانپنے لگا۔ ملازمہ کی چشم دید گواہی اور دسیم کے فرار نے اسے یقین دلادیا تھا کہ دسیم نے ہی دوستی کی آڑ میں اس کی محبت کا خون کیا ہے۔ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”مسٹر مراد! قاتل اپنا سامان چھوڑ گیا ہے، اس کے سامان کی تلاشی لینے پر یہ دو تصویریں ملی ہیں۔ آپ شناخت کریں۔ کیا یہی دسیم احمد ورائی ہے؟“

اس نے ایک تصویر بڑھا دی۔ مراد نے اسے لے کر دیکھا اور نھسے اور نفرت سے



معلوم ہوا کہ اس کے تیار باپ نے اپنی کھاؤ کی فیکٹری فروخت کر دی ہے۔ ایک بار میں پولیس انسپکٹر کے ہاتھ اس بوڑھے سے ملے گیا تھا۔ دوسری بار تنہا گیا تو وہ کوٹھی خالی ہو گئی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یو کے چلا گیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں باپ بیٹے ملک سے باہر ملیں گے اور کسی دوسرے ملک میں اپنے لئے رہائشی سہولتیں حاصل کر لیں گے۔

میں اس کی تلاش میں ملک سے باہر نہ جاسکا۔ ڈیڈی نے میرا پاسپورٹ چھین کر رکھ لیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کی تو وہ مجھے حاق کروں گے۔ سب پیسوں کا کھیل ہوتا ہے اور میں پیسوں کے لئے باپ کا محتاج تھا۔

اب میں محتاج نہیں ہوں۔ ڈیڈی کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں آزاد ہوں۔ بنیاں چاہوں جاسکتا ہوں لیکن قاتل کے پیچھے جانے کی نوبت نہیں آئی۔ راجہ مظفر علی کے سیکرٹری حامد شیخ سے میری پرانی واقفیت ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ریکس احمد ورائی کی صاحبزادی شائستہ ورائی راجہ صاحب کی فی اسٹیٹ خرید رہی ہے اور یہ خریداری مسز گرانٹ کے ذریعے عمل میں آرہی ہے۔ کیونکہ شائستہ پردے کی پابند ہے۔

مگر شائستہ دوبارہ زندہ کیسے ہو گئی؟ اس کے باپ نے تو کہا تھا کہ وہ بارہ سال کی عمر میں اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی تھی.....

ہاں۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔ ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ مر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے کسی جھگڑے کی بنا پر علیحدگی اختیار کر لی ہو اور شائستہ اپنی ماں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے انھیال چلی گئی ہو۔ الفاظ کے میرے پھیر سے معنی ایک دم بدل جاتے ہیں۔ میں نے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ شائستہ زندہ تھی..... اور اب بھی زندہ ہے۔

لیکن وہ اپنے آپ کو کیوں چھپا رہی ہے۔ مغربی ممالک میں رہ کر آئی ہے اور پردے کی پابندی کر رہی ہے۔ یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے بلکہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ شائستہ نہیں ہے۔ دسیم نے قانون کے ڈر سے میرے خوف سے خود کو برتے میں چھپا رکھا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے۔

مگر نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ قانون اٹھانا نہیں ہے۔ دسیم میک اپ اور گٹ اپ



اس نے پلٹ کر روزی کی جانب دیکھا۔ وہ بے چاری انتظار کرنے کرتے سو گئی تھی۔ اس نے سرخ لباس کو سوٹ کیس میں رکھ دیا اور وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ دوسرے کمرے کے ایک صوفے پر دور بین رکھی ہوئی تھی وہ دور بین اٹھا کر پھر ایک بار برآمدے کی طرف جانے لگا۔

آخر شب کی ہواؤں میں خنکی آگئی تھی۔ تاریکی بدستور مسلط تھی۔ دور پہاڑی کی بلندی پر حویلی کی نگلی منزل اندھیرے میں ڈوب گئی تھی لیکن اوپری منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے اندھے شیشے روشن تھے۔ وہ دور بین کو آنکھوں سے لگا کر دیکھنے لگا۔

شائستہ..... یا..... دسیم؟

اندھے شیشوں کے پیچھے وہ پراسرار ہستی جاگ رہی تھی یا جاگ رہا تھا..... ادھر مراد کی آنکھوں سے فینڈاڑ گئی تھی۔ ادھر روشن شیشے رت جگامنا رہے تھے۔ ان شیشوں کی روشنی بھی تیز ہو جاتی تھی اور کبھی دھیمی پڑ جاتی تھی۔ کوئی شمع ان اٹھائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جا رہا تھا..... یا..... جا رہی تھی۔ مراد دیکھ رہا تھا اور کسی ایک نتیجے تک نہ پہنچنے کے باعث جھنجھلا رہا تھا۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

وہ صبح دیر تک ہوتا رہا۔ دس بجے روزی نے آکر اسے اٹھایا۔

”مراد! اٹھو۔ دس بج گئے ہیں۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر ہلانے لگی۔ اس نے دوسری کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

”ہٹو مجھے مرنے دو۔“

”واہ! اچھی نیند ہے۔ میں حویلی سے واپس آگئی اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔“

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر بڑے اضطراب سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچے ہوئے پوچھا۔ ”تم گئی تھیں؟“

”ہاں!“

”فرسٹ فلور میں؟“

”نہیں! نیچے ڈرائنگ روم میں۔ میں نے مسز گرانٹ سے کہا کہ میں ایک ٹورسٹ گروپ کے ساتھ آئی ہوں۔ یہ پرانی حویلی دیکھ کر بہت سے راجہ مہاراجاؤں کی سنی سنائی باتیں یاد آئیں۔ میں اس حویلی کو اندر سے دیکھنا چاہتی تھی اس لئے یہاں آگئی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مجھے یہاں کی سیر کرا دیجئے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔“

مسز گرانٹ نے اپنے مسلح باڈی گارڈ سے فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم پرفیکٹ انفارمیشن لینا نالگنا.....“ پھر اس نے ملازم لڑکے سے کہا۔ ”بوائے! دس روزی کو ہمارا اسٹیٹ کافرست کلاس چائے مارو۔“

اس کی بولی سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ مسز گرانٹ نے مجھے گھور کر دیکھ کر پھر وہ پلٹ کر فرسٹ فلور کے زینے کی طرف چلی گئی۔

قیصر مراد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم اوپر ہی منزل میں گئی تھیں یا نہیں؟ مجھے پوری تفصیل سے کہانی نہ سناؤ۔“

”نہیں مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں ملی۔“

”کیوں؟“

”اب اس کیوں کا ہواب دوں گی تو تم کو گے کہ کہانی ساری ہوں۔“

اس نے بے بسی سے ہونٹوں کو بھیج کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”اچھا بولو..... کیا

بولنا چاہتی ہو؟“

روزی نے کہا۔ ”دو منٹ کے بعد وہ بلائی گارڈ فون کا ریسیور رکھ کر میرے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے خرا کر بولا۔ آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ اسٹیٹ پولیس نے بتایا ہے کہ پچھلے دو ماہ سے یہاں کوئی فورمنٹ گروپ نہیں آیا ہے۔ کل شام سے راجہ مظفر علی کا سابقہ سیکرٹری حامد شیخ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت کے ساتھ ڈاک بنگلے میں آکر ٹھہرا ہوا ہے۔ نوجوان عورت کا حلیہ آپ سے ملتا ہے۔ کیا آپ وہی محترمہ ہیں؟“

میری گردن جھک گئی۔ ایک جھوٹ کی وجہ سے مجھے شرمندگی اٹھانی پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ اس انداز میں میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا کہ گھبراہٹ میں ’میرا کوئی بات نہ بنا سکی۔ اس نے کہا۔

”آپ کے لئے چائے آ رہی ہے۔ چائے پینے کے بعد واپس چلی جائیں۔ حامد شیخ کی وجہ سے نرمی برت رہے ہیں۔ ورنہ اب تک پولیس نہایت احترام سے آپ لوگوں کو اسٹیٹ کے باہر چھوڑ آتی۔“

یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ ایسی تو بہن آمیز باتیں سن کر مجھے وہیں سے چلے آنا چاہئے تھا لیکن میں نے تمہارے فائدے کی خاطر یہ تو بہن بھی برداشت کر لی۔ میں نے سوچا کہ شاید چائے پینے تک مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے.....“

مراد نے پھر جھلا کر کہا۔ ”تمہاری چائے کی ایسی کی تیزی کم سے کم احتیاط میں کو۔ کیا کام کی بات معلوم ہو گئی؟“

”ہاں۔ مسز گرانٹ اوپر سے رومی کی ٹوکری اور سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھرا ہوا ایش ٹرے لے کر آئی اور ملازم سے بولی کہ انہیں ڈسٹ بن میں نے جاکر پھینک دے۔ سگریٹ کے ٹوٹے دیکھ کر میں چونک گئی۔ سوچنے کی بات ہے مراد۔ جو مسلمان لڑکی پردے





”جب میں حویلی میں سے باہر آرہی تھی تو مسز گرانٹ نے بالکونی سے کوچوان کو آواز دے کر کہا تھا کہ کبھی تیار رکھے۔ شائستہ باگنے کے بعد چائے کے باغات دیکھنے جانے گی۔“

مراد اچھل کر پلنگ سے اتر گیا اور اپنے کپڑے پہنتے ہوئے بولا۔ ”شائستہ تمہیں دسیم اپنے باغات کو دیکھنے جانے گا۔ تمہیں یہ بات پہلے کہنا چاہئے تھی۔ بہر حال میں اسے راستے میں گھیر لوں گا۔“ کپڑے پہننے کے بعد وہ جوتے پہننے لگا۔ ”تم سادہ شیخ کے ساتھ اس کی گاڑی میں واپس چلی جاؤ۔ ورنہ پولیس تمہیں بھی میرے جرم میں ملوث کرے گی۔“

”اسٹیٹ پولیس ہم تینوں کو جانتی ہے۔“

”ان کے جاننے سے کچھ نہیں ہو گا۔ سادہ شیخ کہہ دے گا کہ اسے میری نیت کا علم نہیں تھا کہ میں یہاں کسی کو قتل کرنے آیا ہوں اور تم ایک بکنے والی چیز ہو۔ تمہیں کوئی شریف دولت مند بھی خرید سکتا ہے اور مجھ جیسا مجرم بھی۔ تم بھی یہی بیان دے دینا کہ تمہیں میری بجرانہ نیت کا علم نہیں تھا۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا سوٹ کیس کے پاس آیا اور اسے کھول کر جلد بازی میں کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور آگیا۔ روزی نے قریب آکر کہا۔

”مراد! میں اچھی عورت نہیں ہوں مگر میرا دل اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم قانون کو ہاتھ میں لو۔ دسیم خود ایک مجرم ہے۔ تم اسے قانون کے حوالے کر کے انتقام لے سکتے ہو۔“

”دور ہو!“ اس نے ایک طرف اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”کیا عدالت اسے ایسی سزا دے سکتی ہے کہ وہ شینہ کی طرح تڑپ تڑپ کر مرے؟ میں۔ اسے ایسی سزا صرف میں ہی دے سکتا ہوں۔ میں اسے ایسی اذیت تاک.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ دور بہت دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے دی تھیں۔ وہ دونوں کان لگا کر سننے لگے۔ روزی نے کہا۔ ”شاید وہی بکھی آرہی ہے۔“

مراد دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ دور کوئٹہ کی نشیبی سڑک پر دو گھوڑوں کی ایک بکھی دوڑی آرہی تھی۔ بکھی کے آگے چھپے چار گھوڑوں پر اسٹیٹ کے سپاہی اور ایک انسپکٹر نظر آرہے تھے۔



دردی سے ہلاک کیا تھا اور قانون کے ہاتھوں سے بچ کر سرحد پار چلا گیا تھا۔ میں اس قاتل کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ شائستہ درانی کے نام سے اس ایٹھ کو خریدنے والا وہی قاتل ہے اور وہ..... اس وقت..... اس کوچ میں موجود ہے۔“

انسپکٹر نے تبھی کی طرف سے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیا تم نشے میں ہو؟ اس کوچ میں درانی ایٹھ کی معزز مالکہ شائستہ بیگم ہیں۔“

”کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا ہے؟“  
انسپکٹر نے قدرے پریشان ہو کر تبھی کی جانب دیکھا، پھر ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔  
”کسی معزز پردہ نشین خاتون کو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔“

مراد نے تنہی سے مسکرا کر کہا۔ ”میری درخواست ہے کہ آپ کسی لیڈی کانشیل کو بلائیں۔ وہ تو بیگم صاحبہ کو دیکھ سکتی ہے نا؟“

اتنے میں تبھی کا دروازہ کھلا۔ مسز گرانٹ باہر آتی ہوئی ہوئی۔ ”دبٹ انسپکٹر! مرس اس نوجوان کو میسٹرفائی کرنا مانگتا ہے..... کم آن مرس! ہم پہلے بولا کہ پبلک کے سامنے میں آؤ۔ ڈرنے کا شرم کرنے کا بات نئی ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک سیاہ برقعہ تبھی سے اترنے لگا۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ مراد دیکھ رہا تھا، برقعے سے باہر جو ہاتھ نظر آرہے تھے، وہ گورے، چکنے اور طام تھے۔ صرف وہ دوسبک اور نازک سے ہاتھ بتا رہے تھے کہ برقعے کے اندر ایک مکمل دھیزہ ہے، جس کے نسوانی وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکے گا۔

وہ برقعے کے پیچھے سر اٹھائے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ برقعے کے بہن کھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ نارنجی رنگ کی شلوار قبض اور دپٹہ اجلی دھوپ میں شعلوں کی طرح آج دینے لگا۔ لباس کا وہ رنگ مراد کی کمزوری سے کھیل رہا تھا۔ اس کی موج اور سمجھ کے مطابق لڑکی جوان ہو اور خوبصورت ہو تو اس رنگ کے لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

پھر اس نے اپنے پرے سے نقاب اتار کر پھینک دی..... وہ شائستہ تھی۔  
اس کے حسین کھڑے کو دیکھ کر مراد ایک ساعت کے لئے سانس لینا بھول گیا۔

گلابی گلابی چہرہ، گلاب کی پتیوں جیسے نازک ہونٹ، ستواں ناک، بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں میں کاجل کی دھار تلوار سے زیادہ خطرناک تھی۔

وہ آنکھیں مراد کو دیکھ رہی تھیں اور مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ آج سے سات سال پہلے اس نے شائستہ کی تصویر دیکھی تھی۔ اس وقت وہ بارہ برس کی تھی۔ ہو ہوا اپنے بھائی کی شکل پر لگی تھی۔ اب بھی اس کے چہرے سے بھولا ہوا دسیم جھانک رہا تھا۔ مگر کئی وہ اور کہاں یہ۔ یہ تو صنف نازک کی نزاکت اور شگفتگی کا ایک ایسا جیسا جاگتا نمونہ تھی کہ کوئی سنگ تراش اس کے جسم کی شادایاں تراشنے بیٹھتا تو اس کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے یا پھر وہ خود ہی پتھر کی طرح ساکت ہو جاتا، جیسے مراد ہو گیا تھا۔

”مراد“ شائستہ نے مترنم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تمہارا شبہ دور ہو گیا؟“

مراد نے اس سے پوچھا۔ ”دسیم کہاں ہے؟“

وہ ذہن لب مسکرائی۔ جواب دینے کے لئے اس کے ہونٹوں میں لڑزش پیدا ہوئی۔ پھر اس نے مسز گرانٹ کی جانب پلٹ کر کہا۔ ”آپ سپاہیوں کے ساتھ آگے چلی باتیں میں پیچھے پیچھے آتی ہوں۔ مراد مجھ سے ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں مراد؟“

مراد نے اثبات میں سر ہلادیا۔ مسز گرانٹ کبھی میں بیٹھ گئی۔ تمام سپاہی کبھی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ شائستہ نے کومار کی سڑک پر آکر کہا۔

”آؤ مراد۔ میں ایک عرصے کے بعد کھلی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ ایک عرصے کے بعد تمہیں دیکھتے ہی پردے سے باہر آگئی ہوں۔“

وہ شائستہ کے ساتھ سڑک پر چلتے لگے۔ روزی تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی انہیں دیکھتی رہی، پھر ایک سرد آہ بھر کر ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگی۔

وہ دونوں تھوڑی دور تک خاموشی سے چلتے رہے پھر شائستہ نے کہا۔ ”تم شاید پہلی بار مجھے دیکھ رہے ہو لیکن میں برموں سے تمہیں جانتی ہوں۔“

”کیسے؟“

”دسیم کی زبان سے تمہارا ذکر سنتی رہتی تھی۔ اس کے پاس تمہاری تصویر بھی دیکھی ہے۔“

”دسیم کہاں ہے؟“





مشورے کے مطابق میں اتنی جلدی فیصلہ نہیں کروں گا۔ آج رات سوچوں گا۔ اگر تمہارا مشورہ قابل قبول ہوا تو میں کل رات کو تم سے ملنے آؤں گا۔“

وہ ذرا اداس ہو گئی اور ملتی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میری دلی تمنا ہے کہ آج کی شام تم میرے ساتھ گزارو اور رات کا کھانا..... مگر نہیں۔ تم ہمیں دشمن سمجھتے ہو۔ تم اپنے طور پر محتاط ہو۔ مجھے تم سے شکایت نہیں ہے۔ میں کل شام کو تمہارا انتظار کروں گی اور تمہاری پسند کا سرخ جوڑا پہن کر تمہیں خوش آمدید کہوں گی..... خدا حافظ!“

مراو کی نگاہوں کے سامنے پھر وہی سرخ، قرمزی اور نارنجی رنگ جھلکانے لگے۔ لہو سرخ، لباس سرخ، ہونٹوں کے گلاب سرخ اور جذبوں کی آب و تاب سرخ۔ اتنے سارے رنگ گڈگڈ ہو کر نظروں سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ شائستہ جتنی دور ہوتی جا رہی تھی، اتنا ہی اسے اپنے قریب کھینچتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بکھی کے اندر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆-----☆-----☆

آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر تھی۔ حویلی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غلی منزل کی تاریکی تاری تھی کہ مسز گرانت اور دوسرے ملازم گہری نیند سو رہے ہیں۔ اوپر ایک کمرے میں سوی سمیں روشن تھیں۔ شائستہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے عکس کو اتنی محویت سے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ اپنے آپ کو نہیں، کسی اجنبی لڑکی کو دیکھ رہی ہو اور پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے جسم پر سفید ریشم کی نائی تھی۔ بالکونی کے اوہ کھلے دروازے سے آنے والی خنک ہوائیں اس نائی کو چھیڑ رہی تھیں اور بدن کی حدت کو ہولے ہولے تھپک رہی تھیں۔

اس کے دائیں طرف دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ دروازہ بند تھا لیکن اس کے پیچھے سے کبھی کبھی وسیم کی آہ سنائی دیتی تھی۔ پھر وہی دھیمی دھیمی آواز رات کی خاموشی میں سکے لگی تھی۔

”آہ۔ کب یہ انتظار ختم ہو گا؟“

وہ کب آئے گا؟

”آ..... میری جان کے دشمن! کوئی آخری فیصلہ کر لے.....؟“

طویل سسکیوں کے بعد وہ آواز گم ہو جاتی۔ تھوڑی دیر کے لئے گمراہا تھا جاکر اس کے بعد پھر وہی آہیں، پھر وہی فقرے دہرانے کی آواز آتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوش و حواس میں نہیں ہے اور ایک رولنگ ٹیپ کی طرح بار بار اپنی آہوں اور فقروں کا دہراتا جا رہا ہے۔

شائستہ غمگین اور پریشان نظروں سے اس کمرے کی جانب دیکھنے لگی اور سوچے لگی۔

”وہ آئے گا..... آج نہیں آئے گا..... کل ضرور آئے گا..... ہمیں دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کمرے سے گونجنے والی آہ و فغاں کو اب ختم ہو جانا چاہئے۔ دسم کی آواز مجھے مایوس کر دیتی ہے.....“

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شمع دان کے پاس آئی اور اسے اٹھا کر دوسرے کمرے کی جانب پلٹ گئی لیکن بالکونی کے دروازے سے گزرنے وقت اس کے قدم اچانک رک گئے۔

سامنے درخت پر سرخ رنگ لہرایا تھا۔ پھر مراد درخت کی شاخ سے جھولتا ہوا بالکونی کے پتے پر آگیا۔ وہ گودن سے پاؤں تک سرخ لباس میں چھپا ہوا تھا۔ شائستہ کو دیکھتے ہی وہ بالکونی میں ایک ذرا سایوں جھک گیا جیسے اسے دیکھ کر ٹھنک گیا ہو۔ شائستہ بھی اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں شمع دان تھا اور بائیں ہاتھ کو اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لیا تھا۔

پھر وہ لاسنبے لاسنبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے میں آیا۔ شائستہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بول۔

”تم..... تم نے تو کہا تھا کہ آج نہیں آؤ گے؟“

وہ تلخی سے منہ بنا کر بولا۔ ”میں نے اس لئے کہا تھا کہ تم میری طرف سے غافل رہو گی اور تمہیں میرے خلاف کوئی چال چلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم نے مجھے دعوت دی تھی کہ تمہارے بھائی کا دوست بن کر یا دشمن بن کر یہاں آؤں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ دشمن کے گھر دشمن بن کر آؤں گا تو میرا کیا حشر ہو گا؟“

میں اپنے دماغ سے سوچتا ہوں اور اس پر عمل کرتا ہوں۔ ابھی یہاں چھپ کر آنے





بچے جا کر ملازموں سے کہہ دیجئے کہ یہاں گولیاں چلنے لگی ہیں تو کوئی یہاں نہ آئے۔ یہ میرا حکم ہے۔“

سزگرانٹ نے حیرانی سے کہل ”مس! تم کیسا مافق بات کرتا ہے۔ یہ آدمی ڈیوئس ہے۔“

”ہوئے دو۔ میں جو کہتی ہوں وہ کرو۔ پلیز لیو آس ایلون۔ میں اپنی حفاظت آپ کروں گی۔“

سزگرانٹ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔ ہسٹول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ شائستہ نے قریب آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہل

”آپ بہت وفادار ہیں۔ یہ بھی آپ کی وفاداری کا امتحان ہے۔ میرا حکم ماننے اور یہاں سے چلی جائیے۔“

سزگرانٹ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہاں سے جانا نہ چاہتی ہو۔ پھر اس نے نظرسنجی کر لیں اور مجبوراً سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

شائستہ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پھر وہ بالکونی کی طرف گئی اور وہاں کا دروازہ بھی بند کرنے لگی۔ مراد اس کی ان حرکتوں سے الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنے بھائی کے دشمن کی حفاظت کیوں کر رہی ہے۔

شائستہ نے دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کرنے کے بعد کہل ”اب تم محفوظ ہو۔ میں نے نچلی منزل سے آنے والوں کے قیام راستے بند کر دیئے ہیں۔ اب اگر تم دسیم کو قتل کرنا چاہو تو تمہارا ہاتھ کوئی نہیں پکڑے گا لیکن اس کے پاس جانے سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”کہو!“ مراد نے کہل ”اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

شائستہ آہستہ آہستہ ایک اونچے سے استول پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”شکاری شکار کھیلنے سے پہلے اپنے شکار کے عزاج کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔“

”میں دسیم کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”کچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں تم نہیں سمجھتے۔ میں دسیم کے ماضی کی چند باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ اگر تم غور سے نہیں منو گے تو بعد میں تمہیں افسوس ہوگا۔“

مراد یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے می اور ڈیڈی کو ایک بیٹی کی آرزو تھی۔ بڑے گھرانوں میں بیٹیاں بوجھ نہیں سمجھی جاتیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ بیٹیوں سے گھر کی رونق بڑھتی ہے۔

بہر حال میرے والدین کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ان کی توقع کے خلاف دسیم پیدا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ حمل کے دوران بچہ لڑکا یا لڑکی کی سوچوں، امنگوں اور خواہشات کا اثر پڑتا ہے، دسیم اپنی پیدائش سے ہی لڑکیوں جیسی نزاکت اور خوبصورتی لے کر آیا تھا۔

میری می اسے لڑکیوں کے فراق پہناتی تھیں اور لڑکیوں جیسے بال سنوارتی تھیں۔ جب اس نے تو تلی زبان سے بولنا شروع کیا تو اس کی بولی بھی لڑکیوں جیسی تھی۔ پانچ سال کے بعد ڈیڈی نے میری می کو سمجھایا کہ اب اسے لڑکوں کے روپ میں آنا چاہئے کیونکہ اب وہ گھر کے ماحول سے نکل کر اسکول جایا کرے گا۔

وہ اسکول جانے لگا۔ وہاں کا ماحول اسے سکھاتا تھا کہ وہ لڑکا ہے۔ گھر میں ماں کا اندھا پیار سمجھاتا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ اسی کشش میں وہ عمر کی منزلیں طے کرنے لگا۔ پندرہ برس کی عمر میں اس کی ملاقات تم سے ہوئی۔ وہ تمہاری مردانہ شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ رفتہ رفتہ دوخت بن کر تمہارے قریب آ گیا۔

ڈیڈی اسے سمجھایا کرتے تھے کہ اسے مردوں کی طرح چلنا پھرنا اور بولنا چاہئے۔ اگر وہ عورتوں کی سی نزاکت کرے گا تو لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے۔ ڈیڈی کی عزت اور مرتبے کا خیال کر کے وہ زنانہ طرز زندگی سے پرہیز کرنے لگا۔ فیکٹری میں، کلبوں اور ہوٹلوں میں اور دیگر تقریبات میں اس کی میجی کوشش ہوتی تھی کہ وہ خود کو کھل مرد مظاہر کرے۔ وہ اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا لیکن پیدائشی خصوصیات دقی طور پر دب جاتی ہیں، بالکل ہی ختم نہیں ہو جاتیں۔ وہ تمہارے سامنے آکر کمزور پڑ جاتا تھا۔

اس کی دوستی کے پس پردہ وہ لڑکی چھپی ہوئی تھی جو می کی گود میں اور ان کے اندھے پیار کے سائے میں پرورش پا رہی تھی۔ دسیم بہت ہی ذہین اور صابر تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے اندر بیٹھی ہوئی لڑکی کو چھپاتا رہتا تھا۔ اس نے تم سے کبھی اس کشش کا ذکر نہیں کیا۔

وہ سوچتا تھا کہ نہ جانے تم اس کے متعلق کیسی رائے قائم کرو گے۔ اس کے علاوہ اس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ڈیڈی کی عزت پر کبھی حرف نہیں آنے وے گا۔

وہ تمہارے پاس اکثر آتا تھا۔ تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ دقت گزارتا تھا اور اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ بس اتنی قہر کافی ہے۔ وہ اس دوستی کے پردے میں چھپ کر اسی طرح ساری زندگی گزار لے گا لیکن کبھی اس کے ساتھ مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں بڑی رازدارانہ پریشان کن تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے گہرا کر می سے ذکر کیا۔ می نے ڈیڈی کو بتایا۔ ڈیڈی بوکھلا کر ڈاکٹروں سے کونسلٹ کرنے لگے۔ ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور کہا کہ یہ تبدیلیاں جنس مخالف کی تکمیل تک پہنچیں گی۔ اگر ان تبدیلیوں کے دوران کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے تو آپریشن اور میڈیکل ٹریٹمنٹ کی ضرورت پیش آئے گی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں استعمال کے لئے لکھ کر دے دیں۔

ڈیڈی کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ دسیم ان کی سوسائٹی میں ایک مذاق بن جائے گا۔ جب وہ کوٹ پتلون کی بجائے ساڑھی یا شلوار کرتے پس کر نکلتے گا تو لوگ قہقہے لگائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سوسائٹی کو اور اس ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے اور تمام جائیداد بیچ کر لندن دسیم کے چچا کے پاس چلے جائیں گے۔

دسیم کو ڈیڈی کے ارادوں کا علم ہوا تو وہ تم سے پچھڑ جانے کے خیال سے پریشان ہو گیا۔ آخری بار تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لئے وہ تمہارے پاس آیا۔ اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اور وہ تم سے کیوں کچھڑنے والا ہے۔ اس نے سوچا کہ جہاں اتنے عرصے تک رازداری رہی وہاں اب جدا ہوتے دقت زبان کھولنا اور ڈیڈی بس سچائی کو راز بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، اس راز کو فاش کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

لیکن وہاں شینہ کو تمہاری محبوبہ کے روپ میں دیکھ کر اس کے دل میں حد و رقبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر بھی اس نے شینہ سے نفرت اور تم سے محبت کا اظہار نہیں کیا، صرف تمہاری دوستی کا دم بھرتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد اسے شینہ کے ہرجائی پن کا علم ہوا تو اس نے تمہارے سامنے کھل کر اس سے نفرت کا اظہار کیا مگر تم اس سے نفرت

کرنے کے لئے عیار نہیں تھے۔ تم نے وسیم سے کہا کہ تم ٹینہ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ وہ سرخ لباس میں دنیا کی حسین ترین لڑکی نظر آتی ہے۔

یہ سرخ لباس دالی بات دسیم کے دل میں بیٹھ گئی۔ رات کو جب کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ ٹینہ تمہارے ساتھ چلی گئی تھی تو وہ اس کی خواب گاہ میں آیا اور اس کی لماری سے یکے بعد دیگرے سرخ لباس نکال کر اپنے جسم پر سجانے لگا اور آئینے میں دیکھ کر سوچنے لگا کہ آپریشن کے بعد کیا وہ ایسے ملبوسات میں خوبصورت نظر آئے گا؟ کیا تم اسے بھی دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھو گے؟

وہ ایک ایک لباس پہن رہا تھا اور انہیں اتار کر ادھر ادھر پھینکتا جا رہا تھا۔ آخری بار اس نے سرخ لباس کو ہاتھوں میں لیا تو ٹینہ خلاف توقع وہاں پہنچ گئی۔ اس نے یہی سمجھا کہ وسیم اسے چاہتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے لباس کو سینے سے لگا کر اپنی حسرت پوری کرتا ہے یہ سوچ کر وہ اسے محبت کے نام پر گناہ کی دعوت دینے لگی۔ وسیم پریشان ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس پر ٹینہ نے طعنہ دیا کہ وہ مرو نہیں ہے۔ یہ طعنہ اس کے دماغ میں ایک ہتھوڑے کی طرح لگا۔ برسوں سے بس راز کا علم کسی کو نہ تھا، وہ راز ٹینہ کی زبان پر آگیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر اسے مارنے لگا۔ ٹینہ اسے اور زیادہ بھڑکانے لگی۔ اس نے دھمکی دی کہ وسیم نے اگر اس کی آرزو پوری نہ کی تو دو دنیا والوں سے کہہ دے گی کہ وہ عورت ہے اور اسی لئے عورت سے دور بھاگتا ہے۔

وسیم نے پیتل کا گلدان اٹھا کر اس پر حملہ کر دیا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا بس راز کے لئے وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ یہ ملک چھوڑ رہا تھا، وہ ٹینہ کی زبان سے طشت از بام ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نسوانیت برداشت کر سکتا تھا مگر اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ دنیا والوں کے سامنے اس کے ڈیڈی کا سر جھک جائے۔ بس اس جذبے نے اسی پاگل پن نے اسے قاتل بنا دیا۔

مثانستہ یہ کہہ کر ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گئی اور مراد کو دیکھنے لگی۔ مراد بڑی محبت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ ایسے چوک گیا جیسے کسی دلچسپ کہانی کا طلسم ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”میں کیسے مان لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ درست ہے۔ دروازہ کھولو“ میں



میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی، خاموشی سے چلتی ہوئی مینٹل پیس کے پاس آئی اور وہاں سے شمع دان اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی۔  
مراد کچھ مضطرب ہو کر دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ شائستہ کی ہول میں چابی ڈال کر اسے کھول رہی تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ وہ ہاتھ میں شمع دان اٹھائے اندر چلی گئی۔  
سرا د بھی تیزی سے آگے بڑھا، پھر دروازے پر پہنچ کر ذرا ٹھٹک گیا۔  
کمرہ لمبو کی طرح سرخ تھا۔ درو دیوار سرخ۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے سرخ۔ بستر کی چادر اور تکیے کے غلاف سرخ اور فرش پر بچھا ہوا قالین بھی سرخ تھا۔ شینہ کی خواب گاہ سے سرخ لباس چرا کر اپنے جسم پر سجانے والے دسیم نے اپنے کمرے کو دنیا جہاں کی سرخیوں میں ڈبو دیا تھا۔  
”لیکن دسیم کہاں ہے؟“

وہ کمرے میں آکر چاروں طرف دیکھنے لگا۔  
قریب ہی ایک پتائی پر رکھے ہوئے ریکارڈر پر ردنگ ٹیپ بولنے لگا۔  
”اھ۔ کب یہ انتظار ختم ہو گا..... وہ کب آئے گا؟ آہ..... میری جان کے.....“

مراد نے جھلا کر ریکارڈر کو ایک ٹھوکر ماری اور غصے سے چیخنے لگا۔ ”دسیم کہاں ہے؟ جھوٹی..... دکار!“

وہ چیخا چنگھاڑتا ہوا شائستہ کے پاس آیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گرون دیوچ کر بولا۔ ”بتاؤ دسیم کہاں ہے؟ تم جھوٹی کہانیاں سنا کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔“  
وہ چھنی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کہانی سب تک مکمل نہ ہو وہ جھوٹی سمجھی جاتی ہے۔ پتلے سیری بات سن لو۔“

اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو گئی۔ وہ سرا د کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ”دسیم کی کوئی بن نہیں تھی۔ شائستہ درانی کا کوئی وجود نہیں ہے..... اب تو مجھے پہچان لو میرے قاتل.....“

مراد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگہ وہ شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ خاموش کھڑی زمیر لب مسکرا رہی تھی۔

کمرے میں پھیلی ہوئی سرخیاں جھلجھل کرتی ہوئی اس کے حسین چہرے پر منعکس ہو رہی تھیں..... دنیا کی حسین ترین لڑکی.....!

مراد کی تجسس انگلیاں کانپتی ہوئی گردن سے چہرے پر آگئیں اس کے رخسار کو چھونے لگیں۔ اس کے ملائم ہونٹوں کی بھولی ہوئی گفتار کو یاد کرنے لگیں..... انگلیاں آنکھیں بن گئی تھیں اور ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

باہر دروازے کو بہت سے لوگ پیٹ رہے تھے۔ مسز گرانٹ کہہ رہی تھی کہ ابھی شور مچائی دیا ہے۔ بس کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ پھر وہ باڈی گارڈ کے ساتھ دوڑتی ہوئی ایک کوریڈر سے دوسرے کوریڈر میں آئی اور اس کمرے کے دروازے کو پینے لگی، جسے سرخ کمرہ کہا کرتی تھی۔ باڈی گارڈ نے سنا۔

”یہاں بھی کسی کی آواز نہیں آ رہی ہے..... نہیں..... آ رہی ہے.....“

آواز آ رہی ہے..... کوئی بول رہا ہے۔“

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر سننے لگے۔

بند دروازے کے پیچھے سے بہت ہی دھیمی دھیمی آواز ابھر رہی تھی۔

”دیسو..... میری دیسو..... میری دیسو! تم میری پہلی اور آخری محبت

ہو.....!“



# منخوس تاربخ

خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں بسنے والے ایک ادھیر عمر شخص کا فسادہ  
عبرت۔ دواپنی بیوی کو بھول کر دوسری عورت سے عشق لڑانے چلا تھا۔  
مقدر خراب نہ ہوں تو کوئی دن اور تاربخ منخوس نہیں ہوتی۔

مر  
پھر

اخبار  
اور

وہ ایک پرانی شکستہ سی عمارت تھی۔ منزل بہ منزل پہنچانے والی لفٹ بھی عجیب پرانے ڈھنگ کی تھی۔ یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی تابوت کو اٹھا کر کھڑا کر دیا گیا ہے اور لوگ اس جہانِ فانی سے پرواز کرنے کے لئے اس میں داخل ہو رہے ہیں۔

گہری سفورڈ اس تابوت نما لفٹ کو دیکھ کر ذرا سہم سا گیا۔ کئی سال پہلے وہ ایک بار اس لفٹ کے اندر گیا تھا۔ وردا زہ بند ہونے کے بعد بھی لفٹ تھوڑی دیر تک حرکت میں نہیں آئی۔ پھر ہلکے ہلکے جھٹکے کھا کر بلند ہونے لگی اور اس کے ہر جھٹکے کے ساتھ گہری کا سانس رکنے لگا۔ ایسے وقت اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی اگر اس کا بس چلتا تو وہ وردا زہ توڑ کر باہر نکل جاتا۔ بد قسمتی سے وہ کلشرو فوبیا کا مریض تھا۔ ایسے مریض لوگوں کے ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ بند کمرے میں گھٹن محسوس کرتے ہیں اور لفٹ تو ایسی چیز ہے جو چاروں طرف سے قبر کی طرح بند ہو جاتی ہے۔ لہذا وہ اس تابوت میں جانے کی جرأت نہ کر سکا اور زینے طے کرتے ہوئے ساتویں منزل کی طرف جانے لگا۔

ساتویں منزل پر معروف دندان ساز ڈاکٹر ٹینگ کا جیمبر تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دانتوں کے درد سے نجات دلانے کے لئے زود اثر دوا میں دینی تھیں اور کہا تھا کہ ان دواؤں کے باوجود اگر آٹھ گھنٹے تو وہ کسی وقت بھی جیمبر میں آکر دوسری دوا میں لے سکتا ہے۔ گہری کے لئے یہ دوپہر کا وقت موزوں تھا کیونکہ دوپہر کو دوسرے مریض نہیں آتے تھے۔ اس تنہائی میں وہ ڈاکٹر کی خوبصورت اسٹنٹ مارگو سے دو باتیں کر سکتا تھا اور ایماز کے رومان حول میں اسے کچھ پینے پلانے کے لئے مدعو کر سکتا تھا۔ یعنی درد صرف دانتوں میں نہیں تھا، دل میں بھی تھا۔

ساتویں منزل پر پہنچ کر وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ جیمبر کے وردا زہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے رومال نکال کر چہرے اور

مکرون سے پسنے کو پونچھا، بالوں میں کنگھی کی تاکہ مارگو کی نظروں میں اسماٹ نظر آئے۔  
پھر وہ دروازہ کھول کر ڈیننگ روم میں داخل ہو گیا۔

حسب توقع ڈیننگ روم میں ایک بھی مریض نہ تھا۔ صوفے خالی تھے، درمیانی میز پر  
اخبار اور رحالے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی وقت مارگو، ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر آئی  
اور اسے دیکھتے ہی بولی۔

”ہیلو مسٹر گیری! ڈاکٹر تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“

”صرف ڈاکٹر؟ کیا تمہیں میرا انتظار نہیں تھا؟“

وہ جواباً مسکراتے لگی۔ گیری نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ ”آج شام کو ایپارٹ میں  
ملو گی؟“

”اوں ہونہ۔ آج شام تک تم سرجری روم میں رہو گے۔ میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر  
آج خصوصی توجہ سے تمہارا علاج کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے دوسرے مریضوں سے  
فون پر معذرت کی ہے کہ آج وہ مصروف ہیں، کسی مریض کو اینڈ نہیں کر سکیں گے۔ ایسا  
پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ ڈاکٹر نے کبھی ایک مریض کی خاطر دوسرے  
مریضوں کو نظر انداز کیا ہو۔“

گیری نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں کچھ غیر معمولی خوبیاں ہیں۔ اسی لئے  
صرف ڈاکٹر نہیں، تم بھی خصوصی توجہ دیتی ہو۔ بولو، آج شام ایپارٹ میں آؤ گی ما؟“  
”نہیں۔ آج میں بہت مصروف ہوں۔“

”صاف کیوں نہیں کہتیں کہ ڈاکٹر ٹینگ سے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ میرے ساتھ  
تمہیں دیکھ لے گا تو.....“

وہ بات کٹ کر بولی۔ ”میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ وہ ڈاکٹر بھی تو تمہاری بیوی کی  
بانسوں میں بائیں ڈال کر گھومتا ہے۔ کیا تمہاری بیوی تم سے ڈرتی ہے؟“

گیری کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ پہلی بار اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ  
ڈاکٹر سے اس کی بیوی برٹانس کی آشٹی ہے۔ اس نے مارگو سے مزید کچھ پوچھنا چاہا۔ اسی  
وقت ڈاکٹر ٹینگ کے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

”مارگو! تم نے ایکس رے رپورٹ کہاں رکھی ہے؟ ڈارلنگ تمہاری رکھی ہوئی چیزوں

کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔“

”جسٹ کنگ ڈاکٹر!“ مارگو نے جواب دیا۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مارگو کے قرب میں کسی دوا کی مہک تھی یا پھر اپنی بیوی برٹاکس کی بے وفائی کے خیال سے اس قربت میں بدمزگی پیدا کر دی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک گہری سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ پھر اس نے دل کو سمجھایا کہ برٹاکس ایسی نہیں ہے جیسا مارگو اسے پیش کر رہا ہے۔ نفسیات کی رو سے مارگو اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے برٹاکس پر تہمت تراش رہا تھا۔ یہ عورتیں حسد سے مری جاتی ہیں۔ وہ مطمئن ہو کر عورتوں کی فطرت پر مسکراتے لگا۔ ڈاکٹر ٹینگ اپنے کمرے میں مارگو کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دیکھو۔ آج جتنے مریضوں سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ میں نے انہیں اطلاع دے دی ہے کہ مصروفیات کی وجہ سے انہیں اینڈ نہیں کر سکوں گا۔ یہ ایک مسٹر کیزرہ گئے ہیں۔ ان سے فون پر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اگر یہ آجائیں تو ان سے معذرت کر کے انہیں وینٹنگ روم سے ہی واپس کر دیتا۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ میں مسٹر گیری کے ساتھ سرجری روم میں رہوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا اور گیری کی طرف جانے لگا۔ مارگو میز پر رکھے ہوئے کتابی کیلنڈر کو دیکھنے لگی۔

کیلنڈر کے طاق صفحے پر سات تاریخ تھی۔ سات نمبر خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ سات تاریخ گزر گئی تھی سات تاریخ کو وہ گیری کے ساتھ ایچپائر میں گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر جام شیریں نوش کیا تھا۔ شاید یہ سات نمبر کا کرشمہ تھا کہ وہ دونوں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہے تھے۔

کیلنڈر کے جفت صفحے پر آٹھ تاریخ تھی۔ اس تاریخ میں جتنے مریضوں سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ ان کے ناموں پر خط تہنیک کھینچ دیا گیا تھا۔ آج گیری نے پھر اسے ایچپائر میں مدعو کیا تھا لیکن مصروفیات کے باعث نہ تو گیری شام سے پہلے سرجری روم سے فارغ ہوا اور نہ ہی اسے چھٹی ملتی۔ مارگو نے مایوسی سے سوچا۔ ”آج کی آٹھ تاریخ بڑی منحوس

ہے۔

”گیری نے سرجری روم میں آکر ڈاکٹر ٹینگ سے کہا۔

”مجھے اس کمرے میں آتے ہی وحشت سی ہوتی ہے۔ کیا آپ نے میری میڈیکل

ہسٹری شیٹ نہیں پڑھی ہے؟“

ڈاکٹر ٹینگ نے کہا۔ ”میں نے ان تمام ڈاکٹروں کی رپورٹ بھی پڑھی ہے۔ جن کے

زیر علاج تم رہ چکے ہو۔ دیکھو اس لئے میں نے کھڑکی کھلی رکھی ہے تاکہ تمہیں ٹھنک کا

احساس نہ ہو۔“

گیری نے اُدھر دیکھا۔ کشادہ کھڑکی کے دونوں پت کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے

سلنے ایک کرسی تھی۔ کرسی کے ایک سرے پر ایک بینڈل تھا جسے گھمانے سے وہ کرسی

ایزی چیمبر کی طرح کھل جاتی تھی۔ اسی پر مریض کو بٹھا کر اس کے دانتوں کا معائنہ کیا جاتا

تھا۔ گیری نے کہا۔

”یہ کرسی تین طرف سے جکڑ دی ہے۔ اس پر بیٹھتے ہی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی

حیرا گلا دیوچ رہا ہو۔“

ڈاکٹر نے مسکرا کر اس کے شانے کو ہتھپتاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔ یہ کرسی تمہارے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود تم

تسلیم کرو گے کہ یہاں آکر تم جب بھی بیٹھتے ہو۔ میں تمہیں منفی پہلو سے سوچنے کا موقع

ہی نہیں دیتا ہوں۔ تمہاری ہسٹری شیٹ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بار تمہیں کسی مکان

میں ٹھنک کا احساس ہوا تھا تم وحشت زدہ ہو کر جنونی انداز میں دروازہ کھول کر نکل بھاگے

تھے اور باہر سڑک پر پہنچتے ہی ایک کار سے ٹکرا گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس حادثے

میں بچ گئے۔ یہاں پر کسی قسم کے حادثے کا اندیشہ نہیں ہے اگر اس دروازے سے نکل کر

بھاگو گے تو باہر ٹکرائے کے لئے تمہیں کوئی کار نہیں ملے گی۔ کیونکہ تم ساتویں منزل کی

بلندی پر ہو۔ لہذا حوصلہ رکھو اور یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔“

گیری طوعاً و کرہاً کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے بینڈل گھما کر کرسی میں کشادگی پیدا

کردی اور اس سے کہا۔

”اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑکی پر رکھ دو اور آرام سے پھیل کر بیٹھو۔ قطعی

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ کھڑکی کے ٹچلے فریم کی اونچائی کرسی کی اونچائی کے برابر تھی۔ لہذا اسے کھڑکی پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھنے میں وقت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ دل و دماغ میں جو اضطراب چھپا ہوا تھا، وہ پریشان کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ لو، یہ دو کیپسول پانی کے ساتھ نگل جاؤ۔ میرا دعویٰ ہے کہ تمہیں فوراً انجانی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ یہ زود اثر دوا ہے۔“

وہ باتیں کرنے کے دوران داش مین کے پاس گیا اور وہاں سے پلاسٹک کے ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ گیری نے زور دے کر پوچھا۔ ”یہ کیسا کیپسول ہے؟“

”یہ مادرانی کیپسول ہے۔ یہ تمہیں تمہاری موج اور پریشانیوں سے پرے لے جائے گا۔ تم منفی انداز میں سوچنے کے بجائے ہمیشہ مثبت انداز میں سوچو گے۔“

وہ دونوں کیپسولز نگل کر پانی پینے لگا۔

اتنے میں مارگو وہاں آکر ڈاکٹر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی۔ جس پر سرجری کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اس حینہ کی موجودگی ہی گیری کے لئے سکون کا باعث تھی۔ ڈاکٹر نے اسے منہ کھولنے کے لئے کہا۔ گیری کے منہ کھولتے ہی اس نے دانٹوں کے درمیان ایک چھوٹے سے آلے سے رکاوٹ کھڑی کر دی۔ تاکہ اس کا منہ کھلا رہے۔ پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

گیری خاموشی سے مارگو کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کے چہرے کو تنگ رہا تھا۔ کبھی اس کے بلاؤز کے مٹن گن رہا تھا اور کبھی ان ہاتھوں کی نزاکت کو محسوس کر رہا تھا۔ جنہیں تمام کر وہ آج شام کو اسپائر کے کسی گوشے میں بیٹھنے والا تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے اور سوچنے کے باوجود اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب تب میں اس پر کلشردوفیو کا مرض حاوی ہوتے والا ہے۔ کسی بھی لمحے وہ دہشت زدہ ہو کر کرسی سے اٹھ جائے گا اور وہاں سے جنوبی انداز میں نگل بھاگے گا۔

مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ توقع کے خلاف پرسکون تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، اس میں ایسا اطمینان اور ایسی بے پردائی تھی کہ اپنے دانٹوں پر آلات اور ڈاکٹر کے ہاتھوں کا لمس بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ مارگو کے ملائم

ہاتھوں کو اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر محسوس کر رہا تھا۔  
شام کو ایسا زہل کے بار میں موسمی شمعیں روشن تھیں۔ گہری نچلے برآمدے میں بیٹھنے کا عادی تھا لیکن آج وہ بار کے اندر آگیا تھا۔ دروازے بند تھے۔ کمر کیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اسے گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔  
اس نے بار کے گوشے میں ایک میز منتخب کی اور دیٹر کے آنے پر اپنے لئے ایک ویل اسکلج اور مارگو کے لئے شیری کا آرڈر دیا۔ مارگو بھی عین وقت پر پہنچ گئی۔ اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے احسان جنایا۔

”میں تمہاری خاطر تمام مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھ کر آئی ہوں۔“  
”میں خوش نصیب ہوں مارگو! کہ تم میرے لئے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر آئی ہو۔“  
”میں آج یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر اور کسی کو چھوڑ سکتی ہو یا نہیں؟“  
”کیا مطلب؟ میں نہیں سمجھی؟“

دیٹر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو دونوں نے اپنا اپنا جام اٹھا لیا۔ گہری نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر یہ شر چھوڑ دو۔ آؤ ہم دونوں یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟ تم ہو، تمہاری بیوی ہے اور پھر ایک بیٹی ہے۔“  
”میری بیٹی کو لن جوآن ہو گئی ہے۔ اسٹیو نامی ایک نوجوان سے محبت کر رہی ہے۔“  
اس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کیا ہے۔ اب اس کی ذمہ داریاں مجھ پر نہیں ہیں؟“  
”اور تمہاری بیوی؟“ مارگو نے پوچھا۔

”برٹائس سے میری نہیں بنتی۔ وہ مشرق ہے۔ میں مغرب ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ تم اس کے متعلق نہیں، اپنے متعلق سوچو۔ بخدا مارگو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ ہر عاشق یہی بات کہتا ہے مگر میں صدق دل سے کہہ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر زندگی بے کیف ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مارگو کا ہاتھ میز پر آکر اس سے مل گیا۔ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

”میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ جاسکتی ہوں لیکن ایک دشواری ہے۔“

”کیسی دشواری؟“

”میری ملازمت۔“

”ادنیہ.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بھی کوئی دشواری ہے۔ ملازمت چھوڑ دو۔ میں بھی اپنی ملازمت چھوڑ کر جاؤں گا۔ میرے پاس اتنی نقد رقم ہے کہ ہم تین سال تک بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ ہم یہاں سے انگلینڈ جائیں گے اور لندن میں ہمیشہ عیش و آرام کی زندگی گزاریں گے۔ وہاں مجھے کسی بھی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازمت مل جائے گی۔“

”یہ میں تسلیم کرتی ہوں لیکن..... وہ ڈاکٹر ٹینگ مجھے عیس چھوڑے گا۔“

”کیوں نہیں چھوڑے گا۔ کیا تم اس کی ملکیت ہو؟“

”نہیں۔ مگر وہ یہی سمجھتا ہے۔ تم اسے اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے ہر حال میں حاصل کر لیتا ہے۔ دو سال پہلے میں ایک بوڑھے ڈاکٹر دلی براڈ کے پاس کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر ٹینگ ایک روز کسی کام سے وہاں آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ میں اس کے ہاں ملازمت کروں گی۔ اس نے ایک بھاری تنخواہ کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر دلی براڈ کو پتہ چلا تو اس نے بھی میری تنخواہ بڑھا دی۔ پھر بھی ڈاکٹر ٹینگ نے مجھے حاصل کر لیا۔ جانتے ہو کیسے؟“

”کیسے.....؟“

”اس نے دو غنڈوں کو ڈاکٹر دلی براڈ کے پاس بھیجا تھا۔ ان غنڈوں نے اسے کہا کہ وہ میرے گھر سے آئے ہیں یعنی وہ دونوں میرے بزرگ ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں ڈاکٹر ٹینگ کے ہاں ملازمت کروں۔ اس وقت میں انکار کر سکتی تھی لیکن یہ سوچ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ٹینگ کی نظروں میں میری کتنی اہمیت ہے۔ وہ کتنی میرا پیہری سے مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انسان دیہ جاتا ہے جہاں اس کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس کے پاس چلی آئی۔ اب تم اس سے بھی زیادہ میری قدر کر رہے ہو۔ میری خاطر یہ ملک چھوڑ کر انگلینڈ جانا چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار نہیں کرتی لیکن میں ڈرتی ہوں کہ تم اچانک مجھے اس سے چھین کر لے جاؤ گے تو وہ تمہارا دشمن بن جائے



گک

”ادرنہ!“ گیری نے حقارت سے کہا۔ ”میں دشمنوں سے نمٹتا جانتا ہوں لیکن اصولاً میں ایک بار اس سے بات کروں گا۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو پھر ٹھیک ہے۔ ورنہ میں اس کی پردہ نہیں کرتا۔“

”کیا تم اس سے ابھی ملو گے؟“ مارگو نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں گھر جا کر فون پر اس سے بات کروں گا۔ جان من! رات کے سوا گیارہ بجے لندن کے لئے ایک فلائٹ ہے ہم اسی سے جائیں گے۔ تم ابھی جا کر سفر کی تیاری کرو۔ میں ساڑھے آٹھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔“

وہ دونوں اٹھ کر کاؤنٹر پر آئے۔ گیری نے ٹریول ایجنسی کو وہاں سے فون کیا۔ جب جنازہ کی دو سیٹیں ان کے لئے مخصوص ہو گئیں تو اس نے مارگو کو رخصت کر دیا اور اپنی تیاریوں کے لئے گھر آگیا۔ برنائس نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ آج کچھ پھرتیلے نظر آرہے ہو؟“

”ہاں۔ زندگی ایک ایسے خوب صورت موڑ پر لے آئی ہے کہ آپ ہی آپ جوان ہو گیا ہوں۔“ پھر اس نے ہنگ کے نیچے سے دو سوٹ کیس نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں ڈاکٹر نینگ کا فون نمبر معلوم ہے؟“

”ہاں!“ برنائس نے کہا۔

گیری نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”گک..... کیا بات ہے؟“

اس نے رد کھے پن سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم نمبر ملاؤ۔“

وہ لمبائی کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگا اور انہیں سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔ برنائس اسے کن اکھیروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

”تم ہمیشہ ایک سوٹ کیس لے جاتے ہو۔ آج دو کیوں لے جا رہے ہو؟“

”میں کمپنی کی طرف سے نہیں جا رہا ہوں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور یہ ملک بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں اور تمہارے ساتھ جو ٹوٹا پھوٹا سا برائے نام رشتہ رہ گیا تھا

اسے حتی طور پر توڑ رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک گوگلی بنی بیٹھی رہی۔ کتنے ہی سوالات اس کے دماغ میں تھے مگر اس نے صرف ایک سوال کیا۔

"کیا تم اکیلے جا رہے ہو؟"

"مارگو میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

برنائس نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔

"وہ ڈاکٹر نینگ کی مارگو۔ وہ موٹی بے ڈھنگی ملازمہ؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ جیسی بھی ہے۔ تمہاری طرح پتھر کا بے حس مجسمہ نہیں ہے۔"

"پہلے تو تم مجھے بے حس نہیں کہتے تھے؟"

"اب ہو گئی ہو۔"

"نہیں۔ تم نے مجھے بنا دیا ہے۔"

گیرنی سوٹ کیس کے پاس سے پلٹ کر اسے گھورنے لگا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ جس عورت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہے اس سے بحث کرنے کا کیا فائدہ۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "مجھے ڈاکٹر نینگ کا فون نمبر چاہئے۔"

وہ خاموشی سے میز کے پاس گئی۔ اس میں سے اپنی ڈائری نکال کر اس نے ایک کلند پر فون نمبر نوٹ کیا اور اسے لاکر دیتے ہوئے طنز کیا۔

"کیا تم نے مارگو کو نہیں بتایا کہ عورت تمہارے پاس آکر بے حس بن جاتی ہے؟"

اس نے فخر سے کہا۔ "ابھی وہ میرے پاس سے گئی تھی تو بے حس نہیں تھی۔ بہت مطمئن تھی۔ بہت خوش تھی۔"

"مجھے اس بے چاری سے ہمدردی ہے اور تم سے بھی۔ بڑھاپے میں بیوی کو تو چھوڑ رہے ہو۔ اپنی جوان بیٹی کو بھی چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

"کولن نے اپنے لئے راستہ ہمالیا ہے۔ میں لندن جا کر اسے خط لکھوں گا اور اس کی شادی ہونے تک اس کے اخراجات پورے کرتا رہوں گا۔"

وہ دونوں سوٹ کیسوں میں تمام ضروری سامان رکھنے کے بعد فون کے پاس آیا اور

ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو!“ ڈاکٹر ٹینگ کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

”ہیلو ڈاکٹر! میں گیری سنفورڈ ہوں۔“

”اوہ اچھا۔ تمہارے دانت کیسے ہیں؟“

”دانتوں کی کوئی شکایت نہیں۔ میں نے یہ کہنے کے لئے فون کیا ہے کہ میں ابھی

لندن جا رہا ہوں۔“

”اچھا! یہ اچانک کیسے پردگرام بن گیا؟“

”یہ آپ کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ برٹاکس یہاں رہے گی۔ وہ یقیناً تم سے

ملاقات کرے گی اور تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔ فی الحال میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں

اپنے ساتھ مارگو کو لے جا رہا ہوں۔“

”میری مارگو کو؟“ اس کی حیرت زدہ سی آواز سنائی دی۔

”ہم۔ وہ میرے ساتھ راضی خوشی جا رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے

جانے پر تم پریشان ہو جاؤ گے لیکن مجھے امید ہے کہ تم اس کی جگہ کوئی دوسری اسسٹنٹ

رکھ لو گے۔“

”نہیں!“ اس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”مارگو کی جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔ تم اس

طرح اسے مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتے۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میں مجبوراً ایسا کر رہا ہوں۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔“

”میں دل کے معاملات نہیں جانتا۔ میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں۔ دانت توڑنا جانتا

ہوں۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ مارگو کو نہ لے جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔“

”فضول دھمکی دے رہے ہو۔ ہم آج رات کی فلائٹ سے جا رہے ہیں اور کل صبح

لندن پہنچ جائیں گے۔ میں اخلافاً تمہیں اطلاع دے رہا ہوں۔ میری خوش اخلاقی کی قدر

کرو اور صبر کرنا سیکھ لو۔“

اس نے ایک جھٹکے سے ریسیور رکھ دیا۔ جوشیلے انداز میں باتیں کرنے کی وجہ سے

اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ برٹاکس طنزیہ انداز میں اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ گیری

نے کہا۔

”ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے۔“

”پاگل تم ہو گئے ہو۔ گیری اب بھی دقت ہے اپنا فیصلہ بدل دو۔ تم ڈاکٹر کو نہیں جانتے۔ وہ.....“

گیری نے اسے چھٹی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ برٹانکس کا الوداعی بوسہ لے گا لیکن اس کا ارادہ بدل گیا۔ وہ دونوں سوٹ کیس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”گڈ بائی۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔“

”ضرور ملیں گے۔ میں اس یقین کے ساتھ تمہارے جانے کا متاثرہ دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت جلد لوٹ کر آؤ گے۔ گڈ بائی۔“

وہ کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے چلا ہوا باہر آ گیا۔ کار میں سامان رکھ کر بیٹھنے کے بعد اس نے سوچا کہ وہ برٹانکس سے بیزار ہو کر بہت جلدی گھر سے نکل آیا ہے۔ مارگو ایک نئی زندگی، ایک نئے سڑکی تیار یوں میں مصروف ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے کار اشارت کی اور ایک بار میں دقت گزارنے کے لئے چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ باز سے نکل کر مارگو کے ہاں پہنچا۔ چلی منزل کے ایک حصے میں وہ کرایہ دار کے طور پر رہتی تھی۔ گیری اس کے کمرے میں آیا تو وہ دروازے کی جانب پشت کئے صوفے پر بیٹھی تھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا اور اس کا بدن ہولے ہولے یوں لرز رہا تھا جیسے وہ سسک رہی ہو۔ رد رہی ہو۔ گیری نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے مارگو؟“

اس کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی اور اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔

”وہ آیا تھا!“

وہ سہمی ہوئی تھی، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیجا ہوا تھا۔ گیری نے اس کے گالوں کے پھٹے ہوئے گریبان کو دیکھ کر پوچھا۔

”کون؟“

”ڈاکٹر۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تم سے لون پر بات ہو چکی ہے، وہ..... وہ غصے سے

پاگل ہو رہا تھا۔“

”کیا اسی نے تمہارے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے؟“

”ہاں۔ مگر اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”میں اے جان سے مار ڈالوں گا۔“ وہ غصے سے کانپے لگا۔

”نہیں گیری! جانے دو۔ اب تو وہ جاچکا ہے۔“

”وہ کہاں بچ کر باٹے گا؟ اس کا ہاتھ تمہارے گریبان تک پہنچ گیا ہے۔ میں اسے

زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ غصہ سے پلٹ کر جانے لگا۔ مارگو نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ ”بات نہ بدھاؤ

گیری۔ یہ دانش مندی نہیں ہے۔ اگر تم اس کے پیچھے جاؤ گے تو پھر جہاز کا وقت نکل

جلے گا۔“

جب وہ ایئر پورٹ پہنچے تو جہاز کسی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا۔ ایئر لائن کاؤنٹر پر اپنا

سلمان چیک کرانے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھ گئے اور اپنی پسند کے مطابق اسکاچ اور شیری

پینے لگے۔ گیری نے پوچھا۔ ”تم ڈاکٹر سے قائف تو نہیں ہو؟“

مارگو دور کہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ شیری کا جام اس

کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”وہ..... وہ یہاں بھی آ گیا

ہے۔“

گیری چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مارگو نے ہاتھ کے اشارے سے ایک جانب

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ..... ادھر کھڑا ہوا تھا۔ مجھ سے نظریں ملنے ہی تیزی سے گھوم کر چلا گیا۔“

”مہ!“ وہ غرا کر بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ تم یہاں

بٹھو، میں اس سے نسٹ کر آتا ہوں۔“

”نہیں۔“ مارگو نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔

بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ پھر ہم اس کی پہنچ سے دور چلے جائیں گے۔“

اس نے معقول بات کہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس ملک سے دور جانے والے

تھے۔ گیری نے یہی سوچا کہ صبر ضبط سے کام لیتا چاہیے۔ دشمن اپنی ناکامی پر جھنجھلا رہا ہو

تو اسے اہمیت نہ دے مگر اگر زیادہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرنا چاہیے۔

اس نے مسکرا کر اپنا جام اٹھالیا اور دوسرا ہاتھ مارگو کی کمر پر رکھ کر اسے اپنی طرف  
یوں کھینچ لیا۔ جیسے اسے اپنے قریب لا کر دشمن سے اور زیادہ دور لے جا رہا ہو۔

☆=====☆=====☆

سروی شباب پر تھی لیکن مارگو کی قربت میں ایسی حرارت تھی کہ گیری کو ہینہ آجاتا تھا۔ لندن میں وہ ایک ہفتہ کیسے گزر گیا۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ وہ اس دوران مارگو سے صرف دو گھنٹے کے لئے دور رہا تھا۔ اوکلیئر ایڈورڈ ٹانگ کے دفتر میں جا کر اس نے ملازمت کی درخواست دی تھی، اس کے بعد پھر مارگو کی ہانہوں میں آکر قید ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ دونوں لحاف میں دیکھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی ہانہوں میں پیار بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چلی منزل میں آٹو میٹرنگ کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ جہاں ہر روز سات گھنٹے تک انجن شور مچاتے رجتے تھے اور لوگوں کے ہاتھیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

”آج مجھے ملازمت مل جائے گی۔ پھر میں کسی پرسکون علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لوں گا۔“ گیری نے کہا۔

مارگو نے پوچھا۔ ”کہا ملازمت مجھ سے زیادہ اہم ہے؟ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تمہارے پاس تو اتنی رقم ہے کہ ہم تین سال تک بے فکری سے زندگی گزار سکتے ہیں؟“

”اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم بچت نہ کریں۔ صرف خرچ ہی کرتے رہیں۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ جو ٹا چاہئے۔ اس لئے میں ملازمت کر رہا ہوں۔“

”اچھا تو تم ابھی باؤ گئے؟“

”ہاں۔ جانا بہت ضروری ہے۔ صرف محبت سے پیٹ نہیں بھرے گا۔“

”پھر کہاں ملاقات ہوگی؟“

”نیشنل پورٹریٹ گیلری میں۔ رابرٹ لوئس اسٹیونسن کی تصویر کے سامنے ٹھیک

ڈھائی بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میں بھی ٹھیک وصالی بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔“

وہ لحاف سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے دوران وہ سوچتا رہا کہ لندن میں اخراجات زیادہ ہیں۔ اسی مناسبت سے اسے زیادہ تنخواہ کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ پھر ایک خیال آیا کہ یہ نئی جگہ ہے۔ تنخواہ خواہ کتنی ہی ہو اسے فی الحال آمدنی کا ایک ذریعہ بنالینا چاہئے مارگو بہت فضول خرچ ہے۔ محبوبہ جوالہاہ اور ول و جان سے چانتی ہو تو فضول خرچی سے اس کا ہاتھ روکا نہیں جاتا۔ اس کی رنگینیاں اوائل کے ساتھ اس سنگین ادا کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ ادکلینز ایڈورٹائزنگ کے دفتر میں پہنچا تو کمپنی کے ڈائریکٹر نے بڑی بے رخی سے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ گیری کا ماتھا ٹھکا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پچھلی بار ڈائریکٹر نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

”مسٹر گیری!“ اس نے کہا۔ ”آپ پہلے مونٹریال میں ملازمت کرتے تھے لیکن آپ اپنی کمپنی کو اطلاع دیئے بغیر یہاں آگئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”گیری نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ اطلاع آپ کو کیسے ملی؟“

”ٹیلیفون ناچی ایک شخص نے اطلاع دی ہے۔“

میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔“ گیری نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ کسی نے فون پر آپ سے شرارت کی ہو۔ کچھ لوگ وقت گزاری کے لئے اس طرح فون پر جھوٹی سچی باتیں کرنے رہتے ہیں۔“

ڈائریکٹر نے کہا۔ ”اس نے فون پر اطلاع نہیں دی۔ وہ یہاں میرے سامنے آیا تھا۔ یہاں ابھی آپ بیٹھے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی ملازمت اپنا گھر اور اپنی بیوی کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ بیوی اور گھر کو چھوڑنا آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن ایک کمپنی کے اعتماد کو دھوکا دینے کے بعد آپ یہ کیسے سوچتے ہیں کہ دوسری کمپنی والے آپ پر بھروسہ کریں گے؟“

گیری غمناک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس شخص پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے اس کے خلاف صحیح رپورٹ دی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں اعتماد کھو کر ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برائے نمروانی مجھے ٹیلیفون کا طریقہ



بتایے۔ میں جانتا چاہتا ہوں کہ آخر وہ ہے کون؟“  
ڈائریکٹر اس کا حلیہ بتانے لگا۔

اس نے اتنا مکمل خاکہ پیش کیا کہ ڈاکٹر ٹینگ لگا ہوں کے سامنے آگیا۔ گیری کے دانتوں میں اچانک درد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ دانت توڑنا جانتا ہے۔ اس نے ایسے دانت کو نکال کر پھینکا تھا کہ اب گیری کسی بھی کمپنی میں اپنا اعتماد بحال نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جھٹا کر وہاں سے چلا آیا۔ پریڈ اسٹریٹ سے گزرتے وقت وہ ایک ہوٹل میں داخل ہو گیا اور وہاں بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ یہ خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر تین ہزار میل سے اس کا پیچھا کرتا آیا ہے اور یہاں آکر اس کے راستے میں کانٹے بچھا رہا ہے۔

”کیا یہ بات ابھی مارگو کو بتانا مناسب ہے؟“ وہ سوچنے لگا۔ نہیں۔ اسے نہیں بتانا چاہئے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گی۔ میں اس کم بخت ٹینگ کو تلاش کروں گا اور اسے نرمی سے یا گرمی سے سمجھاؤں گا کہ وہ ہمارے راستے سے ہٹ جائے، لیکن نہیں دشمن اتنی آسانی سے نہیں ہانک۔ وہ بہت ضدی ہے اور چالاک بھی ہے۔ آہ! میرے اس دانت میں کتنی تکلیف ہے۔ جس میں اس نے دوا لگائی تھی۔ کیس ایسا تو نہیں ہے کہ اس نے دوا کے بجائے زہر لگا دیا ہو، ایسا زہر جو آہستہ آہستہ اثر کرتا ہے۔“

وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھا چپا رہا اور سوچتا رہا پھر شراب کا مل ادا کر کے باہر آگیا۔ کھلی فضا میں آکر اس نے سوچا کہ وہ فضول اندیشہ کر رہا ہے۔ اس کے دانت میں کوئی زہریلی دوا نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ جہاں کے کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرائے گا۔ فی الحال اسے مارگو سے جا کر ملنا ہے۔

مب وہ نیشنل پورٹریٹ گیلری کی عمارت میں پہنچا تو وہ چندہ منٹ لیٹ ہو گیا تھا۔ صدر دروازے پر کھڑے ہوئے محافظ اندر جانے والوں کی تلاشی لے رہے تھے تاکہ کوئی بم یا کوئی تخریبی سامان عمارت کے اندر نہ لے جاسکے۔ وہ تلاشی دینے کے بعد اکر، کمرے میں آگیا جہاں رائٹ لوئس ایسٹونسن کی تصویر آویزاں تھی۔ اس کمرے میں چند نیا لوگ تھے اور وہ بھی واپس جا رہے تھے۔ مارگو شاید انتظار سے اکتا کر دوسری جانب چلی گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دوسرے کمرے کی جانب دیکھا تو وہاں دروازے پر ڈاکٹر ٹینگ کھڑا ہوا۔

تھا۔

وہ مسکرا کر آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”ایک بار تم نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ تم مجھ سے مارگو کو چھین کر لے جا رہے ہو۔ میں بھی اخلاقاً اطلاع دینے آیا ہوں کہ اب مارگو میرے ساتھ جا رہی ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ گیری نے کہا۔ ”مارگو تمہارے ساتھ کبھی نہیں جائے گی۔“  
ڈاکٹر نے بھارت سے کہا۔ ”تم خوش فہمی میں مبتلا ہو لیکن حقیقت یہی ہے۔ وہ اس وقت سفر کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ہم دونوں ایک گھنٹے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔“  
”میں اسے نہیں جانے دوں گا۔“

”تم اسے نہیں روک سکتے گیری! اگر روکنے کی کوشش کرو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“

گیری نے جھلا کر چھلانگ لگائی۔ بھارتی بھر کم ٹینک نے اسے دونوں ہاتھوں سے روک لیا اور اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ گیری کا سر دیوار سے ٹکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ٹاپنے لگے۔ ٹینک اس کا گلا دیوچ رہا تھا اور وہ پھنسی پھنسی کا آواز میں کہہ رہا تھا۔

”میں..... میں تم سے کمزور..... نہیں ہوں۔ تم نے میرے دانتوں میں کوئی زہریلی دوا لگائی ہے۔ تمہاری اس دوا نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ میں ابھی جا کر تھانے میں رپورٹ کروں گا تم نے مجھے زہر دیا ہے۔“

”جاء۔“  
”مت کرو۔ گیری“ تم زندہ ہی کب ہو کہ میں تمہیں زہروں میں لگاؤں۔ تم تو ایک چلتی پھرتی لاش ہو۔ چلو اب ایک لاش کی طرح زمین پر گر پڑو۔“  
یہ کہہ کر اس نے گیری کو چھوڑ دیا۔ گیری نے دیوار کا سارا لے کر کھڑے رہنے کی کوشش کی، لیکن اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور اسے اپنی سانسیں رن ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھ کھولی تو کچھ لوگ نظر آئے جو اسے بے ہوش سمجھ کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر

دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر ٹینگ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا عمارت کے باہر آگیا اور ایک ٹیکسی والے کو اپنا پتہ بتا کر پچھلی سیٹ پر نقاہت سے گر پڑا۔ چند رہ منٹ کے بعد آٹو ریگزنگ ورکشاپ کے سامنے ٹیکسی آکر رک گئی۔ گیری نے ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لئے کہا اور زینے لے کر تبا ہوا پہلی منزل پر پہنچ گیا جہاں اس کی رہائش تھی۔ مارگو ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک موٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ گیری نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”ہم۔ تو ٹینگ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تم اس کے ساتھ جا رہی ہو۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”تمہارے جانے کے بعد وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے جبراً مجھ سے پوچھا کہ میں تم سے ملنے کہاں جا رہی ہوں۔ بہت مجبور ہو کر مجھے بتانا پڑا کہ میں ڈھائی بجے تم سے میٹل پورٹریٹ گیلری میں ملوں گی۔“

گیری نے سوت کہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہ تمہیں جبراً یہاں سے لے جا رہا ہے؟ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری حفاظت کر سکوں گا۔“

”گیری! یقین کی بات نہ کرو۔ میں تمہاری بھلائی کے لئے اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہوں۔“

”تمہارے جانے سے میری بھلائی نہیں ہوگی، میری توہین ہوگی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”تم سمجھنے کی کوشش کرو گیری! وہ تمہیں ہر قدم پر نقصان پہنچائے گا۔“

”وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہاں گلیوں میں سپاہی گشت کرتے رہتے ہیں۔ مزید خطرہ محسوس ہوا تو ہم ۹۹۹ نمبر ڈائل کر کے فوری طور پر پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔ تم خواہ مخواہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

ای وقت گلی میں کسی کار کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔

”وہ آگیا!“ مارگو نے کہا۔

”نہیں۔“ لیں شاید ٹیکسی ہے۔ ڈرائیور اسے مناسب جگہ پارک کر رہا ہے۔ میں نے اسے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم یہاں موجود ہو یا ٹینگ

تمہیں جبراً اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔ اب وہ تمہیں مجبور نہیں کر سکے گا۔ میں ابھی اس بد معاش کا انتقام کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کچن کی طرف چلا گیا۔

کچن کے استور روم میں ایک لوہے کی سلاخ پڑی ہوئی تھی وہ آہنی سلاخ کو اٹھا کر اس کے وزن اور اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے لگا۔ اسی وقت دوسرے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر ڈاکٹر ٹینک کی آواز سنائی دی۔ وہ مارگو سے کہہ رہا تھا۔ ”مارگو! میری جان! میں نے فضائی سفر کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ میں تمہیں جبراً لے جاؤں گا۔ جسے جنت ارضی بھی کہتے ہیں۔ ہم یہاں سے کار میں ڈوڈر جائیں گے وہاں سے لانچ میں بیٹھ کر کیلا کس پہنچیں گے۔ کیلا کس سے ٹرین کے ذریعے آج ہی رائے کوئٹہ میں پہنچ جائیں گے۔“

گیری تیزی سے چلا ہوا کمرے میں آگیا اور اپنے ہاتھوں میں آہنی سلاخ کو تولے ہوئے بولا۔

”تم کوئٹہ میں نہیں، جہنم میں جاؤ گے۔“

مارگو دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور آہنی سلاخ کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کا کوشش کرتی ہوئی بولی۔

”یہ کیا کر رہے ہو گیری۔ اسے پھینک دو۔“

”تم ہٹ جاؤ سامنے سے.....“ اس نے مارگو کو ایک طرف دھکا دیا اور تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے ٹینک پر حملہ کر دیا۔ ٹینک غافل نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی جھک گیا۔ آہنی سلاخ جو اس کے سر پر لگنے والی تھی، دیوار پر جا لگی۔ اس نے گیری کے منہ پر ایک زور دار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا۔ پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ٹینک اس کے منہ پر، سینہ پر اور پیٹ پر متواتر گھونسے برسائے لگا۔ اس کے ہاتھ سے آہنی سلاخ پہلے ہی گر پڑی تھی۔ وہ بھی پے درپے حملوں سے بوکھلا کر فرش پر گر پڑا۔ مارگو دوڑتی ہوئی ٹینک کے سامنے آگئی اور اس کے بازو کو تھام کر، بوکھلا کر التجا کرنے لگی۔

”ڈاکٹر! اسے نہ مارو۔ اسے چھوڑ دو۔ پلیز ڈاکٹر! میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“



”تم ہمارا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟“

گیری نے خلافِ توقع مسکرا کر کہا۔ ”پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں دوستانہ ماحول میں باتیں کرنے آیا ہوں۔ کیا تم تنہائی میں مجھ سے باتیں کرنا پسند کرو گے؟“

”کیوں نہیں گیری! میں نے شروع ہی سے یہ کوشش کی ہے کہ ہمارے تعلقات میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔ مگر اب تمہیں عقل آئی ہے۔ آؤ ہم آدھر چلتے ہیں۔“

وہ دونوں سڑک سے دور آکر ایک ڈھلوان سے اترنے لگے۔ گیری نے کہا۔

”مارگو تمہارے ساتھ راضی خوشی جا رہی ہے۔ مجھے پہلے ہی سوچنا چاہئے تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔“

”نہیں گیری! اپنے متعلق ایسا نہ سوچو۔“

”اب تک میں ایسا نہیں سوچ رہا تھا۔ جب سے تمہارے ویسے ہوئے ماورائی

کیسپول کھائے ہیں۔ اس وقت سے مثبت انداز میں سوچتا آ رہا ہوں کہ میں کلسر و فوٹیا مریض نہیں ہوں اور نہ ہی بوڑھا ہوں۔ خود کو جوان سمجھ کر ایک جوان لڑکی کو بھگال لیا۔

مجھے افسوس ہے۔“

وہ نشیب میں آکر اپنے اطراف پھیلی ہوئی اونچی نیچی پٹانوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔

”افسوس نہ کرو۔“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اچانک ہنسنے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم وہ کیسپول کھانے کے بعد میری اسٹنٹ کو لے اڑو گے تو میں تمہارے

علاج کے لئے وہ کیسپول کبھی تجویز نہ کرتا۔“

وہ باتوں کی دھن میں دو قدم آگے نکل گیا تھا۔ جب دوستانہ ماحول میں باتیں ہو رہی ہوں تو آگے پیچھے کا وہیمان نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں کمزور دشمن بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

گیری نے اچانک ہی ایک بھاری سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ ٹینٹک نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کر اس کی طرف پلٹ گیا لیکن حملہ اتنا زور دار تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔

اس کا مرلہ جمان ہو گیا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ ایسے رک رک کر سانس لے رہا تھا جیسے آخری پچکیاں لے رہا ہو۔

گیری پتھر کو ایک طرف پھینک کر واپس بھاگنے لگا آتے وقت راستہ آسان تھا۔

جاتے وقت اسے چڑھائی پر دوڑنا پڑ رہا تھا۔ وہ کسی طرح ہانپتے کانپتے اوپر آیا۔ پھر ڈارک میبل جب اس کی سانسیں اعتدال پر آگئیں تو وہ بڑے پرسکون انداز سے چلا ہوا ٹیکسی کے پاس آیا۔ اس نے ڈرائیو کو ٹیکسی کا کرایہ اور اس کا انعام دے کر رخصت کر دیا اور نیلی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مارگو سے بولا۔ ”آؤ بیٹھو!“

”ڈاکٹر کہاں ہے؟“ مارگو نے پوچھا۔

”تم بیٹھو میں بتا رہا ہوں۔“ وہ بیٹھ گئی۔ اس نے کار انسارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”کیا..... کیا تم نے اسے مار ڈالا ہے؟“

اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں وہ مردہ ہے یا زندہ۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ اب وہ ہمارا پیچھا کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

”نہیں!“ وہ چیخ کر بولی۔ ”تم نے اُسے قتل کیا ہے۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ گاڑی روکو.....“

”تم پاگلوں کی طرح کیوں چیخ رہی ہو۔ خاموش بیٹھی رہو۔ ہمیں جلد از جلد اس ملک سے نکل جانا ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں محبت میں اندھ سی ہو کر ایک قاتل کا ساتھ نہیں دوں گی۔ گاڑی روکو.....“

وہ اسٹیرنگ کو پکڑ کر جھٹکے دینے لگی۔ تیز رفتاری سے بھاگنے والی کار قابو سے باہر ہو گئی۔ گیری نے نورائی بریک لگایا۔ کار کے رکتے ہی مارگو دروازہ کھول کر بھاگنے لگی۔

”مارگو! رک جاؤ۔ وہ کار سے گھل کر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔“

مارگو ایک پہاڑی کی بلندی کی طرف جاری تھی، جہاں سے وہ گزر رہی تھی وہاں چھوٹی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ دوز بلندی پر ایک پرانا چرچ تھا جو نیچے راستے سے ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ گیری اسے آوازیں دیتا ہوا اوپر کی طرف جا رہا تھا۔

”مارگو! پاگل نہ بنو۔ تم کہاں جا رہی ہو؟“

"میں قانون کا ساتھ دینے جارہی ہوں۔ کہیں سے پولیس کو فون کروں گی۔ تم بہتر ٹینگ تھا۔ اس نے میرے کہنے پر تمہیں قتل نہیں کیا تھا۔"

"جو اس مت کرو۔ واپس آ جاؤ۔"

وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ مارگو ایک ابھری ہوئی چٹان پر چڑھ رہی تھی۔ گیری نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی۔

"رک جاؤ۔ تم مجھ سے دشمنی کر رہی ہو۔"

"نہیں۔ میں ایک قاتل کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے خود کو چھڑیلے کی کوشش کی۔ گیری نے ایک جھٹکے سے اس کی ٹانگ کھینچ لی۔ ایک بیک وہ چڑھ رہی تھی۔ مارگو نے الٹ گئی۔ گیری تھرا گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی مختلف چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی نیچے جارہی تھی۔ وہ بھی شیب کی طرف دوڑنے لگا۔

نیچے سڑک پر کار سے ذرا دور خون میں لتھڑی ہوئی مارگو بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس نے قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ دل کی دھڑکنیں بیٹھ کے لئے خاموش ہو گئی تھیں۔

وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگا۔ کار میں بیٹھ کر اسے اشارت کیا اور واپس موڑ کر لندن کی طرف جانے لگا۔

کار کی رفتار تیز تھی۔ اس کا ذہن بھی تیزی سے موج رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے؟ کہاں جانا چاہئے؟ اس اجنبی دیس میں کوئی اسے پناہ دینے والا نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو سرور اس سے انتقام لے گا۔ اگر مرچکا ہے تو پولیس خاموش نہیں بیٹھے گی۔ اس کا پیچھا کرے گی۔ اب بھلائی ہی میں تھی کہ وہ جلد از جلد اس ملک سے باہر نکل جائے۔

پھر ایسے نازک وقت پر اسے اپنی بیوی برٹائس کی یاد آئی۔ یاد آئی تو احساس ہوا کہ وہ بے چاری کتنی مظلوم ہے۔ وہ برسوں کا ساتھ چھوڑ آیا تھا۔ اس عورت نے اُن کی تنہائی کی تھی۔ بیوی پھر بیوی ہوتی ہے۔ وہی اس نازک موقع پر اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں میں چھپا سکتی تھی۔

لندن پہنچتے ہی اس نے ٹینگ کی کار ایک جگہ چھوڑ دی۔ پھر وہ تیزی سے پیدل چلے



تم بہت دور جا کر وہ ایک ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس بوتھ میں اسے صرف برٹائس کا نام اور فون نمبر یاد تھا۔ باقی وہ تمام دنیا کو بھول چکا تھا۔  
 ”ہیلو!“ سمندر پار سے برٹائس کی آواز سنائی دی۔  
 ”ہیلو برٹائس! میں گیری ہوں۔“  
 ”تم کہاں ہو؟“

”میں اب مک انگلینڈ میں ہوں۔ یہاں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“  
 ”تم خواہ مخواہ مصیبت مول لے رہے ہو۔ یہاں چلے آؤ۔“  
 ”ادہ برٹائس! کیا تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گی؟“  
 ”کبھی نہیں۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اس کے باوجود ایک دوسرے کی مصیبتوں میں کام آتا ہمارا فرض ہے۔ یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اس یقین کے ساتھ تمہارے جانے کا تماشا دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت جلد لوٹ آؤ گے۔ لوٹ آؤ گیری۔“

آنے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دیتا چاہتا ہوں کہ مجھ سے قتل ہو گیا ہے۔ پولیس کسی دقت بھی مجھے گرفتار کر سکتی ہے۔“

”ادہ! یہ تم نے کیا کیا گیری؟ بہر حال جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ فوراً یہاں چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں، گھبراؤ نہیں، میں ہر ممکن طریقے سے تمہاری حفاظت کروں گی۔“

”شکریہ برٹائس! تم نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ میں یہاں کی پہلی فلائٹ سے آ رہا ہوں۔“

اس نے ریمیور رکھ دیا۔ بوتھ کے باہر آ کر اس نے ایک ٹیکسی لی اور اس میں بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے لگا۔ پردہ گراؤم یہی تھا کہ وہاں سے سلمان سمیٹ کر پہلی فلائٹ میں سیٹ حاصل کر لے گا اور اپنی بیوی کی آغوش تک پہنچ جائے گا۔



وہ آواز۔ وہ آواز۔.....

گیری کی آنکھیں بند تھیں مگر اس نے آواز پہچان لی۔ وہ آواز ڈاکٹر نینگ کی تھی۔

وہ فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔

”تم گھبراتے کیوں ہو؟ تم اطمینان رکھو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ گیری بالکل

بے بس ہے۔.....“

گیری کے جسم میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ڈاکٹر نینگ کہاں سے آگیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک اس کے مکان میں آگیا ہو؟ ممکن تو نہیں ہے مگر اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”برنائس میری جان؟ تم آرام سے اپنے گھر میں بیٹھی رہو۔ میں گیری سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرنے کے بعد تمہیں فون کروں گا۔.....“

ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی۔ گیری آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بت تیز روشنی تھی۔ اس نے ”بشکل تمام آنکھیں کھولیں تو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ برنائس نے کھڑکیوں پر پردے پھیلا دیئے تھے مگر سامنے دلی کھڑکی پر پردہ نہیں تھا اور وہ اپنے بستر پر بھی نہیں تھا۔

وہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کھڑکی پر رکھی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے نیچے فریم کی اونچائی، کرسی کی اونچائی کے برابر تھی۔ اس لئے وہ آرام سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔

دو بلاشبہ ڈاکٹر نینگ کے مرجری روم میں تھا۔ وہی کشادہ کھڑکی تھی، وہی چمڑے سے منڈھی ہوئی کرسی تھی، جس پر بیٹھنے کے بعد اس نے دو عدد ماورائی کیسپول پانی کے ساتھ نگل لئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ وقت سے بت آگے بھاگ گیا تھا یا وقت اسے بائیں کی طرف کھینچ لایا تھا اسی وقت اپنے شانے کے قریب اسے نینگ کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو گیری؟“ اس کے مضبوط ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ یک ایک اسے تھٹکن کا احساس ہونے لگا۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ حالانکہ ڈاکٹر اس کا گلا نہیں دیوچ رہا تھا۔ پھر بھی اسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اسے چاروں طرف سے جکڑ دیا گیا ہے۔ کیسپول کا

اثر ختم ہو چکا تھا۔ کلسٹروفنیا کا مرض حاوی ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی گرفت سے خود کو چھڑا بھاگنے کے لئے اسے نوچ کھسوت رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹروں کی یہ عادت ہے۔ وہ ہر مریض کو یہی تسلی دیتے ہیں کہ ذرا سی تکلیف ہوگی پھر آرام آجائے گا۔ میں تم سے بھی یہی کہتا ہوں کہ کھڑکی کے باہر ذرا سی تکلیف ہوگی۔ پھر تمہیں بیٹھ کے لئے آرام آجائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے گیری کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر کھڑکی سے باہر کھینچ دیں۔ ایک چوڑے سے اس کا جسم کرسی سے سرکنا ہوا، کھڑکی کے فریم سے گزرتا ہوا ساتویں منزل کی بلڈنگ سے زمین کی پستی پر پہنچ گیا۔

☆-----☆-----☆

پولیس انسپکٹر کے سامنے گیری کی میڈیکل ہسٹری شیٹ اور دوسرے ڈاکٹروں اور رپورٹ رکھی ہوئی تھیں اور برائٹس بھی رو رو کر بتا رہی تھی کہ گیری پر بعض اوقات کس طرح جنون موار ہو جاتا تھا اور وہ دروازے سے نکل کر یا کسی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر کھلی فضا میں چلا جاتا ہے۔

تمام شواہد کے پیش نظر پولیس کو یقین ہو گیا کہ گیری اپنی موت کا خود ہی ذمہ دار ہے۔

ڈاکٹر ٹینک بڑی خوبصورت اداکاری کر رہا تھا۔ وہ ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹل رہا تھا اور خود کو الزام دے رہا تھا۔

”آہ۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں گیری کو سرجری روم میں ذرا سی دیر کے لئے اکیلا چھوڑ کر اس کمرے میں آ گیا تھا۔ آہ! ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا؟“

انسپکٹر نے کہا۔ ”ڈاکٹر تم نے اسے کیسپول کھلا کر پڑ سکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔ تم نے پوری طرح اپنا فرض ادا کیا ہے مگر تمہاری احتیاطی تدبیر بھی اسے نہ بچا سکی۔“

برائٹس نے بھی تائید کی۔ ”ہاں ڈاکٹر! تم خود کو الزام نہ دو۔ میرے خاندان کے جنرل اور پاگل پن نے اسے مارا ہے۔“

انسپکٹر ان سے رخصت ہو گیا۔ برائٹس اور ڈاکٹر اسے لفٹ تک چھوڑنے گئے تھے۔ اس کے جانے ہی برائٹس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تم نے کمال کر دیا ٹینک! ایسی مکمل پلاننگ کی ہے کہ سارا الزام مرنے والے پر

عام ہو گیا۔“

ٹینک نے مسکرا کر کہا۔ ”عورت کی خاطر بڑی بڑی جنگیں لڑی گئی ہیں۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میں نے تو ایک چھوٹا سا جرم کیا ہے۔ تم یہاں ٹھہرو جس تمہیں نیچے تک چھوڑنے جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ چیمبر میں واپس آ گیا۔

سرجری روم میں مارگو کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور خالی کرسی کو تنک رہی تھی۔ ٹینک نے اندر آ کر پوچھا۔

”تم یہاں کھڑی کیا موج رہی ہو؟“

مارگو کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آ گئی۔ اس نے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے ایکس رے رپورٹ دے کر مجھے دلی براؤ کے پاس بھیج دیا تھا۔ کاش کہ میں نہ جاتی۔ میں یہاں موجود ہوتی تو گیری کو کھڑکی سے چھلانگ لگانے کا موقع نہ دیتی۔ آف! میں ذرا سی دیر کے لئے گئی اور ذرا سی دیر میں یہاں کیا سے کیا ہو گیا۔“

”تم اس کے متعلق زیادہ نہ مویچو۔ ورنہ اسی طرح پریشان ہوتی رہو گی۔“ ڈاکٹر داش جین کے پاس آ کر اپنے دونوں ہاتھ دھونے لگا۔

مارگو نے چونک کر اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ ٹینک کے دائیں ہاتھ کی کلائی سے ذرا اوپر ناخنوں کی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ تل کا پانی ان خراشوں پر سے گزرتا بارہا تھا۔ وہ گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے مویچ رہا تھا کہ وہ ذرا سی دیر کے لئے ڈاکٹر دلی براؤ کے پاس گئی تھی اور ذرا سی دیر میں ڈاکٹر ٹینک کے ہاتھ پر خراشیں آ گئی تھیں۔

اس نے تالیے سے ہاتھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں برٹائس کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔ تم بھی چیمبر کو لاک کر کے گھر چلی جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ مارگو تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر واپس نہیں آئے گا تو وہ دوسرے کمرے میں آ گئی اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”ہیلو اسپیکر! میں ڈاکٹر ٹینک کی اسسٹنٹ مارگو بول رہی ہوں۔ دیکھئے مجھے شبہ ہے کہ گیری کی موت کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ذرا خاموش ہو گئی۔ انسپکٹر نے کہا: ”میری کی میڈیکل رپورٹ پڑھنے کے بعد یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی موت (ذمے دار ہے۔ پھر ہم بغیر کسی ثبوت کے کسی اور پر کیسے الزام عائد کر سکتے ہیں؟“

”ایک ثبوت ہے انسپکٹر! ڈاکٹر ٹینگ کے دائیں ہاتھ پر ناخنوں کی خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر آپ میری کے ناخنوں کا طبی معائنہ کرائیں تو اس میں کسی کے خون اور گوشت کی ہلکی سی کھرچن ضرور ملے گی۔ آپ اس کھرچن کا موازنہ ڈاکٹر ٹینگ کے خون اور گوشت سے کر سکتے ہیں۔“

انسپکٹر کی جوشیلی آواز سنائی دی۔

”شکریہ مس مارگوا تم نے قانون کی بہت بڑی مدد کی ہے۔ میں ابھی ایکشن لے رہا ہوں۔“

مارگو ریسیور رکھ کر تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے گیری بہت یاد آ رہا تھا۔ وہ بے چاری نہیں بائتی تھی کہ خیالی دنیا کا رہنے والا گیری اسے بھی پہاڑی چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر چکا تھا۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے کنبہ کیلنڈر کھلا ہوا تھا۔

کیلنڈر کے جفت صفحے پر آٹھ تاریخ تھی۔

اور وہ آٹھ تاریخ بڑی منحوس تھی۔

سوت

ل ہول

لوشٹ

ن اور

# خیال زدہ

ن لیو

و آہا

لٹوں

کتاب

جیل سے بھاگنے والے ایک مغرور قاتل کی کہانی۔ وہ صرف ایک بار اپنی  
مہین کو دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر تقدیر اس کے مخالف تھی ووجہ  
مہین کے سامنے پہنچا تو.....

بھلا اپنے آپ کو بھی کوئی سرے پاؤں تک دیکھ سکتا ہے؟ صرف آئینہ دکھا کر ہے مگر وہاں آئینہ نہیں تھا۔ ایک سنسان سارا رستہ تھا اور وہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ رات کی تنہائی میں وہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے سائے میں کھڑی ہے۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی ہے۔ ہر لمحے چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے، کوئی آواز نہیں رہا؟ خوف کے مارے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہاں سے چلی جائے۔ جتنی تیزی سے بھاگ سکتی ہے، بھاگ جائے۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو دور سے دیکھ رہی تھی مگر اپنے قریب جا کر اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔

اس کے سر پر بوڑھے برگد کا سایہ تھا اور اس کی بوڑھی ٹہنی اس کے آس پاس اس طرح جھول رہی تھیں جیسے اسے اپنی گرفت میں لے کر یا اپنی لٹوں کا پھندا بنا کر پھانسی پر چڑھا دینا چاہتی ہوں۔ وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ برگد کے درختوں میں چڑیلوں کا پناہ لیتی ہیں لیکن وہ چڑیلوں سے نہیں ڈرتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی آہستہ خیال دہشت زدہ کرتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی انجانا سا خوف اس کے رگ دپے میں دوڑ رہا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ جہاں اس کی ہمزاد کھڑی ہوئی تھی، ٹھیک اس کے پیچھے ایک انسانی سایہ سا جھلک رہا تھا۔ پہلے وہ سایہ واضح نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ برگد کا متحرک شاخ ہے جو اس کے وہی تصور میں مجسم ہو گیا ہے۔ لیکن..... جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا تب وہشت سے اس کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ چیخا چاہتی تھی لیکن آواز کو آواز دیکھی مٹیوں نے جکڑ لیا تھا۔

ہاں وہ ایک ہاتھ ہی تھا۔

نئے دیکھتے ہی اس کی جان نکل جاتی۔ وہ بھوتوں سے، چڑیلوں سے حتیٰ کہ موت



بھی نہیں گھبراتی تھی۔

لیکن وہ عالم ہاتھ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا اس کی پشت کی جانب سے بالکل سامنے آ گیا۔ اس کھردرے ہاتھ نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی کے پیالے میں لے لیا اور اپنی انگلیوں سے اس کے شفق رنگ رخساروں کو بڑی بے دروی سے پھول کی طرح مسلنے لگا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ اُن دیکھی ٹھیسوں میں جکڑی ہوئی چیخ ا یکدم سے ابھر کر رات کے سانے میں منتشر ہو گئی۔۔۔۔۔۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ قوم کے ملائم بستر پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور سانس لیتا ہوا سینہ اپنی اٹھان سے اوپر دھڑک رہا تھا۔ وہ بے نی پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر خود کو سمجھاتی رہی کہ وہ ایک خواب تھا، محض خواب۔

اس کی چیخ سنتے ہی سارے گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ پھر کتنے ہی ہاتھ خواب گاہ کے بند دروازے کو پیٹنے لگے۔ اپنوں کی آوازیں سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے اکل، آئی، کزن ایسے ہڑبڑا کر اندر چلے آئے جیسے دروازہ نہ کھلا ہو، سیلاب کا بند ٹوٹ گیا ہو۔

اکل نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ماریہ؟“

اس کے جواب دینے سے پہلے اس کے کزن نے کہا۔ ”دیکھئے تو ڈیڈی! کیسی پیلی پڑ گئی ہے۔ میں سمجھ گیا محترمہ کیوں چیخ رہی تھیں۔“

اس کی آئی نے ناگواری سے کہا۔ ”اس میں سمجھنے کی بات ہی کیا ہے، ہر دوسرے تیسرے روز ہماری نیند خراب کرتی ہے۔ پتہ نہیں رجب کا مہینہ کب آئے گا اور اس سے جان چھوٹے گی۔“

اس کے کزن نے کہا۔ ”بھئی! ماریہ نے آدمی رات کو چیخ ماری ہے اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ٹھیک آدمی رات کے بعد سے رجب کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد یہ سرخ بوڑا پسے گی اور ہمارا پیچھا چموز کر چلی جائے گی۔“ اس کی آئی ”ادرنہ“ کہہ کر چلی گئیں اور ان کے پیچھے ان کے بچے بھی چلے گئے۔ لانا کے جانے کے بعد اکل نے کہا۔

”بیٹی! پتہ نہیں وہ ہاتھ تمہارے خوابوں اور خیالوں میں کہاں سے چلا آتا ہے۔ شادی کے بعد بھی تمہاری یہی حالت رہی تو سسرال والے تمہارے بارے میں پتہ نہیں کیسی رائے قائم کریں۔ میرا خیال ہے مجھے کسی ماہر نفسیات سے ملنا چاہئے۔ وہی تمہارے ذہن کو کریدے گا اور تمہیں سمجھائے گا کہ جہ کچھ تم دیکھتی ہو، وہ محض وہم ہے یا ماضی کوئی معمولی سا واقعہ ہے جسے اتنی زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ تم اب آرام کرو۔ کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔ تمہیں اس طرح خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ میں صبح تمہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگے۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے پھر ایک بار ماریہ کو گہری سنجیدگی سے دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ”پیشیاں بڑی مشکل سے جیابی جاتی ہیں۔ پہلے تو جسمانی عیب کو دیکھا جاتا ہے۔ بظاہر کوئی عیب نہ ہوتا۔ رشتہ مانگنے والے دماغ کے اندر جھانک کر بھی اچھی طرح چھان پھک کر دیکھتے ہیں کہ لڑکی اندر سے بھی مکمل ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ باقاعدہ علاج سے تمہاری یہ کمزوری دور ہو جائے۔ تم لڑکیوں کو بیابنے کے لئے ماں باپ کو کتنے جھوٹ بولنا پڑتے ہیں، دوسروں کو تا عمر فریب دینا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھو، جس لڑکے سے تمہارا رشتہ ہو رہا ہے، اسے یہ نہیں بتایا گیا کہ تمہارا بھائی ایک حاوی مجرم ہے اور ان دنوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی جوانی کی قیمتی گھڑیاں گزار رہا ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہارے ہونے والے شوہر سے یہ بات کیوں چھپائی گئی ہے؟“

وہ اپنے پیچھے ایک سوال چھوڑ کر چلے گئے۔ ماریہ چند لمحوں تک بند دروازے کی طرف دیکھتے رہی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں بند دروازے کو جواب دیا۔

”ہاں! میں جانتی ہوں کہ یہ بات کس لئے چھپائی گئی ہے۔ میرا ہونے والا شوہر پولیس انسپکٹر ہے۔ بھائی مجرم اور خاوند قانون کا محافظ، آگ کو پانی سے چھپا کر ہی رکھنا پڑتا ہے۔“

ساتے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ ایک نظر کھڑکیوں پر ڈالی اور مطمئن ہو کر بستر پر آگئی۔

رات چپ تھی، دنیا سو رہی تھی اور کتنی ہی اندیشے جاگ رہے تھے۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ کوئی ماہر نفسیات اس کے ذہن کو کرید لے گا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس

راز تک پہنچے جو اچھی بھلی لڑکیوں کو بھی بتا دیتے ہیں۔ انکل نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ سہاگ کا جوڑا پہننے کے لئے بہت سے جھٹ اور فریب کا سہارا لیتا پڑتا ہے۔ وہ کیسا ہی ماہر نفسیات کیوں نہ ہو، میں اسے فریب دے دوں گی۔ اس لئے کہ ماں کے دامن پر داغ لگے تو وہ داغ سہاگن بنی کے ماتھے کا جھومر بن کر لوگوں کو متوجہ کر لیتا ہے۔

ایک سہاگن بننے کا خیال آیا تو دور اس کی سماعت میں کہیں شہنائی ہی گونجنے لگی۔ کھلی آنکھوں کے سامنے اس نے خود کو سرخ جوڑے میں دیکھا۔ وہ دلہن بنی جتنی حسین لگ رہی تھی، اتنی ہی اس کے ماتھے کا جھومر بد نما لگ رہا تھا۔ جھومر کے رنگ پر نکلے رنگوں سے سوپور کے بلب کی روشنی منعکس ہو رہی تھی، رنگین شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان رنگوں کی اچھل میں اس نے وہ تماشا دیکھا۔ وہ اس کی ماں کی خواب گاہ تھی۔ کوئی اجنبی کھڑکی کے راستے اندر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ چھ برس کی بچی تھی۔ بچوں جیسی گہری عیند سونے کی حاوی تھی۔ نہ جانے اس کی آنکھ کیسے کھل گئی۔ ایک اجنبی کو دیکھتے ہی اس نے ڈر کر جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ کتنے ہی چور ڈاکوؤں کے سنے ہوئے قصے ایک اجنبی کے روپ میں سامنے آ گئے۔

اس کی می ہر بڑا کر اٹھ گئیں اور اپنا لباس درست کرنے لگیں لیکن سوتے وقت دوپٹ پاس نہیں رہتا تھا۔ وہ دوپٹ اٹھانے کے لئے آگے بڑھیں تو اجنبی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چمڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ ”تمہیں میری خواب گاہ میں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟“

اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں کیسا مقناطیسی شباب لئے پھرتی ہوئی کہ میں خود بخود کھینچا چلا آیا۔ شاہید! میں نے بہت برواشت کیا، دور دور سے دیکھ کر لچکا تا رہا۔ میں سمجھتا تھا میری بوند بوند نگاہیں تمہاری پتھریلی سوچ میں میرے لئے جگہ پیدا کرویں گی لیکن تم بڑی بے حس ہو۔ میرا ایک دوست ماہر نفسیات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ ان سے محبت کی بھیک نہ مانگی جائے بلکہ جبراً ان کو ان سے چھین لیا جائے اور میں چھیننے کے لئے آیا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے شاہید کو اپنی طرف کھینچا اور اپنے غولادی بازوؤں کی فسیل میں قید کر لیا۔ وہ تڑپنے لگی، پھلنے لگی، یہ بھول گئی کہ اتنی جذباتی قربت میں بدن کا ذرہ ذرہ

فصیل کی دیواروں سے ٹکراتا ہے، لپکتا ہے اور دیوانگی کو شہ دیتا ہے۔ اجنبی نے قاتلہ انداز میں کہا۔

”میرے ماہر نفسیات دوست نے یہ بھی کہا تھا کہ عورت زبان سے کچھ نہ کہے اور چیخنے کی تکلیف گوارا نہ کرے۔ صرف خاموش اداؤں سے رسمی طور پر انکار کرتی رہے۔ سمجھو کہ وہ دام میں آگئی اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری گرفت سے نکلنے کے لئے چل رہی ہو مگر چیخنے کی تکلیف گوارا نہیں کر رہی ہو۔“

شاہینہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ”زیادہ ماہر نفسیات بننے کی کوشش نہ کرو۔ ماریہ کے ڈیڑھ پہلے ہی ہم دونوں پر شبہ کرتے ہیں۔ وہ ایک بار کہہ چکے ہیں کہ میں تم سے فری ہو کر باتیں نہ کروں۔ اگر میں نے چیخنا شروع کر دیا اور وہ آگئے تو کبھی یقین نہیں کریں گے کہ تم خود یہاں آئے ہو۔ ساری عمر کے لئے طعنہ بن جائے گا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا۔ عورت کی مجبوریوں کو سمجھو، خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔“

لیکن وہ نہ جاسکا۔ وہ اس شجر کے سائے تک پہنچ گیا تھا جہاں جانے کے لئے اس دنیا کے پہلے انسان کو بھی رد کیا گیا تھا اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جس بات کے لئے اسے رد کیا جائے، اس بات کے لئے وہ زیادہ چلتا ہے..... اور وہ چلتا گیا۔

ننھی سی حسی ہوئی ماریہ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر دیکھتی تھی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی یوں لگتا جیسے وہ بھوت اس کی ماں کی بوئیاں پہانے کے بعد اسے بھی کچا چبانے آجائے گا۔ تب اس کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”دیکھو، اب میں چیخنا شروع کر دوں گی۔ شیطان درندے! تو میری خاموشی کا غلط مطلب سمجھ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو کو اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی۔ اجنبی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی اور ماریہ کے ڈیڑھ کی آدائیں دیتی ہوئی وہاں سے بھاگنے لگی لیکن اجنبی اس سے زیادہ پھرتا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک دم اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ماریہ نے اس ظالم ہاتھ کو دیکھا۔ وہ پیچھے سے آیا تھا اور اس ہاتھ نے ماریہ کی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلی کے پچالے میں رکھ کر دبوچ لیا تھا۔ اس ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کی می کی چیخ گھٹ کر رہ گئی وہ ظالم انگلیاں اس کی می کے تھمتاتے ہوئے رخساروں میں پست ہو گئی تھیں۔ ماریہ کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا چہرہ، اپنی ٹھوڑی اور

اپنے رخسار ان انگلیوں کے شکنجے میں آگئے ہوں۔ پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ ٹھوڑی سے سرکتا ہوا گردن پر آگیا۔ پھر اس کا دم گھٹنے لگا۔ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ماں کا دم گھٹ رہا تھا اور بیٹی کی سانسیں رکی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے بستر پر ادھر سے ادھر ترپنے لگی۔ سانسیں تھیں کہ سینے تک پہنچنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ پتہ نہیں موت اسی طرح آتی ہے یا نہیں لیکن مادیہ عارضی طور پر مر گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ تھے۔ اس کے ڈیڑی تھے 'ڈاکٹر تھا اور پولیس کے آدمی یہ پوچھنے آئے تھے کہ اس کی سہی کو کس نے ہلاک کیا؟ وہ صرف اتنا ہی بتا سکی کہ ایک اجنبی تھا لیکن یہ نہ بتا سکی کہ اس اجنبی نے اس کی ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ وہ چھ برس کی بچی تھی لیکن اس کے ذہن میں اپنی ماں کی یہ بات نقش ہو گئی تھی کہ اگر اس نے اس اجنبی کا نام لیا یا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک حصہ بھی اپنے بیان میں لکھوایا تو اس کی ماں بدنام ہو جائے گی۔ بچپن میں اس نے تھیں ماں کی محبت سے متاثر ہو کر یہ بات چھپائی تھی۔ جو ان ہو کر پتہ چلا کہ یہ راز اس کے سہاگن بننے کے لئے بھی کتنا اہم ہے۔ اگر اس کے ہونے والے خاندان کو پتہ چل جائے کہ کوئی اجنبی رات کی تنہائی میں اس کی ماں کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا تو وہ بیٹی کے کردار پر بھی شبہ کرے گا۔ یہ مرد بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ عورت اپنی زندگی کی پوری کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے خاوند کو جی جان سے چاہے گی۔ اس کے اعتماد کو کبھی نہیں نہیں پہنچائے گی۔ سونے سے پہلے اپنی خواب گاہ کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند رکھا کرے گی تاکہ کوئی اجنبی ہاتھ اس کی ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے گروں تک نہ پہنچ سکے لیکن وہ ہاتھ جو اس کی ماں کی خواب گاہ سے چل کر اس کے ذہن کے تاریک تہہ خانے میں آکر بیٹھ گیا ہے، اس کی حقیقت کبھی نہیں جاتے گی۔

☆-----☆-----☆

وہ ولسن بنی پھولوں کی بیج پر بیٹھی تھی۔ نصف چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے دس بھرے ہونٹ اور ٹھوڑی کی بیضوی گولائی گھونگھٹ سے باہر نظر آرہی تھی۔ وہ ایک اجنبی ماحول میں آگئی تھی اور اس کمرے میں جو ساری زندگی کا ساتھ بن کر آنے

دالا تھا' وہ بھی اجنبی تھا' لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اپنے اجنبی کا پیار جو آج رات ملے گا زندگی کی آخری سانس تک اس کے ساتھ چلا رہے گا۔

وہ تنہا گھٹنوں کی طرف سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی تو اپنی عادت کے مطابق ماضی کی طرف لوٹ جاتی تھی اور وہاں سے جتنے زخم ملے تھے' ان پر امید کے مارے رکھتی جاتی تھی۔ ایک زخم تھا ماں کی بدامی' دوسرا زخم تھا بھائی کی جدائی جسے ہوش میں نہ سنبھالنے کے بعد اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن آج اسے ماضی یاد نہیں آ رہا تھا۔ حلقہ خوشبو' زیورات کی جھللاہٹ' سہاگ کے جوڑے کی آفتابیں رنگت ایسی ہوتی ہے کہ لڑکیاں وقتی طور پر بڑے سے بڑے الیے کو بھلا دیتی ہیں۔ ایسے وقت گھونگھٹ کے سناٹے میں صرف مستقبل کا سپنا نظر آتا ہے۔

وہ صرف اپنے خاندان کے متعلق سوچ رہی تھی۔ محبت کے آن دیکھے تھے جو اسے ملنے والے تھے' ان کے سرور کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ کچھ اپنی پیابنا سہیلیوں سے سنا تھا کہ سہاگ رات میں آنے والے کا انتظار کرنے کی جان لیوا ہوتا ہے۔ ہر آہٹ پر جان نکلتی ہے کہ پتہ نہیں آنے والا ظالم ہے یا مہربان؟ مہربان ہو یا نہ ہو مگر محبت کے اصولوں سے آشنا ہو۔ ایسا شخص ظالم ہو تو تیری ٹوپی دہن کی پیار بھری اداؤں سے پہلی ہی رات پگھل جاتا ہے اور جو پہلی رات دیوانہ بن جائے تو اس کی دیوانگی کا نشہ تمام عمر اس کے ذہن پر چھایا رہتا ہے۔ اس کی ایک سہیلی نے بتایا تھا کہ پہلی رات بہت اہم ہوتی ہے۔ یا تو عورت ہمیشہ کے لئے اپنے خاندان کو جیت لیتی ہے یا بچہ ہار جاتی ہے اور ساری عمر اس سے مرعوب رہتی ہے۔

اس کی سہیلی نے ایک بہت ہی اہم بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ جب خاندان اجنبی ہو اور اس کے مزاج سے واقفیت نہ ہو تو اسے آزمانے کا اور اس کے مزاج کو سمجھنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ عورت دلہن بن کر شرمائی رہے اور اپنے اجنبی ساتھی کی قربت سے سنبھتی رہے۔ جب وہ گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھنا چاہے تو پھر وہ اپنی گھبراہٹ کا اظہار کرے اور بڑے ہی شرمیلے لہجے میں پانی طلب کرے۔ اگر پہلی رات خاندان پانی اسے اپنے ہاتھوں سے پلائے تو سمجھ لینا کہ وہ فرمانبردار قسم کا خاندان ہے۔ ماریہ نے سوچ رکھا تھا کہ وہ بھی یہی نسخہ آزمائے گی۔

دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ وہ ایسے سسم کر سٹ گئی جیسے اچانک ہی کسی شکاری نے رائفل کا گھوڑا چڑھایا ہو۔ سمنے اور سمنے کے باوجود اس نے گھونگھٹ کے افق سے دیکھا دروازہ بند نظر آیا، قدموں کی چاپ نہیں تھی اور اس تھا کمرے میں کسی دوسرے کے قدموں کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر کوئی تھا اور اس کے پیچھے تھا۔ ساگ کے کمرے میں ہوا بھیم بھیم سی خواب آور روشنی ادنگھ رہی تھی اور اس خواب دیکھنے والی کے پیچھے خواب کا حلقہ و خیال کا وہ بھاری بھر کم اور کھردرا سا ہاتھ سرخ جوڑے کے پس منظر سے ظور ہو رہا ہے کہ ہاتھ پھر وہ ہاتھ ذرا آگے بڑھا اس کے بائیں کان کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے سامنے گھونگھٹ کے سنہرے کنارے سے ٹکرا گیا۔ گھونگھٹ میں ذرا سی ہلچل مچ گئی۔ دل کی باریگی اچھل کر دھڑکنے لگا۔ ماریہ نے سسم کر سر اٹھایا۔ اسی وقت اس کی ٹھوڑی اجنبی ہاتھ کے پیالے میں آگئی۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دیدے پھیل گئے۔ چیخ کی آواز اس کے سینے سے اٹھی اور مک مک کر، انگ انگ کر یک باریگی آتش فشاں کے لادے کی طرح اس کے دس بھرے لبوں سے منتشر ہو کر فضا میں گونج اٹھی۔

پھر اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے، کس دنیا میں ہے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ سماگ کی سیج پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ تھے۔ اس کے سانس سر، ایک ڈاکٹر اور ایک اجنبی نوجوان تھا جس کی رد پہلی شیردانی بتا رہی تھی کہ وہ اس کا دلہنا ہے۔ ڈاکٹر اس سے چیخنے اور خوفزدہ ہونے کی وجہ پوچھ رہا تھا اس کا خاندان بالکل ٹکچا پٹے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں اس کمرے میں آیا تھا یہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے دیکھ کر یہ خوفزدہ ہو جائیں۔ انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آپ ہی آپ چیخ مار کر بے ہوش کیسے ہو گئیں؟“

ماریہ سے پوچھا گیا تو اس نے بڑی خاموشی سے کچھ اس طرح نقاہت کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر بڑی نرمی سے کہا۔ ”ابھی کچھ نہ بولو تمہیں خاموشی اور آرام کی ضرورت ہے۔“

پھر اس نے اس کے سرال دالوں سے کہا۔ ”ولسن کو تنہا نہ چھوڑا جائے اور.....“ اس نے بات کو ادھوری چھوڑ کر اس کے خاوند کو دیکھا اور بڑی آہستگی سے

معنی خیر انداز میں کہا۔ ”اور آج رات دلہن کو دسرب نہ کیا جائے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی دواؤں کا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔ اس کے ساس سر تھوڑی دیر میں اسے تسلیاں دیتے رہے اور اسے سمجھاتے رہے کہ یہ اس کے لئے اجنبی ماحول ضرور ہے لیکن وہ سب اس کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر کسی سے خوف آتا ہو تو بلا جھجک کہہ دے اس کے دل سے خوف و دہشت دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اسے سمجھانے کے دوران اس کی ساس نے اپنے خاندان کو آنکھوں ہی آنکھوں پر اشارہ کیا کہ یہ سماگ کا کمرہ میں نے اپنے بیٹے کے لئے سجایا ہے۔ چلو یہاں سے۔

وہ دونوں دہاں سے چلے گئے۔ کمرے میں صرف اس کا دولا رہ گیا۔ وہ شرما کر اڑی گئی۔ تو اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”یہ شرمانے کا موقع نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہہ گیا ہے۔“

جہیں زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔“

وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر اس نے جبراً اس کے شانے کو تھام کر لٹا دیا اور مسکراتا ہوا بولا۔ ”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ صرف مجرم ہی اٹھا دیکھ کر چیخ کر بھاگتے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ جسے اپنی زندگی کا ساتھ بٹایا وہ بھی مجھے دیکھ کر ہار جاتا ہے۔“

وہ اپنی ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کو چھپاتی ہوئی بولی۔ ”میں..... میں آپ کا شرمندہ ہوں۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم شرمندہ ہو اور میں بھی یہ سوچ کر شرمندہ ہوں کہ پولیس والوں کے چہرے کتنے بھیانک ہوتے ہیں۔“

وہ ندامت سے بولی۔ ”مگر میں نے تو آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ہی کسی کا ہاتھ میری ٹھوڑی اور گردن تک آ گیا۔“

اس کے انسپکٹر خاندان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”بھئی وہ میرا ہاتھ تھا۔ کیا پیچھے ہاتھ آئے تو تم ڈر جاتی ہو؟“

اس نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ پھر ایک بار ہنستے ہوئے بولا۔ ”مجیب افند ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے میں اس بات کا حادی ہو گیا ہوں کہ مجرموں کو پیچھے سے جا کر پکڑتا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا مگر میں اپنی حادث سے مجبور ہوں۔“



کر تھمارے پیچھے آ گیا تھا۔ میرا یہ مذاق سر حال مجھے مہکا پڑا۔ دیکھو نا ڈاکٹر معنی خیر انداز میں کہہ گیا ہے کہ میں تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔ اب تو میں حسرت سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور ساری رات دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے اس کے نازک سے ملائم ہاتھوں کو تھام لیا اور اس کی گھجائی ہتھیلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑنے کو تو منع نہیں کیا ہے۔“

ماریہ نے کہہ ”میں بزدل نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیوں پیچھے سے کوئی ہاتھ آئے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ محبوب کا ہاتھ کسی مجرم کا ہاتھ نہیں ہوتا کہ پیچھے سے آئے۔ آپ کا ہاتھ جب بھی محبت سے سامنے آئے گا، اس کی اہمیت میری جان سے زیادہ ہوگی۔“

اس کے خاندان نے حوصلہ پا کر اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھالیا۔ دستور کے مطابق پہلی بار مرد کی انگلیاں عورت کی ٹھوڑی کو چھوتی ہیں تاکہ ہلکا سا ٹھکادے کہ اس کے چہرے کو اٹھائے، روشنی کی زد میں لائے اور چہرے کے نقوش کو جی بھر کر دیکھے۔

وہ دہی ہاتھ تھا جس کا لمس پاتے ہی وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی تھی لیکن اب وہ سامنے آیا اور محبت سے آیا تو وہ مارے شرم کے چھوٹی موٹی کی طرح سمٹ گئی۔ اس کے خاندان نے کہہ ”ہمارے رسم و رواج بڑے ہی فرسودہ ہیں۔ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ ماں باپ دیکھتے ہیں، پسند کرتے ہیں اور سہاگ کے اس رنگین پنجے میں دو اجنبیوں کو قید کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر لڑکی ایک اجنبی کی موجودگی سے سہم کر بے ہوش ہو جاتی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آؤ پہلے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ تم نے نکاح پڑھانے کے دوران میرا نام سنا ہوگا۔ میرا نام مراد علی ہے اور میں تمہارا نام جانتا ہوں لیکن اصل تعارف یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے مزاج سے آشنائی ہو اور مزاج تو رفتہ رفتہ سمجھ میں آتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ماریہ کے پھول جیسے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے گلہان میں سجا لیا۔

میں  
دور  
کھڑ  
میں  
ان  
تھکا  
پور  
لفظ  
ط  
ہی  
انج  
جا  
ہوا  
ج  
گ  
دو  
میں  
پا  
م  
ا  
م  
با

جیل کی آہنی سلاخوں کو توڑ کر ٹکٹا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے زبردستی ہے کہ قانون کے محافظ بھی مجرموں کا ساتھ دیں۔ ایک سپاہی نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ آج دروازے کا تالا توڑنے میں اس کی مدد کی تھی اور اسے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ جب جیل کے اسلٹ کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا تب اس سپاہی نے خطرے کا الارم بجایا۔ جیل وسیع چار دیواری میں ایک پھل سی مچ گئی۔ دہائی بوٹوں سے زمین کی چھاتی وہلنے لگی۔ وہ جیل کی اونچی دیوار پر دوڑتا رہا۔ دوڑنے کے دوران اسے پتہ چلا کہ کوئی اس کے ہر قریب اسے اپنی گرفت میں لینے آگیا ہے۔ اس نے دیوار کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نے بھی چھلانگ لگائی اور دونوں ایک ساتھ پانی میں آگرے۔ سرچ لائٹ کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ جہاں تھے وہاں تقریباً اندھیرا تھا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ اس نے قریب آنے والے پر ہاتھ چھوڑا۔ دوسرے نے اس کے حملے کو روکتے ہوئے کہا۔

”کیا کرتے ہو، میں بھی تمہاری طرح ایک مجرم ہوں۔ لڑنے جھگڑنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ چلو بھاگو جہاں سے۔“

پھر وہ دونوں تیرتے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف جانے لگے۔ جب سرچ لائٹ گھومتی ہوئی ان کی طرف آتی تو وہ پانی میں غوطہ لگا دیتے اور اندر ہی اندر تیرتے ہوئے دور تک نکل جاتے۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ چند لمحوں تک کتوں کی طرح ہانپتے رہے۔ انہوں نے پلٹ کر دور جیل کی چار دیواری کو دیکھا پھر پلٹ کر بھاگنے لگے۔ ان کے پیچھے سپاہی نہیں تھے لیکن جیل کا سائمن رات کے سنائے میں ”تک چیخا ہوا ان کا پیچھا کر رہا تھا۔“

رات کا پچھلا پرتھلا۔ راستے اور گلیاں دیر ان تھیں۔ اس لئے کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہوا۔ کبھی کبھی کسی گلی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ بہت دور جا کر وہ ایک ریلوے لائن تک پہنچ گئے۔ ان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ آڈٹر سگنل کی سرخ روشنی بتا رہی تھی کہ ٹرین کو آگے بڑھنے کے لئے سبز روشنی کا انتظار ہے۔ وہ ٹرین کی طرف بھاگنے لگے۔ مسلسل دوڑتے رہنے کی وجہ سے ان کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ تھک ہار کر گر پڑتے لیکن وہ جھٹکنے اور ہارنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بانٹتے تھے کہ اگر انہوں نے ذرا بھی تاخیر کی تو پولیس والے انہیں بھاگنے کا موقع نہیں دیں گے۔ تمام شر کی ناکہ بندی کر دیں گے۔ لہذا وہ محارے کے مطابق سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ آدھے فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انہوں نے سرخ روشنی کو سبز روشنی میں بدلتے دیکھ کر ٹرین اب چلنے ہی والی تھی۔ ان کے دوڑنے کی رفتار میں تیزی آگئی۔ جب پچاس گز کا فاصلہ رہ گیا تو انہیں نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز انہیں بلا رہی تھی۔ ”آؤ جلدی آؤ۔“ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور میں بانے والی ہوں۔ تمہیں قانون کی گرفت سے دور لے بانے والی ہوں۔“

پھر ٹرین کے رنگ آلود پئے حرکت میں آ گئے۔ دونوں دانت کچکپاتے ہوئے دوڑنے لگے۔ جیسے جیسے ان کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی، ٹرین کا آخری ڈبہ بھی ان کے قریب سے گزرتا جا رہا تھا۔ ایک نے اچھل کر بینڈل کو پکڑ لیا اور پائیدان پر دونوں پاؤں جما کر اپنا دوسرا ہاتھ نیچے بھاگتے ہوئے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرا ساتھی دوڑنے کے معاملے میں اتنا تیز نہیں تھا لیکن ایک ہاتھ نے اسے بہت سہارا دیا۔ وہ ہاتھ کو تھام کر اچھلتے ہوئے پائیدان سے لپٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا آدھا نچلا جسم زمین پر گھسٹے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیلوں کی زو میں آتا، اس کے ساتھی نے اس کا گریبان پکڑ کر پوری قوت سے اوپر اٹھایا۔ دوسرے کے لئے اتنا سہارا کافی تھا۔ وہ بھی پائیدان پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔

وہ کسی آفیسر کا سپیشل کپارٹمنٹ تھا۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ اندر ہلکی ہلکی نیلی روشنی تھی۔ ایک ادیبز عمر کا آدمی برتھ پر بیٹھا ہوا ولایتی دسکی کی چکیاں لے رہا

تھا اور ایک نیم عریاں عورت اس کے شانے سے نیک لگائے ایک ہاتھ سے اس کا رہی تھی۔ وہ دونوں مجرم و بک کر پائیدان پر بیٹھ گئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔

”اس کمپارٹمنٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شراب پینے والا آدمی کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے پاس یقیناً ریو اور ہو گا۔ اگر نہ ہو تب بھی وہ ہمیں دیکھتے ہی زنجیر کھینچے گا دوسرے نے تاکید میں سر ہلایا اور کہا۔ ”ہاں“ ہمیں ایسی کوئی حرکت نہیں چاہئے جس سے ٹرین رک جائے۔ یہ ہمیں جتنی دور لے جاسکتی ہے ہم جائیں گے۔ میں ہماری بہتری ہے۔“

وہ دونوں خاموشی سے پائیدان پر بیٹھے رہے۔ ٹرین شہری حدود سے باہر نکل آئی تھا اور اب جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نے ذرا اٹھا کر دیکھا۔ وہ آفیسر اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ جلدی نہ و بک کر اپنے ساتھی سے بولا۔ ”وہ کبجنت اسی طرف آ رہا ہے اب کیا ہو گا؟“

دوسرے نے کہا۔ ”اگر اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر ہمیں دیکھا تو میں ایسا ایسی تیسری کروں گا ورنہ وہ زنجیر کھینچ کر یا ہمیں ریو اور کی ذمہ میں لا کر ہماری ایسی تیسری وے گا۔“

وہ دونوں پائیدان سے اٹھ کر شیشے کی کھڑکی کے اطراف ایک دم محتاط ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ٹرین کھٹکھٹ کی آواز کے ساتھ اپنی پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور تیز سے گزرنے والے درختوں کے پتے ان کے چہرے پر جھاڑو پھیرتے جا رہے تھے۔ آفیسر شراب کے نشے میں جھومتا ہوا بالکل شیشے کے قریب آ کر رک گیا اور کھڑکی کے شیشے کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ڈارلنگ! ادھر آؤ۔ ذرا باہر کی تازہ ہوا کھائیں۔“

وہ اپنی جگہ ذرا نزاکت سے اٹھلاتی ہوئی بولی۔ ”میں نہیں آؤں گی، ٹھنڈی ہوا مجھے زکام ہو جاتا ہے۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نازک بدن حسیناؤں کی نزاکت کا کیا کہنا۔ انہیں تازہ ہوا سے بھی زکام ہو جاتا ہے۔“

اس عورت نے کہا۔ ”کھڑکی نہ کھولو، دیکھو باہر کتنا اندھیرا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”عورت کے خوفزدہ ہونے سے مرو کو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ سہم کر پناہ لینے کے لئے اپنے آپ ہی آغوش میں آجاتی ہے۔ مرو تو خطرات سے کھیلنے کا فادی ہوتا ہے۔“ یہ دیکھو میں باہر اندھیرے میں اپنا ہاتھ نکال رہا ہوں۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ تو نہیں لے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کے باہر اپنا ہاتھ نکال دیا۔ وہ ہاتھ ایک مجرم کے بالکل قریب سے گزر کر آگے کی طرف پھیل گیا۔ وہ ویدے پھیلا کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھی نے اشارے سے سمجھایا کہ خطرہ ہو تو ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچ لو۔

ٹرین طوفانی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ وہ دونوں وردازے کے اطراف ہینڈل کو تھامے چپکے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک تیسرا ہاتھ تھا جو ان کی ذرا سی غلطی سے انہیں قانون کے حوالے کر سکتا تھا۔ لہذا وہ دونوں غیر قانونی حرکتوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے اندر اس عورت نے حیرانی سے کہا۔

”ہائے ڈارلنگ! تم کتنے دلیر ہو۔ کیا تمہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔ پلیز ذرا باہر دیکھو تو آسمان بالکل تاریک ہے یا تارے نظر آرہے ہیں۔“

کچھ شراب کا نشہ تھا اور کچھ یہ بات تھی کہ عورت کی موجودگی میں اپنی مردانگی کا ثبوت دینے کا کوئی موقع ہاتھ آئے تو اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ اس نے ذرا اکر کر اپنی گردن جھکائی اور مرو کو کھڑکی سے باہر نکالا۔ وہ آسمان پر تارے دیکھنا چاہتا تھا لیکن دو طرف سے دو ہاتھوں نے آکر اسے کتنے ہی رنگ برنگے تارے دکھائے۔ تاہم توڑ کتنے ہی گھونے اس کے منہ پر پڑے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کمپارٹمنٹ میں واپس جاتا، دو ہاتھوں نے اس کے سر کے بالوں کو مضبوطی سے جکڑ کر باہر کی طرف کھینچ لیا۔ وہ کھڑکی پر آؤھا اؤھر آؤھا اؤھر ہو گیا۔ پھر ان دو ہاتھوں نے اس کے بالوں کو جھوڑ کر اس کی کمر پر پتلون میں ہاتھ ڈالا اور اسے پوری قوت سے باہر کی طرف کھینچ کر پھینک دیا۔ اس کی چیخیں دور تک سنائی دیتی رہیں۔ چونکہ وہ آخری کمپارٹمنٹ تھا اس لئے اس کی چیخیں پیچھے ہی رہ گئیں، آگے کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں۔

موت کا یہ تماشا دیکھنے والی صرف ایک عورت تھی جو ذرا دیر کے لئے سہم کر ایک جگہ دبک گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کی جان کا بھی خطرہ ہے، اسے خطرے کی زنجیر کھینچنا چاہئے۔ وہ زنجیر کھینچنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ موت

کا کھیل کھیلنے والے کسی کو اتنی مہلت کب دیتے ہیں۔ اتنی دیر میں وہ دونوں کھڑکی راستے اندر آ گئے تھے۔ ایک نے کھڑکی کا شیشہ گرایا، دوسرے نے اس عورت کا رو روک لیا۔ پھر اس عورت کی کٹائی تھام کر اپنے ساتھی سے ہنستے ہوئے بولا۔

”یار یہ تو بڑی کراہی چیز ہے۔ ماں کسم سات برس تک جیل کی ان سخت دیواروں کو دیکھا ہے۔ ایسا حسین مکھڑا دیکھنے کو تو ترس کر رہ گیا تھا۔“

یہ کہہ کر اس نے حسین مکھڑے کو اپنی جانب کھینچا تو وہ گھبرا کر چیختے لگی۔ اس ایک الٹا تھا اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے کی طرف گئی، میز پر رہی ہوئی شراب کی بوتل سے ٹکرائی اور فرش پر گر پڑی۔ وہ اپنی وارھی کھجاتے ہوئے باغ سفائی سے بولا۔ ”سالی آواز کرتی ہے۔ ابھی اپنے یار کے ساتھ رنگ رلیاں منارہی تھی ادی میں بھی تو مرد ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے، بدن پر قدیم کے کپڑے ہیں۔ لا! وہ صاحب بہادر کے کپڑے نکال۔ ابھی میں بھی تیرے ساتھ کھیلے گا ایک شریف آدمی بن جاؤں گا۔“

اتنے میں دروازے کے قریب کھٹکا سانسائی دیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ٹائلٹ میں ڈا اور ایک نوجوان کی گردن پکڑ کر اسے کپڑا ٹھنٹ میں لا رہا تھا۔ پھر اس نے اس کے سر ایک چپت مار کر اپنے ساتھی سے کہل۔ ”یہ آلو کا پٹھا ٹائلٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اب منہ بول! کیا کر رہا تھا ٹائلٹ میں؟“

یہ کہہ کر اس نے پھر ایک چپت رسید کی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رونے کے انداز میں بولا۔ ”تم دونوں کون ہو؟ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میرے بڑے صاحب کہاں گئے ہیں۔“

دوسرے ساتھی نے پھر ایک چپت بھارتے ہوئے کہل۔ ”ابے ہم سے سوال کئے جا رہا ہے، ہمارے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ پہلے یہ بتا کہ تو کون ہے؟ اور ٹائلٹ میں کیا کر رہا تھا؟“

اس کے ساتھی نے ہمتہ لگاتے ہوئے کہل۔ ”اس کی سگی بڑے صاحب کے سانچہ جوانی کے کھیل کھیل رہی تھی اور یہ آلو کا پٹھا شرابا کر ٹائلٹ میں چھپ گیا تھا۔ کیوں ہے ہے نا یہی بات؟“

اس کے ساتھی نے ذرا ڈانٹ کر کہل۔ ”تو سچ میں نہ بول، مجھے اس سے پوچھنے

دوسرے نے کہا۔ ”تو تو کسی سپاہی کی طرح مجھے ڈانٹ رہا ہے۔ کیا میں تیرا قیدی ہوں؟ اچھی بات ہے میں تیرے بیچ میں نہیں بولوں گا۔ تو اپنا کام کر میں اپنا کام کرتا ہوں۔“

وہ عورت کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آؤ میری جان! آؤ میرے سینے سے لگ

جاؤ۔“

وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”انکار کرو گی تو اپنے بڑے صاحب کے پاس پہنچ جاؤ گی، سیدھی طرح میرے پاس چلی آؤ۔“

اس نے آگے بڑھ کر اس کی گداز بانہوں کو تھام لیا لیکن اسے سینے سے نہ لگا سکا۔ اچانک اس کے ساتھی نے اسے پیچھے سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟ کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ پہلے ہمیں وہ کام کرنا چاہئے جس سے ہم دوسروں کی نظروں میں مشکوک نہ رہیں۔ یہ بڑھی ہوئی واڑھیاں، یہ جیل کے کپڑے۔ پہلے ان سے پیچھا چھڑاؤ۔ اس عورت سے پوچھو کہ اس آفیسر کے کپڑے اور شیو کرنے کا سامان کہاں ہے۔“

اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”تو تو کباب میں ہڈی بن گیا ہے۔ آخر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ یہ فریئر جیل ہے۔ کسی بہت بڑے اسٹیشن پر جا کر ہی رکے گی۔ تب تک یہ حینہ بھی کام آ جائے گی، اس بوتل کی نیکی کچی شراب بھی حلق سے اتر جائے گی اور بڑے صاحب کے کپڑے بھی ہمارے بدن پر آ جائیں گے۔“

”یہ تو فوفوں کی طرح باتیں نہ کرو۔ یہ گاڑی کہیں سگٹل نہ ہونے کی وجہ سے بھی رک سکتی ہے اور بڑے صاحب کے ملازم جو دوسرے کپڑا ٹمنٹ میں ہوں گے، یہاں آ سکتے ہیں۔ اس لئے تجھے سمجھانا ہوں کہ پہلے ہمیں اپنی حفاظت اور سلامتی کا کام کرنا چاہئے۔“

اس کے ساتھی نے مایوسی سے کہا۔ ”تو کتنا تو ٹھیک ہے۔ یہ بات میری کھوپڑی سے نکل گئی تھی کہ ترین کہیں بھی رک سکتی ہے۔ سنا اپنا مقدر ہی خراب ہے۔ سنا شراب ہے، شراب ہے، حب ہے، حب ہے، یہاں سے یہاں سے دھانے کے لئے ہیں، لھانے

کے لئے نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ تمام سامان کی تلاشی لینے لگا۔ وہ سرے نے پلٹ کر اس ٹائلٹ سے ڈالے نوجوان سے کہا۔ ”ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟“

وہ نوجوان ایک مجرم کی طرف کپار ٹمٹ کے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں ایک جو نیئر کلرک ہوں، میری ایک چوی ہے جو اپنے جینز میں ایک داگی بٹا کر لے کر آئی ہے۔ چار بچے ہیں جو پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ پھر میری اپنی زندگی کی ضرورتیں بھی ہیں جو ایک جو نیئر کلرک کی تنخواہ سے پوری نہیں ہوتیں۔“

قیدی نے اس کے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”اے میرے سامنے اپنی زندگی دکھا، کیوں رو رہا ہے، تجھے یہ باتیں اپنے افسروں سے کہنی چاہئیں۔“

”میں نے افسروں سے کہا تھا مگر رشوت کے بغیر ترقی نہیں ہوتی۔ میرے محلے کے ایک سینئر کلرک نے بس کی تنخواہ چار سو روپے ہے اور بس کی ادپری آمدنی آٹھ سو روپے ہے، اس نے مجھے رشوت دینے کا آسان طریقہ سکھایا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا بڑا صاحب بڑا رنگین مزاج ہے، وہ جب بھی دورے پر جاتا ہے تو اپنے ساتھ فرسٹ کلاس چھو کری لے کر جاتا ہے۔ تم بھی کسی فرسٹ کلاس چھو کری کا تحفہ پیش کرو تو تمہاری زندگی ہو جائے گی۔“

دوسری طرف دوسرے قیدی نے تمام سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اس نے دو جوڑے کپڑے لٹالے، شیونگ کا سامان نکالا، کھانے کا کچھ سامان لیا۔ پھر ان حب کو ایک تھیلے میں رکھ کر دوبارہ اس حسینہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس عورت نے شابہ سمجھ لیا تھا کہ شور مچانے سے اور ان درندوں سے لکڑھانے سے جان نہیں چھوٹے گی لہذا وہ بڑی خاموشی سے اس کی آغوش میں آگئی۔

اسی وقت جو نیئر کلرک نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”خدا کے لئے اے چھوٹا دو۔ میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔ مجھے ترقی نہیں چاہئے۔ میں اس کی عزت کو کھانا نہیں بنانا چاہتا۔“

اس حسینہ کو آغوش میں لینے والے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اے ایسا ہی شریف آدمی



ہے تو پھر اپنے بڑے صاحب کے سامنے اے کھلوانا کیوں بنا رہا تھا؟“  
 اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں نے کہا نا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں فرشتہ نہیں ہوں، انسان ہوں۔ غلطی کی ہے تو پچھتا بھی رہا ہوں۔ آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے۔  
 میری بیوی سنی ٹورم میں ہے، میرے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ اس لئے میں بہت مجبور ہو کر بہت مجبور ہو کر اپنی بہن کو سیل لے آیا ہوں۔“  
 یہ سنتے ہی اس کے سامنے کھڑے ہوئے قیدی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے ذہن کی تاریکیوں سے ایک بھائی اپنی بہن کو چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔ ”ماریہ..... ماریہ.....“

ماریہ میں تیرے لئے جیل کی سلاخیں توڑ کر آ رہا ہوں میری بہن! جتنی تیزی سے اس کا ذہن چیخ رہا تھا، اتنی ہی تیزی سے ٹرین بھاگتی جا رہی تھی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی ہر تال پر بہن کا نام بج رہا تھا۔ وہ جو سامنے نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ سیدھے ایک مجرم بھائی کے دل پر ٹپک رہے تھے۔ اس نے غراتے ہوئے پلٹ کر اس قیدی کو دیکھا جو ایک بھائی کی بہن کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ وہ ایک دم سے لرز گیا۔ اس سینہ کی جگہ اسے ماریہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک بارگی دوسرے قیدی پر چھلانگ لگائی۔ پھر اسے ہینچتا ہوا دور تک لے گیا۔ اس کے بعد اسے ایک گھونسلہ مار کر زمین پر گراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تجھے منع کیا تھا کہ اس عورت کو ہاتھ نہ لگانا۔“

مار کھانے والا جھلا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”سارے! یہ کیا تیری بہن ہے کہ تو منع کرتا ہے۔“ یہ کہتے ہی پھر اس کے منہ پر ٹھوکر لگی۔ وہ پھر زمین پر آ گیا۔

ٹھوکر مارنے والے قیدی نے کہا۔ ”ہاں، یہ میری بہن ہے۔ اگر ایک بھائی بے غیرت بن کر اپنی بہن کا سووا کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرا بھائی غیرت مند نہیں ہے۔ اگر تو میری غیرت کو آزماتا چاہتا ہے تو اس عورت کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ، میں تیری آنکھیں نکال لوں گا۔ آگے بڑھ کر اسے ہاتھ لگا، میں تیرے ہاتھ توڑ دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تو بہت بڑا قاتل ہو، ماریہ گرا ہی بد معاش ہو لیکن میرا نام بھی باہر ہے اور باہر کا نام سن کر صرف قاتل اور مجرم ہی نہیں، قانون کے محافظ بھی تھراتے ہیں۔“

زمین پر گرا ہوا قیدی اپنی بانجھوں سے رستے ہوئے خون کو پونچھتے ہوئے اپنے

مخاطب کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ زمین پر سے اٹھتا ہوا اور اس عورت کو کن و کھیر سے دیکھتا ہوا سوچنے لگا۔ بابر کا نام تو میں نے بھی سنا ہے، واقعی یہ ہے تو بڑا خطرناک، میں اس سے کمزور تو نہیں ہوں اور پھر ایک عورت کے سامنے مار کھا کر خاموش رہنا بڑی شرم کی بات ہے۔ ابھی اس نے میرا ہاتھ نہیں کھایا ہے، ذرا میں بھی اسے دو چار بازو کا مزا چکھا دوں۔

یہ سوچتے ہی اس نے ایک ایک اس پر حملہ کیا۔ بابر اس خوش فہمی میں مار کھا گیا کہ اس کا مخالف اس سے مرعوب ہو گیا ہے۔ اس نے سچ بچ بڑے کرارے ہاتھ جمائے پھر اسے رگیدتا ہوا دروازے تک لے گیا تھا۔ اس کے بعد بابر بھی سنبھل گیا، اس نے سچی جوانی داؤ پیچ دکھائے۔ وہ دونوں پھرے ہوئے ساندوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ کپار ٹنٹ میں جیسے زلزلہ آگیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے نہ ہار بان رہے تھے اور نہ ہی ہار جیت ا فیصلہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

بہت دیر بعد ان دونوں کو ذرا ہوش آیا کیونکہ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی تھی۔ وہ لڑائی جھگڑا بھول کر دروازے کے باہر دیکھنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، ان کے راستے الگ الگ تھے لیکن خطرہ ایک تھا۔ قانون کے محافظوں کا خطرہ، جیل کی چار دیواری میں دوبارہ بھیج دیئے جانے کا اندیشہ۔ دونوں اس خیال سے کانپ گئے کہ کیسا پولیس دالوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

جب ٹرین رک گئی تو ایک قیدی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”بابر! مجھے یاد رکھا“ میرا نام شکر ہے۔ شیر کے سنہ سے نوالہ چھیننا آسان ہے لیکن شوکت کی آغوش سے کسی حسینہ کو چھین لینا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔ آئندہ تو کبھی میرے سامنے آئے گا تو اپنی موت کے سامنے آئے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ اندھیرے میں گم ہو پ۔ تھا۔ بابر نے اندھیرے کی جانب حقارت سے دیکھا پھر اس نے کپار ٹنٹ میں بیٹھی ہوئی اس نوجوان عورت اور اس کے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ اور اب شرافت کی زندگی گزارو۔ ماں اور بہن کے مقدس رشتے کا یہ پوار نہ کرو۔ اگر آئندہ میں نے تم دونوں کو اس روپ میں دیکھا تو وہیں تمہیں ذبح کر کے رکھ دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اپارٹمنٹ سے باہر تارکی میں گم ہو گیا۔

☆-----☆-----☆

ماریہ ڈریسنگ نہیں کے سامنے سکھار میں مصروف تھی۔ اس کے جسم پر بہترین لباس تھا، قیمتی زیورات تھے اور پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہے۔ اب وہ اپنے ماضی کے متعلق نہیں سوچتی تھی، صرف اپنے خاوند مراد علی کے متعلق سوچتی تھی۔ خاوند کا تعلق صرف حال اور مستقبل سے ہوتا ہے، اس لئے وہ مراد کے ساتھ مستقبل کے سہانے چہے دیکھتی رہتی تھی۔ البتہ جب وہ مراد کو پولیس انسپکٹر کی دروی میں دیکھتی تو اس دروی کی نسبت سے اسے اپنا مجرم بھائی یاد آ جاتا تھا اور وہ سوچنے لگتی۔ ”بھائی کیسا ہو گا؟ کیا اسے یاد کرتا ہو گا۔“

اسے بھائی کے ساتھ گزری ہوئی بچپن کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ پتہ نہیں وہ بادیں بھائی کو بھی تڑپاتی تھیں یا نہیں؟ ایک بہن کے لئے بھائی کا رشتہ کتنا قابل فخر ہوتا ہے مگر اس نے مراد کو فخر سے اب تک یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا بھائی ایک مجرم ہے جو بچپن سے لاپتہ ہے اور اس کی یاد اسے بہت تڑپاتی ہے۔

اخٹی کی یادیں بڑی مکار ہوتی ہیں۔ کتنی میرا پھیری سے بھائی کی محبت کا سہارا لے کر کچھ یادوں کے درے کچھ کھول دیتی ہیں اور وہ جسے دعویٰ تھا کہ ماضی کو بھول چکی ہے، وہ ٹرانسنگی میں پھر اسی طرف لوٹ جاتی تھی۔

باہر موٹر سائیکل کی آواز سن کر وہ چومک گئی۔ مراد آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اپنے چہرے کے میک اپ کو آخری ٹچ دیتے لگی۔ وہ بڑی عجلت سے اپنے چہرے کی نوک پلک درست کرتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھی تو مراد اندر آ گیا۔ وہ پولیس انسپکٹر کی دروی میں تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر رونق نہیں تھی۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ماریہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟ آپ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے ہیں۔“

”پولیس کی ڈیوٹی ہی ایسی ہے کہ تھکن اور پریشانیاں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔“

”میں آپ کی شریک حیات ہوں۔ آپ کے فرائض کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن آج سے پہلے آپ کبھی اتنے پریشان نظر نہیں آئے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ آج کوئی نامناسب

قسم کی پریشانی ہے۔“

”ہاں، تمہارا خیال درست ہے۔ پچھلی رات جلال آباد کی سنٹرل جیل سے دو قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بابر مام کا مجرم بہت ہی خطرناک ہے اور میری جان دشمن ہے۔“

بابر کا نام سنتے ہی ماریہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چند ساعتوں تک اس پر سکتہ طاری رہا۔ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے بھائی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے اگلے کبھی کبھی اس کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے اور یہ بھی تاکید کرتے رہتے تھے ”بھائی کو میکے کی چار دیواری میں یاد کرو اور سسرال کی وسیع دنیا میں جا کر بھول جاؤ کہ کسی کی بہن ہو۔“

انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا بھائی بابر ان دنوں جلال آباد کی سنٹرل جیل میں ہے۔ سکتے کے حالم میں وہ چند ساعتیں صدیوں کی طرح گزر گئیں۔ مراد نے اسے گنجھوا کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم تو بالکل پتھر کا مجسمہ بن گئی ہو۔ شاید یہ بات تمہیں خوفزدہ کر رہی ہے کہ بابر میری جان کا دشمن ہے۔ ادنہ، اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ کتنے مجرم جو میرے ہاتھوں سے گرفتار ہوتے ہیں اور جن کے خلاف میں ٹھوس ثبوت فراہم کرتا ہوں، وہ سب میرے دشمن بن جاتے ہیں۔ میری ملازمت ہی ایسی ہے۔ آج پہلے میں تبھی اتنا پریشان نہیں ہوا لیکن آج کی پریشانی محض تمہاری وجہ سے ہے۔“

وہ چونک کر مراد کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنے نیال کے مطابق درست کہہ رہا تھا اور اپنے طور پر سوچ رہی تھی کہ میرا بھائی میرے سہاگ کا دشمن ہے لہذا بھائی کے غلطی مراد کی پریشانیوں کا باعث بنوں گی۔ اس کے جی میں آیا کہ اپنے خاندان کے سامنے حقیقت اگل دے کہ بابر جیسا خطرناک مجرم اس کا بھائی ہے اور سب بھائی کو معلوم ہو گا کہ آپ میرا سہاگ ہیں، آپ میری زندگی ہیں تو وہ بہن کی کھالوں کی چوڑیاں نہیں ڈرتے گا۔

لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ بچپن ہی سے اس کے اگل اسے سمجھاتے آئے تھے۔ ”ہمارا عزت کا نیال کرو۔ تمہارے ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں نے تمہیں عزت و آبرو اپنے پاس رکھا ہے لیکن اس گھر میں کبھی تمہارے بھائی کا نام بھی آیا تو میری عزت

میں مل جائے گی۔“

برسوں کے سکھانے پڑھانے کا بڑا گمراہ اثر تھا لہذا اس نے مراد کے سامنے اپنی کتب خانہ زندگی کے اس درق کو چھپا لیا جس پر اس کے بھائی کا نام لکھا ہوا تھا۔  
مراد نے کہا۔ ”تم شاید نہیں سمجھیں کہ میں تمہاری وجہ سے کس لئے پریشان ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلے میں تھا تھا کوئی ذمہ داری میرے سر پر نہیں تھی۔ مگر اب تمہاری ذمہ داریاں میرے سر پر ہیں۔ صرف ذمہ داریاں ہی نہیں تمہاری وہ محبت بھی جو ڈیوٹی کے اوقات میں یاد آتی رہتی اور تڑپاتی رہتی ہے۔ ان سب باتوں نے مجھے کمزور بنا دیا ہے۔ سوچتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا کیا ہو گا؟“

ماریہ نے تڑپ کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ آپ کو کچھ نہ ہو گا“ میری محبت گچی ہے۔ اگر باہر اس درد داڑے پر آئے گا اور میری پیار بھری خوشگوار زندگی کو دیکھے گا تو خاموشی سے سر جھکا کر لوٹ جائے گا۔“  
مراد نے بہتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور کہا۔ ”بعض اوقات تم بالکل ضمنی سی بچیوں کی طرح باتیں کرتی ہو۔ یہ چور بد معاش اور قاتل اپنے سینے میں فولاد کا دل رکھتے ہیں۔ بیوی، بیٹی یا بہن کی خوشیاں بھی انہیں موم نہیں بنا سکتیں۔“  
ماریہ نے کہا۔ ”آپ اپنے تجربات کے اعتبار سے درست کہتے ہیں لیکن آپ میری بات مان لیں۔ کسی طرح مجھے اس مفرد قیدی سے ملنے کا موقع دیں۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔“

”ماریہ! ذرا عقل سے کام لو۔ اگر میں تمہیں اس سے ملنے کا موقع دے سکتا تو کیا اب تک اسے گرفتار نہ کر لیتا۔ کیا مفرد قیدی یہ بتا کر باتے ہیں کہ وہ کس پتے پر ملاقات کریں گے؟“

ماریہ الجھ گئی۔ بھائی کے وجود کو چھپانے کے لئے پتہ نہیں کیسی الٹی سیدھی باتیں کہنے جا رہی تھی۔ مراد نے اسے پیار سے چومتے ہوئے کہا۔ ”میری پریشانوں نے تمہیں پریشان کر دیا ہے۔ تمہارا دماغ اس وقت معقول باتیں سوچنے کے قابل نہیں ہے۔ اس وقت تمہیں تفریح کی ضرورت ہے اور مجھے یاد ہے کہ آج ہم نے انگریزی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔ تم تو تیار ہو چکی ہو۔ اب مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ میں لباس بدل کر

تمہارے ساتھ چلا ہوں۔“

ماریہ نے کہا۔ ”پہلے آپ غسل کریں۔ غسل کرنے سے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ پھر گرم گرم چائے پلاؤں گی۔ سنا ہے چائے پینے سے فرحت اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد دم بکچر دیکھنے جائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ تفریح کے لئے باہر نکلے۔ بہت دیر تک سمندر کے ساحل پر ٹہکتے رہے۔ وہ ماحول بڑا رومان پرور تھا۔ رومان پرور گفتگو کے دوران ان دونوں کے دماغ میں ایک کانٹا کھٹک رہا تھا۔ مراد کے دماغ میں ایک مفرور قیدی کی چھین تھی جو اس کا جانی دشمن تھا اور ماریہ کے دماغ میں ایک مجرم بھائی کا رشتہ چھ رہا تھا۔

جب وہ سینما ہال میں آکر بیٹھے تو ان کا خیال تھا کہ کم از کم دو گھنٹے تک انہیں ہم سوچ و فکر سے نجات مل جائے گی اور وہ فلمی کہانی کی خیالی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ جب فلم شروع ہوئی تو اسکرین کے مناظر بڑے بھیاک ثابت ہوئے۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ پولیس انسپکٹر نے مقابلے کے دوران ایک مجرم کے ہاتھ کو کلائی سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ مجرم اسی وقت مر گیا لیکن اس کے بعد کہانی نے ایک بھیاک روپ اختیار کر لیا۔ مجرم کے مرنے کے بعد بھی اس کا کٹا ہوا ہاتھ زندہ رہا۔ اب وہ ہاتھ اپنی انگلیوں کے لئے آہستہ آہستہ زمین پر ریگلتا تھا اور پولیس انسپکٹر کا پیچھا کرتا تھا۔

اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہی ماریہ کی جیسے جان نکلنے لگی تھی لیکن خوف و دہشت ابھی اتنا کو نہیں پہنچی تھی۔ ابھی وہ ریگلتا ہوا ہاتھ نگاہوں کے سامنے ہی تھا اور جو ہاتھ سامنے سے آئے اس سے ماریہ خوفزدہ نہیں ہوتی تھی البتہ کسی بہت بڑے خطرے کا پیش نظر اس نے احتیاطاً مراد کے بازو کو تھام لیا تھا۔

فلم کا ہر منظر ایسا تھا کہ وہ ہر منظر کے نکتہ عروج پر کانپ کانپ جاتی تھی۔ اس کا بڑی آہستگی سے لرزتے ہوئے لہجے میں مراد سے التجائی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز سدا سے چلئے۔ یہ تفریح عذاب جاں بن گئی ہے۔“

مراد نے اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تم واقعی مضیٰ بی بی ہو۔ بمبئی یہ تو محض ایک فلم ہے، سچ سچ کا واقعہ تو نہیں ہے کہ وہ ہاتھ تمہارے پاس

آئے گلہ میری جان! تم پولیس انسپکٹر کی بیوی ہو۔ تمہیں دلیر بن کر رہنا چاہئے۔“  
 اس نے پھر التجا نہیں کی۔ دلیر بننے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ ہاتھ کمانی کے  
 کلاٹکس تک پہنچ رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ وہشت انگیز بنتا جا رہا تھا۔ اس ہاتھ نے چشم  
 تصور میں اس کی ماں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور دو چھ سال کی بچی سمی ہوئی اپنے بستر پر  
 سگری سمی سی پڑی ہوئی تھی اور وہ ہاتھ اس کی ماں کی لاش پر سے گزرنے کے بعد اس  
 کی طرف آ رہا تھا اور پیچھے سے آ رہا تھا کیونکہ اس نے بال کے اندھیرے میں بیٹھے ہی  
 بیٹھے ہاتھ کی کلائی کو اپنی گروں سے مس ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر وہ ہاتھ اس کے  
 دائیں کان کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے رخسار کو چھوتا ہوا اس کی ٹھوڑی کے نیچے  
 ہتھیلی کا پیالہ بن گیا۔ اس نے ایک زور کی چیخ ماری پھر اسے ہوش نہ رہا کہ اس کی چیخ نے  
 سینما ہال میں کیسی کھلبلی مچا دی تھی اور مراد کو یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ ہال کی تاریکی سے  
 ڈنڈہ اٹھا کر اس نے اپنی پیاری بیوی کو چومنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

☆-----☆-----☆

بار صبح سے شام تک جنگلوں میں بھٹکتا رہا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے اس کا  
 برا حال ہو رہا تھا۔ شام کے قریب وہ ایک بستی میں پہنچ گیا۔ بستی میں داخل ہونے پر  
 پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کے فرار ہونے کی خبر اس علاقے کے تھانے تک پہنچ  
 چکی ہے یا نہیں۔ وہ بستی چھوٹی سی تھی۔ سو ڈیڑھ سو کچے کچے مکانات پر مشتمل تھی  
 بستی کے سرے پر جو مکان تھا وہ کھیتوں کی طرف دوسرے مکانات سے ذرا دور ہوتا  
 تھا۔ کھلیان میں سوکھی زرد گھاس پر اونچا سا ایک پہاڑی نما ڈھیر تھا۔ وہ چھپتا چھپاتا  
 گھاس کی بلندی تک پہنچ گیا۔ اس نے سوکھی ہوئی زرد گھاس کے ٹکڑوں کو اپنے اوپر ڈال  
 لیا اور ایک ذرا سا سر نکال کر بستی کا جائزہ لینے لگا۔ دور بہت دور جہاں بستی کی گھنٹی لگتی  
 تھی وہاں کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔  
 اس لئے لوگ اپنے مکانوں کی چار دیواری تک محدود ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک  
 یا سات برس کی لڑکی بستی کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اچانک اسے یاد  
 یاد آگئی۔ آخری بار جب اس نے ماریہ کو دیکھا تھا تو وہ چھ برس کی تھی اور وہ بیس برس کا  
 جوان تھا۔ زندگی کے چھ برس بھائی بہن نے کتنی محبت سے گزارے تھے۔ اس محبت  
 ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔

تقدیر کتنی ظالم ہوتی ہے۔ صرف چھ برس کے لئے منہ سی معصوم بہن کی جان  
 دی پھر اسے عمر بھر کے لئے جیل کی ملاخوں کے پیچھے بھیج دیا۔ کاش وہ مجرم بننے سے پہلے  
 یہ سوچ لیتا کہ بہن بیوہ کے لئے پکھڑ جائے گی اور اس کی محبت کے بغیر بچا اور چنگی کا  
 محتاج بن کر اپنی زندگی گزارے گی۔

لیکن وہ قاتل بننے پر مجبور تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ڈیڈی کو شراب پڑا



نے بے حد کمزور بنادیا تھا۔ ڈیڈی وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے تھے اور مئی وقت گزرنے کے بعد بھی جوان تھیں اور ڈیڈی کا ایک عیاش دوست شمشاد علی اس کی ماں پر بری نظر رکھتا تھا۔ وہ اس رات جاگ رہا تھا بسبب شمشاد علی چوروں کی طرح اس کی ماں کی خواب گاہ میں کڑکی کے راستے داخل ہوا تھا۔ اس نے شمشاد علی کو خواب گاہ میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا، اسے واپس بھاگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت اسے لٹکانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کی ماں بدنام ہو جاتی۔ وہ ماں کی موت پر بظاہر خاموش رہا لیکن انتقام کی آگ اس کے اندر لادنے کی طرح پکتی رہی۔ دوسری رات اس نے شمشاد علی کی خواب گاہ میں جا کر اسے قتل کر دیا۔ انتقام کی آگ تو سرد پڑ گئی لیکن بہن کا بچپن اور اس کی تھمائی اسے ڈننے لگی۔ ایک سال کے بعد اس کے چچا نے آکر بتایا کہ اس کے ڈیڈی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ ماریہ کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔ وہ وقتی طور پر کسی حد تک مطمئن ہو گیا لیکن دس سال بعد جب اسے پتہ چلا کہ اس کی بہن ہوان ہو چکی ہے اور بیابان کے قاتل ہو گئی ہے تو وہ بہن کو ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپ گیا۔ اس کے چچا نے کہا تھا۔

”تمہاری محبت اس کی زندگی نہیں سنوار سکتی۔ تم نے جو قتل کیا ہے اس جرم کا داغ تمہاری بہن کی پیشانی پر اس قدر نمایاں ہو گیا ہے کہ اب میں جلال آباد چھوڑ کر حسن آباد جا رہا ہوں۔ یہاں اس کا رشتہ نہیں آتا کیونکہ وہ ایک قاتل کی بہن ہے۔ تم نے دس سال کے عرصے میں کئی بار جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تم کبھی فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ تو ماریہ کی طرف رخ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کو بتانا کہ تم اس کے بھائی ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بہن سہاگن بنے تو ایک بار پھر قاتل بن کر بھائی کے رشتے کو قتل کر دو۔ اس کے لئے سرجاؤ۔ بس میں یہی کہنے آیا تھا۔“

یہ کہہ کر اس کے چچا جلنے لگے۔ بار نے جیل کی ملاخوں سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”ٹھہریئے! میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اجنبی بن کر ہی اسے ایک بار دیکھ لوں؟“

اس کے چچا نے سختی سے کہا۔ ”میں۔ میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ تم اس کے لئے سرجاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے لئے مر جائے۔ کیونکہ کوئی بھی عورت خواہ وہ

بہی ہو یا بہن، اپنے سہاگ پر آج آتے نہیں دیکھ سکتی اور میں تمہاری اطلاع کے لئے کہہ دوں کہ اس کا رشتہ انسپکٹر مراد علی سے ہونے والا ہے جس نے تمہیں گرفتار کیا اور جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ جیل کی سلاخوں سے باہر آگیا تو اسے ضرور قتل کر دے گا۔ اب تم ان سلاخوں کے پیچھے سوچتے رہو، کیا اپنی جن کا سہاگ اجازت دے سکتا ہو؟

وہ سوچتا رہ گیا اور اس کے چچا چلے گئے۔ وہ چند دنوں تک بڑی کشمکش میں رہا یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی معصوم بہن کے سہاگ کا دشمن بن جاتا۔ پھر جس دن اسے بار کی خادی کی اطلاع ملی، اس نے اسی دن انسپکٹر مراد علی کو معاف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اب جیل کی چار دیواری میں زندہ نہیں رہے گا اور یہاں سے فرار کر باقی زندگی کسی دوسرے ملک میں گزارے گا۔ یہاں رہ کر بہن کی یاد تازہ رہے گی اور یہاں سے جانے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بہن کو دیکھے گا۔ ایک بار اس کی زبان سے وہ نام نکلے گا۔ یہ نہیں بہن کی زبان میں کیسی منہاس ہوتی ہے کہ نام کیسا ہی ہو، اس زبان کی اونٹنی سے خوبصورت بن جاتا ہے۔ باہر کو مجرم کہنے والوں کی دنیا میں صرف ایک ہی زبان تھی جو اسے بھائی کہہ سکتی تھی۔

وہ ایک گہری حانس نے کر جیل کی چار دیواری سے لوٹ آیا اور گھاس کے ڈھیر میں لینے ہی لیے پھر اس چھ سالہ لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اب وہ لڑکی قریب آگئی تھی۔ باہر بے خوف و خطر گھاس کے ڈھیر سے باہر آگیا۔ وہ لڑکی ٹھٹھک کر بولی۔ ”کون ہو تم؟“

باہر نے آرام سے دونوں پاؤں کو گھاس پر پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بھول گئیں ماریہ کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔“

لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میرا نام ماریہ نہیں مریم ہے اور تم میرے بھائی کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم اتنے بڑے ہو، تمہاری داڑھی بھی کتنی بڑھی ہوئی ہے۔ تم تو بوڑھے ہو، تم میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔ میرا بھائی تو اتنا بڑا ہے، جو ان ہے اور لام پر گیا ہوا ہے۔“

باہر نے کہا۔ ”جب ماریہ چھ برس کی تھی تو میں بھی تمہارے بھائی کی طرح جوان تھا اور تمہارے بھائی کی طرح زندگی کی جنگ لڑنے چلا گیا تھا۔ جب تمہارا بھائی لام سے واپس آئے گا تو وہ بھی میری طرح بوڑھا نظر آئے گا۔ دیکھو تم میری ماریہ بن جاؤ، میں تمہارا بھائی بن جاتا ہوں۔ تم ابھی بچی ہو، تم نہیں سمجھو گی کہ اس طرح دیر مانس میں بھائی بن

کی محبت کے گزرے ہوئے لمحات پھر ہماری مٹھی میں آجائیں گے۔“  
لوکی نے معصومیت سے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”پتہ نہیں تم کیسی ٹیڑھی میڑھی باتیں کرتے ہو۔ میرا بھائی بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ اس لئے میں تمہیں بھائی کہتی ہوں۔ آؤ اب میرے ساتھ گھر چلو۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں میرے بوڑھے بابا رہتے ہیں۔ میں اپنے بابا کے ساتھ دروازے بھائی کی داپھی کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور بچی کا نازک سا ہاتھ تھام کر اس کے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ مریم نے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج بابا کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تک جی نہیں جلاتی۔ گھر میں اندھیرا ہو تو مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ مگر ابھی تو تم میرے ساتھ مونا..... مجھے ڈرنا نہیں چاہئے۔“

بابر نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، تمہیں نہیں ڈرنا چاہئے۔ میری بہن ماریہ بہت دلیر ہے۔ چونکہ تم میری بہن بن گئی ہو، اس لئے تمہیں بھی دلیر بننا چاہئے۔“

وہ مکان کے برآمدے میں پہنچ گئے۔ مریم نے اونچی آواز میں کہا۔ ”بابا، تم جی کیوں نہیں جلاتی؟ دروازہ کھولو۔ دیکھو میرا ایک بھائی واپس آ گیا ہے۔“

مکان کی تاریکی سے ایک بوڑھی اور جذبات سے لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میرا بیٹا..... میرا بیٹا شاید ام سے واپس آ گیا ہے۔ مجھے جانے.....“

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی آواز اندھیرے میں گھٹ گئی۔ یوں لگا جیسے بوڑھے کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی دبی دبی سی سرگوشیاں سنائی دیں۔

بابر جیسا مجرم ایک دم سے محتاط ہو گیا۔ اس نے مریم کے کان کے پاس منہ لے باکر بڑی آہستگی سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے بابا کے علاوہ اور بھی کوئی اس مکان میں رہتا ہے؟“  
مریم نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی وقت اندر سے بوڑھے کی آواز آئی۔ ”بیٹی اپنے بھائی سے کوا بھی اندر نہ آئے۔ اندر اندھیرا ہے اور..... اور خطرہ.....“

پھر اس کی آواز گھٹ گئی۔ آواز بالکل دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ بابر نے سمجھ لیا کہ بوڑھے کی آواز کو دبانے والا بھی دروازے کے قریب ہی ہے۔ اس نے مریم کو

اشادے سے کہا کہ وہ برآمدے کے آخری سرے پر چلی جائے۔ وہ دوڑتی ہوئی چلا کر اسی وقت باہر نے دروازے پر ایک زور کی لات ماری۔ دروازہ یکبارگی کھلا اور اس نے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کی زد میں آ کر دوڑ تک لڑکھڑاتے چلے گئے۔ باہر نے اندر کر دروازے کو بند کر دیا۔

اندر گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ باہر کمرے کے حدود اور پھر واقف نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ آگے بڑھے نہ جانے کس سے ٹکرا گیا، دوست سے یا دشمن سے.....؟ لیکن وہ جو اندھیرے میں تھے وہ کسی قدر تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئے تھے لہذا باہر اندھے پن میں مار کھا گیا اچانک ہی کسی کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا تھا۔ اسے اندھیرے میں تاریے نظر آ گئے۔ اس حماقت کا احساس ہوتا ہے کہ اسے دروازے پر جم کر نہیں رہنا چاہئے وہ فوراً ہی ہٹ گیا لیکن دوسری جگہ پہنچتے ہی دوسرا گھونسا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراسے ہوئے زرا جھک گیا۔ جھکتے ہی تیسرا گھونسا اس کے منہ پر آیا لیکن اس بار اس نے مارنے والا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے لپٹتے ہوئے بولا۔

”تم میرے اس کمرے میں ہو، اس لئے اندھیرے میں ویسے لپٹے ہو لیکن اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ہم اسی طرح لپٹ کر ایک دوسرے کی خیریت پوچھ لیں گے۔“ دوسرا بھی اس سے لپٹ کر اسے ہالے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری آواز تو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے، کون ہو تم؟“

”ہوں۔“ باہر نے غراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مجھے نہیں پہچانا لیکن میں نے تمہاری آواز سے پہچان لیا کہ تم شوکت ہو۔“

”اچھا، تو تم باہر ہو۔“

وہ ایک دم سے بھر کر اسے پوری قوت سے رگیدنے لگا۔ باہر تھوڑی دیر تک سنبھل نہ سکا۔ اس درندے کے ہماؤ میں آ کر پیچھے ہی پیچھے لڑکھڑاتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ تب اسے سنبھلنے کا موقع ملا۔ اتنی دیر میں اب وہ بھی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سر سے شوکت کے سر پر ایک زوردار ٹکرماری۔ شوکت کا دماغ جھنجھٹا کر رہ گیا۔ اس کے سنبھلنے سے چلے ہی سر کی دوسری ٹکرا اس کی ناک پر لگی۔

وہ ایسی زبردست فکر تھی کہ شوکت بلبل کر رہ گیا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہنے لگی۔ تب بابر نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ پے در پے کتنے ہی گھونٹے ناک، منہ اور ٹھوڑی پر پڑتے رہے۔ شوکت پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا، چکرا کر کسی چیز سے ٹکرایا اور اسے ساتھ لئے زمین پر گر پڑا۔ تب بابر نے کہا۔

”مریم آ جاؤ۔ اپنے بابا سے کہو کہ جی جلائے۔“

مریم دوڑتی ہوئی دروازے پر آگئی۔ پھر اندھیرے میں ماچس کی قیلی روشن ہوئی۔ بوڑھے بابا نے ایک لیپ کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بد معاش نے مجھے گھر میں روشنی کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پتہ چلتا ہے کہ جیل نے بھاگا ہوا قیدی ہے۔“

بوڑھے نے یہ کہہ کر لیپ کی روشنی میں بابر کو دیکھا پھر ذرا سسم کر بولا۔

”مم..... مگر تمہارے کپڑے بھی ویسے ہی ہیں۔ کیا تم بھی جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟“ بابر نے سر ہلا کر کہا۔

”جی ہاں۔ بد قسمتی سے میں بھی ایک مجرم ہوں اور جیل کی سلاخیں توڑ کر یہاں تک پہنچا ہوں لیکن آپ مجھ سے خوفزدہ نہ ہوں۔ سریم نے مجھے بھائی بتایا ہے۔ کیا آپ مجھے بیٹا سمجھ کر ایک رات کے لئے پناہ دے سکیں گے؟“

بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ ”تم تو بڑی شرافت سے پناہ مانگ رہے ہو لیکن یہ بد معاش جس نے اپنا نام شوکت بتایا ہے، یہ جبراً یہاں پناہ بھی لینا چاہتا تھا اور وہ زیور رات بھی جو میں مریم کی شادی کے لئے ابھی سے جمع کر رہا ہوں، چھین کر لے جانا چاہ رہا تھا۔“

بابر نے پلٹ کر شوکت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے فرش پر سے اٹھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک کرسی کا سارا لے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”بابر، میں غلطی پر تھا۔ مجھے تم سے اس لئے نہیں لڑنا چاہئے تھا کہ ہم دونوں مجرم ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد سے قانون کو دھوکہ دے سکتے ہیں اور اس ملک سے باہر جاسکتے ہیں اور اس کے لئے آج رات ہی پناہ کی ضرورت ہے اور آئندہ پیسوں کی ضرورت ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک میز کی طرف گیا۔ میز پر کپڑے کی منضی سی گٹھڑی رکھی تھی۔ اس گٹھڑی کو اس نے اٹھا کر بابر کو دکھاتے

ہوئے کہا۔ ”دیکھو! مریم کے سارے زیورات میں نے باندھ لئے ہیں۔ ان کی مالیت کم کم پانچ ہزار روپے ہے۔ سرحد تک پہنچنے کے لئے یہ روپیہ کافی ہے۔ ہم آج رات دوستوں کی طرح یہاں رہیں گے اور صبح یہ زیورات لے کر چلے جائیں گے۔“

بابر نے گٹھڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لاؤ! یہ گٹھڑی مجھے دے دو۔“ شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جب ہم دوست بن گئے ہیں تو یہ زیورات کم کے پاس رہیں، کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ لے لے اسے تو بھی رکھ لے۔“

یہ کہہ کر اس نے گٹھڑی بابر کی طرف اچھال دی۔ بابر نے اسے ہاتھوں میں روک لیا۔

”ہم چور، بد معاش اور قاتل ہیں لیکن کیا تجھے نہیں معلوم کہ چور اپنے گھر میں کچھ چوری نہیں کرتا اور یہ میرا گھر ہے؟ اس لئے کہ ایک معصوم بچی مجھے بھائی بنا کر یہاں لایا ہے۔ اگر تو دوستی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو تو بھی اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر ان زیورات کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔“

اس کی بات سنتے ہی شوکت کے تیور بگڑ گئے۔ اس نے فصے سے کہا۔ ”کیا تیرا دل خراب ہو گیا ہے۔ جہاں پہنچتا ہے، عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی ہنس بنا کر میرا نقصان کرتا ہے۔ میں یہ نقصان برداشت نہیں کروں گا۔ ابھی میں دھوکے میں مار کھا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تجھ سے کمزور ہوں۔ اگر تو بھلائی چاہتا ہے تو وہ گٹھڑی مجھے واپس کر دے۔“

بابر نے کہا۔ ”یہ زیورات ایک بہن کے ساگ کی آبرو ہیں۔ میں اپنی بہن ماریہ کی شادی میں اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ پھر دوسری بہن کے زیورات چھین کر تجھے کبے دے دوں؟“

اس کی بات ختم ہوتے ہی شوکت نے یکبارگی اچھل کر اس کے سینے پر لات مار دی۔ بابر کو اس حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنے پیچھے ایک کرسی پر است پڑا۔ شوکت بھاگتا ہو مریم کی طرف پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس بچی کو اٹھایا اور اس کی چھوٹی سی گراں میں اپنے دوسرے بازو کا پسندا ڈال کر کہا۔ ”بابر! تو جہاں ہے وہیں رک جا۔ اگر تو مجھ کا حملہ کرے گا تو اس سے پہلے ہی میں تیری اس منہ بولی بہن کو اتنی سختی سے دباؤں کا

اس کا دم نکل جائے گا۔“  
 باہر ٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ بوڑھے نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، میری بچی کو نہ مارو۔ میرے بڑھاپے کی یہی ایک معصوم ساتھی ہے۔ اس کے بدلے تم زیورات لے لو اور جو کچھ یہاں سے سمیٹ کر لے جانا چاہتے ہو، لے جاؤ۔“

باہر مریم کی جانب بے بسی سے دیکھتا رہا۔ شوکت نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”جہاں جاتا ہے کسی نہ کسی کو بسن بنا کر میرا کباڑا کرتا ہے۔ دیکھ! تیرے ہاتھ میں زیورات ہیں اور میرے قبضے میں تیری بسن۔ زیورات اپنے قبضے میں رکھے گا تو بسن کی ڈولی کبھی نہ اٹھے گی، تجھے اس کا جنازہ ہی اٹھانا پڑے گا۔ فیصلہ کر لے، بسن عزیز ہے یا زیورات۔“

مریم کی گردن اس کے بازو کے حلقے میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ دیدے پھیلانے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باہر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”توجیت گیا، میں بار گیا۔ یہ زیورات لے اور مریم کو چھوڑ دے لیکن کیا ضمانت ہے کہ زیورات لینے کے بعد تو مریم کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟“

شوکت نے کہا۔ ”میں بھلا کیا ضمانت دے سکتا ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ گئے اس بچی کی جان لے کر کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ البتہ یہ زیورات مجھے سرحد پار پہنچا دیں گے۔ میں دروازے کے باہر جاتا ہوں تو دو گٹھڑی میری طرف پھینک دے۔ گٹھڑی ملتے ہی میں مریم کو کمرے میں چھوڑ کر دروازے کو باہر سے بند کر کے چلا جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کے باہر چلا گیا۔ دو دشمنوں کے درمیان تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ قائم ہو گیا۔ باہر نے زیورات کی گٹھڑی اس کی طرف اس انداز میں اچھالی کہ وہ اس کے سر پر سے ہوتی ہوئی اس کے پیچھے جا گری۔ شوکت ذرا ویر کے لئے بہک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر سے گزرنے والی گٹھڑی کو دیکھا اور ایک ہاتھ اٹھا کر اسے لپکنے کی کوشش کی پھر اسی دھن میں گٹھڑی کی طرف پلٹ گیا۔ باہر کے لئے اتنا موقع کافی تھا۔ جب شوکت گٹھڑی اٹھانے کے لئے زمین پر جھکا تو اس کے سر پر قیاحت ٹوٹ پڑی۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ ڈنڈا جس نے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مریم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گری۔ باہر نے اسے اتنا موقع نہیں دیا۔ ٹوٹے ہوئے ڈنڈے سے ہی اس کی مرحمت کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے

بے ہوش ہو کر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ پھر وہ اسے کھینچتا ہوا اندر کمرے میں لے کر  
بوڑھے بابا سے ایک مضبوط رسی طلب کی اور بڑی مضبوطی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ  
کر اسے فرش پر چھوڑ دیا۔

مریم باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ کر بولی۔ ”تم کتنے بہادر ہو! تم  
بھائی بھی بڑا بہادر ہے۔ اب تم میرے پاس ہی رہنا۔ جب میں بتایا ہے تو چھوڑ کر  
جاتا۔“

بابر نے اسے میز پر بٹھا دیا اور کرسی پکڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھ پر اپنی ایک بہن  
محبت کا قرض ہے۔ اس قرض کی ادائیگی کے لئے میں تیریہ کے پاس جاؤں گا۔ مجھے افسوس  
ہے کہ میں یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔“

مریم نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئی تھی  
ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک بہن ہے۔ اس کا نام تیریہ ہے۔ کیا تم مجھے تیریہ کے پاس  
لے چلو گے؟“

”وہ بہت دور رہتی ہے۔ دور نہ بھی ہو تب بھی میری پہنچ سے دور ہے کیونکہ اس  
کی زندگی کا محاذ ایک پولیس انسپکٹر ہے اور میں ایک مجرم بھائی ہوں۔ پتہ نہیں اپنی  
تک کیسے پہنچوں گا۔ جب میں راستہ نہیں جانتا تو تمہیں کس طرح دہاں تک لے جا سکتا  
ہوں۔“

اتنے میں بوڑھے نے ردی اور سالن کی پلیٹیں میز پر رکھے ہوئے کہا۔ ”بیٹا!  
اسی طرح تمہارا سر کھاتی رہے گی۔ تمہارے کھانے کی اسے فکر نہیں ہے۔ دیے  
معصوم کیا جانے کہ جیل سے بھاگنے والے کس طرح بھوکے پیاسے بھاگتے ہیں۔“

بابر واقعی بھوکا تھا۔ بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے دوران  
بوڑھے نے کہا۔ ”تم نے مجھ بوڑھے پر جو احسان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم  
شریف آدمی ہو لیکن میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم مجرم کیسے بنے کیونکہ بعض  
حالات ایک شریف آدمی کو جرائم کی پستی میں پھینک دیتے ہیں۔ دیے تم نے یہ بہن  
کیا۔ قانون کے خلاف تمہیں جیل سے فرار نہیں ہونا چاہئے تھا۔“

بابر نے جواب دیا۔ ”میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا۔ آپ بتائیے کیا میں اسی لئے



ہوا ہوں کہ ساری زندگی ایک پنجرے میں بند رہ کر گزار دوں۔ تاکہ مجھ سے ایک قتل ہوا ہے لیکن سزا دینے والوں کا فرض تھا کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ان سالات کو پیش نظر رکھتے، جنہوں نے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ انہوں نے یہ سوچنے سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ میں اصلاح کے قابل تھا۔ انہوں نے میرے ہتے کھیلنے مستقبل کو جیل کی کونٹری میں بند کر دیا۔ میں یہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جیل کی تھمائی میں ہر لمحہ اپنی ہمن کی یاد مجھے تڑپاتی رہی۔ میں سوچتا رہا کہ ہمن اس جیل کے باہر ہے، مجھ سے زیادہ دور نہیں لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا، اس کی آواز نہیں سن سکتا۔ محبت کی یہ محرمیاں مجھے نارے ڈالتی تھیں۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ چھٹک گیا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں جیل کی سلاخیں توڑ کر باہر آ گیا۔ لوگ دولت کی ہوس میں یا کسی عورت کے عشق میں قاذن سے نکلتے ہیں لیکن مجھے تو ایک ہمن کی پاکیزہ محبت یہاں تک لے آئی ہے۔ بابا! تم صرف میرے جرم کو دیکھتے ہو، میرے پیار کی پاکیزگی کو بھی تو دیکھو۔“

بوڑھے نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ہاں بیٹا! ہم محبت کی نظر سے دیکھیں تو قاذن بہت ہی ظالم نظر آتا ہے۔ بعض اوقات ہم قانون کا احترام کرنے کے باوجود محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی دیکھو تاکہ میرا فرض تو یہ تھا کہ میں اس علاقے کے تھانے سے مدد لیتا اور تمہیں قانون کے حوالے کر دیتا لیکن اس معصوم مریم کے وجود میں ہم دونوں کی محبت مشترک تھی۔ تم نے محبت سے مریم کی جان بچائی، اس کے زیورات بچائے، کیا میں تمہیں قانون کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتا؟ ایسے ہی مقام پر پہنچ کر محبت افضل ہو جاتی ہے اور قانون کانٹے کی طرح چھینے لگتا ہے۔ بہر حال اب تم یہ بتاؤ کہ کہاں جاؤ گے؟“

بابر نے جواب دیا۔ ”میں جنگلوں میں بھٹکتا ہوا اس بستی کی طرف آ گیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں سے ہمن آباو کتنی دور ہے۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”ہمن آباو تو یہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے کیا ساری ہمن ای شہر میں رہتی ہے؟“

”ہاں۔ اسی شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔ مجھے وہاں جا کر معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کس محلے میں رہتی ہے۔ میں دن کے اجالے میں نہیں جا سکتا، رات کی تاریکی ہی سر زکار رہے گی۔ سوچتا ہوں جب پندرہ میل کا فاصلہ ہے تو ابھی کیوں نہ چلا جاؤں۔ کیا آپ مجھے پہننے۔“

لئے کوئی معقول سالیباں دے سکتے ہیں؟“  
 ”ہاں“ ضرور دے سکتا ہوں لیکن تم بہت زیادہ جھکے ہوئے ہو۔ میرا مشورہ ہے  
 آج رات یہاں آرام کر لو۔ کل تمام دن میں تمہیں چھپا کر رکھوں گا۔ رات ہوئے  
 حسن آباد چلے جانا۔“

بابر نے کہا۔ ”نہیں بابا! منزل کے قریب پہنچ کر صبر نہیں ہوتا۔ میری ماریہ بھر  
 صرف پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔ میرا جانا ہی بہتر ہے۔“  
 بوڑھا ایک صندوق کے پاس گیا اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”یہاں آکر دیکھو  
 اس صندوق میں میرے جوان بیٹے کے کپڑے ہیں جو تمہیں پسند ہوں، پہن لو۔“  
 بابر نے صندوق کے پاس آکر ایک لباس نکالا اور اسے پہننے کے لئے دوسرے  
 کمرے میں چلا گیا۔ بوڑھے نے پوچھا۔ ”یہ بد معاش ابھی تم سے سرحد پار کرنے کی بات  
 کر رہا تھا، کیا تم بھی اس ملک سے باہر چلے جاؤ گے؟“

بابر نے دوسرے کمرے سے جواب دیا۔ ”ہاں۔ آزادی کی سانس لینے کے لئے  
 یہاں سے جانا ہی ہو گا۔ میں بہن کے ساتھ اس لئے نہیں رہ سکتا کہ میری بد قسمتی سے  
 بہن کی خوش قسمتی سے اس کا خادمہ ایک پولیس انسپکٹر ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جو  
 قانون کے سائے میں اپنی بہن سے محبت کیسے کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر دل دکھتا ہے کہ وہ  
 نہیں بہن کو جی بھر کر دیکھ بھی سکوں گیا نہیں۔“

وہ لباس پہن کر دوسرے کمرے سے نکل آیا۔ شوکت اب تک بے ہوشی کی حالت  
 میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد رہبر  
 کی بندش سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ بابر نے کہا۔ ”بابا! تم اور مریم میرے ساتھ چلا  
 مکان کو باہر سے مقفل کر دو۔ میں حسن آباد کی طرف چلا جاؤں گا۔ تم تھانے میں بار بار  
 بیان دینا کہ دو مفرد قیدی یکے بعد دیگرے تمہارے مکان میں داخل ہوئے تھے۔  
 بیٹی کے زیورات کے لئے آپس میں جھگڑا کر رہے تھے۔ جھگڑے کے نتیجے میں ایک  
 نے دوسرے کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ پھر اسے رسی سے باندھ کر میرے مکان  
 ایک کمرے میں چھوڑ گیا اور میری بیٹی کے زیورات لے کر بھاگ گیا۔“

بوڑھے نے چونک کر کہا۔ ”یہ کیا کہتے ہو بیٹا! کیا میں تم پر چوری کا جھوٹا الزام لگاؤں۔“

بابر نے کہا۔ ”مجھ پر جھوٹا الزام لگانا ہی ہوگا۔ اگر تم نے میری ہمدردی اور محبت میں میری حمایت کرتے ہوئے پولیس کو بیان دیا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ چونکہ تم اور مریم مجھ سے متاثر ہو اس لئے تم نے مجھے فرار ہونے کا موقع دیا ہے اور صرف ایک ہی مفرد فردی کو تانوں کے حوالے کر رہے ہو۔“

بوڑھے نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے! تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ مریم کی زندگی اور اس کے زیورات کی حفاظت کی ہے۔ یہ زیورات یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ پھر میں کس زبان سے تمہیں چور کہوں۔“

”مجبوری سب کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شوکت گرفتار ہونے کے بعد بیان دے گا کہ زیورات کے لئے ہمارا جھگڑا ہوا تھا اور تم بیان دو گے کہ میں تم سے زیورات چھین کر نہیں لے گیا تو پھر بات بگڑ جائے گی۔ پولیس والے تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تفتیش کے دوران وہ تمہیں حراست میں رکھیں۔ ایسی صورت میں ننھی مریم میلنا تنہا رہ جائے گی۔ کیا تم اپنی معصوم بچی کو بے یار و مددگار چھوڑ سکتے ہو؟ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ فی الحال مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔ میں تو پہلے ہی بے شمار الزامات کا نشانہ بنا ہوا ہوں اور ایک سادی مجرم کہلاتا ہوں۔ اگر الزامات کے سمندر میں تم جھوٹ کا ایک چھوٹا سا کنکر پھینک دو گے تو کوئی اپنیل نہیں بچے گی۔ ہاں یہ جھوٹ بول کر بھی تم مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہو۔“

”وہ کیا؟“ بوڑھے نے جلدی سے پوچھا۔

بابر نے کہا۔ ”تم اپنے بیان میں یہ نہ لکھوانا کہ باہر حسن آباد کی طرف گیا ہے۔ مجھے پولیس کے تعاقب سے بچانا چاہتے ہو تو انہیں کسی دوسری سمت لگا دینا۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے مریم کو ساتھ لے کر باہر آ گئے۔ بوڑھے نے مکان کے تمام دروازوں کو مقفل کرنے کے بعد اپنی جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر باہر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اسے رکھ لو۔ میرے پاس اتنے ہی نقد روپے ہیں۔ شاید یہ تمہارے کام آجائیں۔“

”نہیں بابا! صرف پندرہ میل کا سفر ہے۔ میں پیسوں کے بغیر بھی وہاں تک پہنچ سکتا

ہوں۔

وہ انکار کرتا رہا۔ بوڑھا بابا اصرار کرتا رہا کہ وہ باپ بن کر اسے روپیے دے دیں۔ اسے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بے حد اصرار پر باپ نے اس رقم کو لیتے ہوئے کہ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ باپ محبت سے دے تو بیٹے کو انکار نہیں کرنا چاہئے اور بھائی محبت سے دے تو بہن کو بھی انکار نہیں کرنا چاہئے۔“

یہ کہہ کر اس نے مریم کو پکڑا، اس کی ہتھیلی کھولی اور اس پر ایک ہزار روپیہ دیئے۔ مریم نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہل۔ ”بھائی میں ان پیسوں کی ایک ہزار خوبصورت بولنے والی گڑیا خریدوں گی۔“

باپ نے مریم کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چوم لیا۔ پھر اسے فضا میں اسی طرح رکھتے ہوئے بولا۔ ”تو صیرنی بولنے والی گڑیا ہے۔ یہ معصوم رشتے معاف ستھری محبت پاکیزہ جذبے جیل کی چار دیواری میں نہیں مل سکتے تھے۔ میں ایک آزاد پنجابی ہوں آزادی سے اڑتا ہوا اپنی ماریہ تک پہنچ جاؤں گا۔“

بوڑھے نے کہل۔ ”خدا تمہیں ضرور منزل تک پہنچائے گا۔“

”بابا! عزم سفر ہو تو منزل مل جاتی ہے۔ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ جب تم خانہ کعبہ کی طرف جاؤ، یا مسجد کی طرف جاؤ یا کسی بھی مقدس مقام تک پہنچنے کا عزم کرو تو رات میں نیکیاں کرتے جاؤ۔ میں بھی بہن کے مقدس دیار کی طرف جا رہا ہوں۔ میں بھی نکلا کرتا جا رہا ہوں اور دریا میں ڈالتا جا رہا ہوں۔ آج رات میں ضرور اپنی بہن تک پہنچ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر مریم کو چونا پھر اسے بابا کی گود میں دے کر چہرہ آباد کے راستے پر جانے لگا۔

بوڑھا بابا اسے سمجھا رہا تھا۔ باپ کو دور تک اس کی آواز بتا رہی تھی کہ اے چہرہ آباد پہنچنے کے لئے کن راستوں سے گزرنا چاہئے پھر بابا اور مریم دور رہ گئے اور دو آدھ بڑھتا چلا گیا۔ اب اس کے جسم پر جیل کے کپڑے نہیں تھے۔ ایک سادہ سا لباس تھا۔ ان کے باوجود وہ چہرے سے خطرناک نظر آتا تھا کیونکہ جیل کی پتھر ملی زندگی نے اس کے چہرہ کو بھی سخت اور کھردرا بنا دیا تھا۔ اس پر بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخی مائل بڑی آنکھیں رات کے وقت بڑی بھیانک لگتی تھیں۔

وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔ کبھی وہ تیز رفتاری سے چلتا تھا کبھی ایک ہرکارے کی طرح سست رومی سے دوڑتا جاتا تھا۔ ہر قدم پر اس کی بہن قریب آتی جا رہی تھی۔ رات کے گیارہ بجے اسے شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو وہاں رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حسن آباد اتنا بڑا شہر تھا کہ سمندر کی طرح اس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک اجنبی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنے بڑے شہر میں اپنی بہن کی رہائش گاہ ڈھونڈ نکالتا لیکن جس طرح پولیس تھانوں میں شہر کے تمام چوروں اور بد معاشوں کے پتے لکھتے ہوتے ہیں، اسی طرح ہر چور بد معاش کے دماغ کی چھوٹی سی ڈائری میں پولیس دالوں کے رہنے سنے اور اٹھنے پھٹنے کے اوقات، مقالت اور مصروفیات کی معلومات درج ہوتی ہیں۔ وہ کسی بد معاش سے انسپکٹر مراد علی کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔

باہر نے وہاں پہنچ کر سب سے پہلے شراب اور جوئے خانے کا پتہ چلایا پھر وہاں کے ایک بد معاش سے انسپکٹر مراد علی کا پتہ دریافت کیا۔ اس بد معاش نے پتہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”میرے پردوں میں ایک شخص محسن علی رہتا ہے۔ انسپکٹر مراد علی اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔“ باہر نے کہا۔ ”محسن علی تو میرے چچا ہیں۔ تم میرانی کر کے مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔“

وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے بد معاش نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یار چلے تو ہماری برادری کے معلوم ہوتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ پولیس دالوں کے رشتے دار ہو۔“

نقدیر ایسے ہی کھیل کھیلتی ہے۔ کبھی کبھی چور اور سپاہی کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیتی ہے۔“

اس بد معاش نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنے مکان کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہیں راستے میں محسن علی کے گھر کا پتہ بتا دوں گا۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اڑے سے باہر نکل آئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد باہر اپنے چچا محسن علی کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے مکان تک پہنچانے والا آگے بڑھ گیا تھا۔ باہر نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز پر اس کے چچا ہی نے دروازہ کھولا پھر اسے

دیکھتے ہی چونک کر بولے۔ ”تم..... تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہاری چچی نے جب سنا ہے کہ تم جیل سے فرار ہوئے ہو، تب سے وہ یہی کہہ رہی ہیں کہ تم بھاگ کر باہر آؤ گے اور ہمارے لئے مصیبت بن جاؤ گے۔“

بابر نے کہہ۔ ”انکل! پہلے مجھے اندر تو آنے دیجئے۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ کہ لوگوں کے لئے مصیبت نہیں بنوں گا۔“

اس کے چچا نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کی اجازت دی پھر دروازہ بند کرتے ہوئے کہہ۔ ”اگر مراد یہاں آگیا اور اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ہم اسے دیکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”اس بات کو میں اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ آپ یقین کریں، اگر وہ آجھی ہمارے میں آپ لوگوں سے اپنا رشتہ ظاہر نہیں کروں گا۔ میں صرف ماریہ کو ایک نظر دیکھنے آ رہا ہوں۔ میں نے ایک جگہ سے مراد کا پتہ حاصل کیا ہے۔ آپ بتائیں کیا یہ پتہ درست ہے؟“

اس نے پتہ بتایا۔ اس کے چچا نے کہہ۔ ”پتہ درست ہے مگر تمہیں وہاں نہیں جانا چاہئے۔ کیا وہاں بھاؤ گے تو مراد سے سامنا نہیں ہو گا؟“

”میں چھپ کر بھاؤں گا۔ وہاں میری ماریہ ہوگی۔ میں اسے دور سے دیکھوں گا۔ اگر وہ تنہا ہوگی تو اس سے دو باتیں کروں گا۔ اس سے بیشک کے لئے دور جانے سے پہلے کہ میں دو باتیں کرنے کا بھی حقدار نہیں ہوں؟“

اس کے چچا نے کہہ۔ ”یہ دانش مندی نہیں ہے۔ تم جیل سے فرار ہو کر ایک پولیس انسپکٹر کے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہو۔ اگر اس سے سامنا ہو گیا تو دو تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ کیا تم بھی اپنی بہن کے سہاگ کو نقصان پہنچا سکو گے؟“

”میں تمام راستے نیکیاں کرتا آیا ہوں۔ منزل پر پہنچ کر کسی کی برائی یا نقصان کے چاہوں گا۔ میں صرف اپنی بہن کے پتے کی تصدیق کرنے کے لئے آیا تھا۔ آپ اطمینان رکھیں، اگر مراد سے سامنا ہو گیا تو میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دوں گا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ میری گرفتاری سے مراد کو ترقی ملے گی اور مراد کی ترقی سے میری بہن کو خوش حالی نصیب ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے

☆-----☆-----☆

ماریہ ایک دم سے بیمار ہو کر بستری ہو گئی تھی۔ جب سے اس نے وہ فلم دیکھی تھی، تب سے اس کا یہی حال تھا۔ وہ کٹا ہوا ہاتھ کئی بار اس کی چشم تصور میں آچکا تھا۔ مراد اسے تفریح کے لئے لے گیا تھا لیکن وہ تفریح اسے منگی پڑ گئی تھی۔ وہ سینما ہال ہی میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ پہلے اسے منجر کے کمرے میں لے جا کر ہوش میں لایا گیا۔ گھر آنے کے بعد ایک ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا، دوائیں دیں، اسے حوصلہ دیا کہ اسے آن دیکھی چیزوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ ماریہ نے خود ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ ایک ہاتھ اکثر اس کے خوابوں اور خیالوں میں آکر اسے دہشت زدہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا۔ ”وہ محض ایک خیالی ہاتھ ہے۔ وہ تمہارے پاس کیسے آئے گا؟ حقیقتاً اس ہاتھ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پھر اس سے ڈرنا کیسا؟ پھر یہ کہ تم ایک پولیس انسپکٹر کی بیوی ہو۔ اگر کوئی تمہارا دشمن ہوا بھی تو وہ ایک پولیس انسپکٹر کے گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

ماریہ نے نقاہت سے کہا۔ ”میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چلا۔ پھر کوئی بلا وجہ اپنا ہاتھ میری گردن تک کیوں لائے گا۔ یہ بات میں اچھی طرح سمجھتی ہوں اور اپنے دل کو اچھی طرح سمجھاتی ہوں، اس کے باوجود دہشت زدہ رہتی ہوں۔“

ڈاکٹر نے اپنا بیگ سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں صرف وہم کی بیماری ہے۔ مراد صاحب! آپ انہیں تھانا چھوڑیں۔ خصوصاً رات کے وقت ان کے پاس کسی کو موجود رہنا چاہئے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔ پھر دو مری رات کو بھی اس نے آکر ماریہ کو دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ زرد پڑ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے بدن سے خون نچوڑ لیا گیا تھا۔ اس کے اندر جو ایک آن دیکھا ہاتھ تھا، وہی اس کا لہو نچوڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر مایوس ہو کر چلا گیا اور مراد سے کہہ گیا کہ ماریہ کے دماغ میں بچپن ہی سے خوف سلایا ہوا ہے۔ اس خوف کی جڑیں بہت گہرائی تک مضبوط ہو چکی ہیں۔ اس کے دماغ سے دہشت کو نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔

ڈاکٹر دوست کہہ گیا تھا۔ واقعی وہ ناقابل علاج ہو گئی تھی۔ اب تو ہلکی سی آہٹ سن

کر چونک جاتی تھی۔ اگر دروازہ زور سے بند ہوتا تو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگتا۔  
مراد نے گھر کی ملازمہ کو تاکید کی تھی کہ وہ آہستگی سے دروازہ کھولے اور بند کرے۔  
بیگم صاحبہ سو رہی ہوں تو چپ چاپ کمرے کی صفائی کر کے چلی جایا کرے۔

ملازمہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا مگر چپ چاپ کمرے میں آنا بھی منگنا پڑا۔  
ایک بار ماریہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ  
مار کر اٹھ بیٹھی تھی۔ بعد میں اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کمرے میں ملازمہ ہے۔

اس رات بھی مراد ہمیشہ کی طرح ماریہ کے ساتھ خواب گاہ میں آرام کر رہا تھا۔  
اسے مختلف لطیفے سنا کر اس کا دل ہل رہا تھا۔ ٹھیک آدھی رات کو ایک سپاہی نے آکر  
دروازے پر دستک دی۔ مراد نے ماریہ سے کہا۔ ”میں باہر کا دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔  
میرے آنے تک ملازمہ تمہارے پاس رہے گی۔“

ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بستر پر پڑی رہی۔ مراد نے ملازمہ کو باہر  
کمرے میں رہنے کے لئے کہا پھر باہر کا دروازہ کھولنے کے لئے وہاں سے چلا گیا۔  
ماریہ گم صم پڑی جوئی تھی۔ پچھلی رات سے اس کی یہی حالت تھی۔ وہ سوچتی رہا کہ  
تھی اور بولتی کم تھی۔ وہ مراد کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ اس کا دل کس قدر کمزور ہو  
ہے اور وہ کس طرح اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔

مراد نے کمرے میں آکر ماریہ سے کہا۔ ”اس وقت میرا اتھانے پہنچنا بہت ضروری  
ہے۔ یہاں سے چند میل دور جیل سے فرار ہونے والا ایک مجرم شوکت پکڑا گیا ہے۔“  
اور باہر دونوں ایک ساتھ فرار ہوئے تھے۔ اب ہم شوکت سے یہ معلوم کر لیں گے کہ یہ  
کس علاقے کی طرف گیا ہے۔“

ماریہ اپنے بھائی کا نام سن کر اٹھ بیٹھی۔ مراد نے سمجھا کہ وہ گھبرا رہی ہے۔ اس نے  
تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ تم یہاں تنہا نہیں رہو گی۔ میں سپاہی کو بل  
چھوڑے جا رہا ہوں۔ تمہارے پاس ملازمہ رہے گی اور باہر سپاہی پہرہ دیتا رہے گا۔ تم  
گی تو نہیں؟“

ماریہ نے غمی میں سر ہلایا۔ مراد مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس وقت رات کا ایک ٹکڑا  
تھا چونکہ ملازمہ ٹیند سے اٹھ کر ماریہ کے کمرے تک آئی تھی اس لئے اس کی آنکھ



میں نیند کا شمار تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک جبراً جاگتی رہی پھر آہستہ آہستہ ادبھگنے لگی۔ ماریہ تھوڑی دیر تک اسے ہلاتی رہی تاکہ وہ کسی طرح جاگتی رہے لیکن وہ سو گئی اور کیوں نہ سوتی؟ اسے کسی کا خوف تو نہیں تھا کہ ڈر کے مارے جاگے میں ماریہ کا ساتھ دیتی۔

ماریہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ بیچاری بوڑھی عورت نام دن گھر کا کام منہالتی ہے۔ اس وقت اسے سونے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ بھر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دور فرش پر ملازمہ سو رہی تھی۔ بچھلی شب کی ہواؤں سے کھڑکیوں کے پردے لہرا رہے تھے۔ ان کی ہر لہر سے اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑکی کے راستے کوئی پردے کو ہٹا کر آ رہا ہو۔

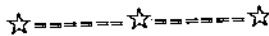
اور وہ آ رہا تھا۔ ایک کمرے سے گزرتے ہوئے اس نے قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو ٹھک کر رد گیا۔ اسے اپنا چہرہ بڑا ہی ڈراؤنا لگ رہا تھا سالانکہ وہ بد صورت نہیں تھا مگر سالانے نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس نے سوچا۔ ”بہن سے نکھڑے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ وہ مجھے نہیں پہچانے گی۔ رات کے وقت میرا یہ چہرہ دیکھ کر ڈر جائے گی اور اگر اس نے ڈر کر چیخ ماری تو گھر کے دوسرے لوگ اٹھ کر آجائیں گے۔ انسپکٹر مراد علی کو تو میں نے اس گھر سے جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ اس کی طرف سے تو اطمینان ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟ جتنے بھی ہوں اگر انہوں نے شور مچایا تو مجھ پر مصیبت آجائے گی لہذا مجھے اچانک ہی ماریہ کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ پھر قریب پہنچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ تب اسے سرگوشی میں بتاؤں گا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ اس کے بعد بہن اپنے منہ پر محبت کا ہاتھ دیکھ کر اسے چوم لے گی۔“

دوسری طرف ماریہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کھڑکی یا دروازے پر کھٹکا سا محسوس ہوا تھا۔ دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئی تھیں۔ خوف سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے قدم بڑھاتی ہوئی دروازے کی طرف جا رہی تھی تاکہ سپاہی کو آواز دے کر اندر بلائے۔ اپنی خواب گاہ سے باہر نکل کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچی۔ اس کمرے کے بعد ایک بڑا کمرہ تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑے ہوئے سپاہی کو اندر بلانا چاہتی تھی۔ اسی کمرے میں پیچھے سے بھائی آ رہا تھا۔

اس نے اپنی بہن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ”زنگار راستے میں عجیب موڑ آتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہاتھ محبت کے لئے دشمن کی طرف بڑھتا ہے کیونکہ پیچھے سے آنے والا ہاتھ ہمیشہ دشمن کا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ بھی پیچھے بڑھ رہا ہے مگر یہ ایک بھائی کا ہاتھ ہے۔“

ماریہ ایک دم سے ٹھنک گئی۔ پہلے اسے اپنی گردن کے پیچھے بالوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی جیسے کوئی زہریلا سانپ رینگتا ہوا آ رہا ہو۔ اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا وہ ہاتھ اس کے بائیں کان کے پاس سے گزرتا ہوا ٹھوڑی کے نیچے آکر ہتھیلی کا پالہ بن گیا۔ چھ برس کی ماریہ کے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ اس دھماکے کی زد میں سولہ برس کی ماریہ آگئی۔ بچپن سے جوانی تک خوف کا سفر مکمل ہو گیا۔ وہ چیخ بھی نہ سکی، بے آواز ہو گئی۔

ایک سرگوشی نے کہا۔ ”میری بہنا! میں تیرا بھائی باہر ہوں، شور نہ مچانا۔“ اس نے شور نہیں مچایا۔ محبت کے ہاتھ نے بار بار پیار سے دستک دی لیکن وہ بجز بولی۔



## خوگرفتہ

انسان کی اچھی بری عادات بدلی جاسکتی ہیں لیکن کوئی عادت اگر فطرت بن جائے تو اسے بدلنا ناممکن ہے۔  
ایک سیدھی سادی لڑکی کا دلچسپ قصہ، اسے نت نئے زیورات پہننے کی عادت تھی اور اس کے لئے دو کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔

وہ ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے آدھے چہرے پر روشنی تھی اور  
چہرہ تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا آدھا منہ اُجلا اور  
کالا ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دیدہ بینا سے وہ کالک نظر نہیں آتی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے کشادہ سڑک کے اس پار جیولری کی ایک دکان تھی۔  
دکان کے سامنے ایک سرخ رنگ کی کار آکر رک رہی تھی۔ کار ڈرائیو کرنے والی لڑکی  
دیکھ کر وہ دیوار کی آڑ میں آگیا تھا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔ جب وہ کار سے باہر آئی  
اس کا دلنشین سراپا نظر آیا۔ گہرے رنگ کی پھول دار میکسی اس کے بدن پر سج رہی تھی  
سیاہ ذھنوں میں زرد رنگ کا پھول یوں لگ رہا تھا جیسے رات کو سورج نکل رہا ہو۔

شام کا وقت تھا۔ بادل چھانے کے باعث قہقہے پہلے ہی روشن ہو گئے تھے۔ روشنی  
تاریکی کے سنگم پر وہ آدھا منہ سفید اور آدھا منہ کالا کئے کھڑا تھا۔ حسینہ کو دیکھتے ہی اس  
کچھ شبہ سا ہوا۔ دماغ نے کہا اسے اس لڑکی کے پیچھے جانا چاہئے۔ جب دماغ حکم دیتا ہے  
پاؤں اس راہ پر بے اختیار چل پڑتے ہیں۔ وہ کشادہ سڑک کو پار کرنے لگا۔

لڑکی اپنے پرس کو ایک ادائے ناز سے شانہ پر رکھے جیولری کی دکان میں داخل  
ہو گئی تھی۔ وہ کار کے پاس آکر ذرا دیر کے ملنے رک گیا۔ لڑکی کا ملازم جو پچھلی سٹاپ  
بیٹھا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر کار کو لاک کر رہا تھا۔ وہ ملازم پر ایک سرسری ہی نظر ڈال کر  
جیولری کی دکان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ شو دہندہ کے شیشے کے اس پار لڑکی شوکیس پر غور  
ہوئی زیورات پسند کر رہی تھی۔ دکان کے مالک نے مسکرا کر اس سے کچھ کہا۔ آواز باہر تک  
نہ آسکی۔ لڑکی نے جواباً مسکرا کر سر ہلایا پھر وہ دونوں دکان کے پارٹیشن کے پیچھے چلے گئے۔

وہ چلی گئی تو نظارہ خالی ہو گیا۔ دکان کے باہر وہ کھڑا رہ کر سوچنے لگا۔ ”مب کچھ ہو  
والا ہے؟ لیکن کیا ہونے والا ہے۔ یا تو لڑکی سے دوستی ہو جائے گی یا پھر اس لڑکی کو کوئی

حادثہ پیش آئے گا۔“

وہ کچھ دلوں سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دماغ اندر سے بولتا ہے۔ یوں تو سب ہی کے دماغ سوچ کی زبان سے بولتے ہیں لیکن اس کی بات کچھ اور تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ دماغ کے کسی چور خانہ سے آواز آتی ہے کہ یہ کرو۔ آگے بڑھو پیچھے ہٹو۔ فلاں پر شبہ کرو اور فلاں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادو۔ بس ایسی ہی ہدایت یا احکامات ملتے تھے۔ جیسے کوئی نیلی پتیتی جاننے والا اسکے دماغ کو کبھی کنٹرل کر رہا ہو یا کبھی بے لگام چھوڑ رہا ہو۔

بہر حال دماغ میں کوئی چور تھا۔ اس چور نے اسے حکم دیا کہ اسے بھی دکان کے اندر پارٹیشن کے پیچھے جانا چاہئے۔ لہذا وہ دکان کے اندر پہنچ گیا۔ دکان کے منیجر نے اسے سر پر ہاتھوں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”فرمائیے؟“

اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”میں اس پارٹیشن کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔“

منیجر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام آصف حمزہ ہے۔“

وہ کارڈ تارہا تھا کہ آصف حمزہ انٹیلی جنس کا چیف آفیسر ہے منیجر کے ہاتھ میں وہ کارڈ کانپنے لگا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی کال کرتا ہوں۔ سیٹھ صاحب پارٹیشن سے باہر آجائیں گے۔“

اس نے ریسپور کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے ہی آصف حمزہ نے ٹیلی فون اور ریسپور کو اپنے ہاتھ کے چوڑے پنجے سے ڈھانپ دیا۔ ”کوئی کال یا کوئی اشارہ اُدھر نہیں پہنچنا چاہئے۔“

منیجر نے عاجزی سے کہا۔ ”ہماری عزت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ایک بار معاف کر دیں۔ ہم آپ کا ہر مطالبہ پورا کریں گے۔“

”تم نے اس دروازے کو باہر سے لاک کیا ہے۔ میرا مطالبہ ہے کہ چابی میرے حوالے کر دو۔“

اس نے دروازہ کھول کر نوٹوں کی ایک بھاری گڈی آگے رکھ دی۔ آصف حمزہ کا دماغ پھر بولنے لگا۔ ”میں ایک ایمان دار افسر ہوں۔ رشوت قبول نہیں کر سکتا۔ مجھے چابی

چاہئے۔“

اس نے فیجر کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر دو سرا ہاتھ اس کی جیب میں ڈال کر چابی نکال لی۔ اس کے بعد اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ پیچھے جا کر پارٹیشن کی دیوار سے ٹکرایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار کے دوسری طرف ایک سرو کی اذیت ناک کراہیں سنائی دیں۔ آصف حمزہ شوکیس کے اوپر سے چھلانگ لگا کر دروازے کے پاس پہنچا۔ پھر تھوڑی سی چابی کے ذریعے دروازہ کھولتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ وہ چاقو لئے کھڑی تھی۔ چاقو پھل سے لمونچک رہا تھا۔ دکان کا مالک اپنے لمو میں بھیگا ہوا فرش پر رت پڑ رہا تھا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی شدید حیرانی سے پوچھا۔ ”آصف تم؟“

دماغ کے چور خانہ سے کوئی بولنے لگا۔ ”یہ لڑکی میرا نام جانتی ہے۔ میرا کام بھی جانتا ہوگی۔ بہت دور تک پہنچی ہوئی ہے۔ اسی لئے تو قتل کرنا بھی آتا ہے۔“

یہ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”اچھا تو تم میرا نام جانتی ہو؟ لیکن میں تمہاری جگہ آوارہ لڑکیوں کو پہچاننا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”آصف! ایسا نہ کہو۔ اس وقت میں مصیبت میں ہوں۔ تم ہی مجھے قتل کے ارادے سے بچا سکتے ہو۔“

یہ کہتے ہی اس نے میکسی کے دامن سے چاقو کے ہتھے کو پونچھ کر ایک حلقہ پھینک دیا۔

”اچھا تو تم ثبوت ضائع کر رہی ہو لیکن مجھ جیسے چشم دید گواہ کی آنکھیں کیسے ہٹا سکتی ہو؟“

وہ آگے بڑھی۔ پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”میں دشمنوں کی آنکھ پھونک سکتی ہوں مگر تمہاری یہ آنکھیں جو مجھے دیکھنے اور مجھے پہچاننے کے لئے ہیں۔ ان کی سلامتی کے لئے دسائیں مانگتی ہوں تاکہ ایک دن تم اپنی سالک کو پہچان سکو۔“

”سالک..... سالک..... سالک.....“ یہ نام اس کی کھوپڑی کے گنبد کو بجنے لگا۔ پھر اس کے دماغ نے کہا۔ ”غیس میں سالک نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ فراڈ ہے۔ مجھ پر اپنے سمن و شباب کا جال پھینک رہا ہے۔ مجھے ایک سراغ رساں کی ذمہ داری پوری کرنی چاہئے۔“

اس وقت تک سائل نے اس کی گردن میں اپنی ہانوں کا ہار پٹا دیا تھا۔ جال کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ آصف حمزہ نے اس کی ہانوں کے ریشمی جال کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”دور ہٹو میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تم سے کوئی برا سلوک نہ کروں تو میرے سوالات کا سیدھی طرح جواب دو۔“

اتنے میں دکان کا منیجر اندر آچکا تھا۔ اپنے مالک کی لاش دیکھ کر وہ سکتے کے سالم میں کھڑا رہ گیا۔ آصف نے اس سے کہا۔ ”دکان کا شرگرا دو۔ کوئی گاہک یہاں نہ آنے پائے۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں ابھی دکان بند کر دیتا ہوں مگر یہ قتل کا کیس جو گیلہ میں سجاد صاحب کو سمجھاتا تھا کہ شراب اور شباب سے توبہ کریں۔ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ اب وہی انجام سامنے آگیا۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ آصف نے سائل سے پوچھا۔ ”اب بتاؤ کیا مقتول کا نام سجاد ہے؟“

”ہاں۔“ سائل نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ یہ بری نیت سے مجھے یہاں لئے گا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری پسند کا ایک سیٹ یہاں اندر رکھا ہوا ہے۔ میں یہاں دیکھنے آئی۔ اس نے مجھے لپکانے کے لئے زیورات کی یہ الماری کھول دی۔“

آصف نے دیکھا۔ ایک طرف کھلی ہوئی الماری میں سونے چاندی ہیرے موتیوں کے زیورات جگمگا رہے تھے۔ اس نے سائل کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ایسی جگہ پہنچ کر عورت کی حرص و ہوس ہر اچھے برے مرحلہ سے گزر جاتی ہے یہی تم نے کیا۔“

”میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ یہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ میں باہر جانے لگی تو یہ چاقو کھول کر کھڑا ہو گیا لیکن یہ ہوس کے مارے بوکھلایا ہوا تھا۔“

چاقو کھول کر آگے بڑھتے ہی اڑکھڑا گیا۔ میں نے اپنے پرس کو زور سے اس کے ہاتھ پر مارا تو چاقو گر پڑا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ وہ گھبرا کر پارٹیشن کی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھو اُدھر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے قریب آکر اس کے سینے کی طرف چاقو تان کر کہا۔ ”اب میرا راستہ روکو گے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن اسی وقت باہر سے پارٹیشن کی دیوار کو کسی نے دھکا مارا۔ جس کے نتیجے میں یہ ادھر دھکا کھا

کر چاقو کی نوک پر آگیا۔

آصف حمزہ کو یاد آیا کہ اس نے میجر کا مگر بیان پکڑ کر اسے دھکا دیا تھا اور میجر اسی جگہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیوار کا معائنہ کیا۔ اس ہارن دیوار کے ایک طرف کیلیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اندر کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو دھکا لگ سکتا تھا۔

اس کے دماغ نے کہا۔ ”سائلہ کا بیان درست ہو سکتا ہے۔ اگر وہ چاقو تیار کیا ہو۔“  
اس نے سائلہ کو دھمکی دینے کے لئے وہ چاقو نکالا ہو۔“

اس نے میجر سے پوچھا تو تصدیق ہو گئی کہ چاقو مجاہد کا تھا۔ سائل نے کہا: ”اگر اب تمہیں یقین ہو جانا چاہئے کہ میرے ہاتھ کا چاقو مقتول کی طرف نہیں بڑھا تھا، مقتول اس چاقو پر آگیا تھا۔“

انسان کا دماغ اس کا سب سے بڑا رہنما ہوتا ہے۔ وہ صحیح راہ بھی دکھا سکتا ہے اور غلط بھی۔ وہ اندر بیٹھ کر ہر حال میں بولتا ہے۔ لہذا وہ بولنے لگا۔ ”اگر میں فیجر کو دھکا دے تو وہ دیوار سے نہ ٹکراتا اور سجاد کا سینہ اس چاقو کی نوک پر نہ جاتا۔ ایسی صورت میں اس سائلہ سے غیر ارادی طود پر قتل ہوا ہے تو اس قتل کا مرتکب میں بھی ہوں کیونکہ میں فیجر کو دھکا دے کر سجاد کو چاقو پر گرایا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ نادانستی میں ہوا۔ تاہم اس غیر ارادی قتل کے عمل میں میں اور سائلہ برابر کے شریک ہیں۔“

جب تک وہ سوچتا رہا میجر بولتا رہا۔ ”جناب آصف صاحب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کیا ہو گیا۔ آپ نے مجھے دھکا دیا تھا میں نے دیوار سے ٹکرائے کے بعد سجاد صاحب کو کراہیں سنیں تھیں۔ ٹھیک اسی وقت اس لڑکی نے انہیں قتل کیا ہے۔“

سائلہ نے کہا۔ ”اچھا تو آصف نے تمہیں دھکا دیا تھا تب تو میرے بیان کی جڑ ثابت جو باقی ہے۔ قتل میں نے نہیں کیا اگر الزام مجھ پر آتا ہے آصف! تو اس الزام تم بھی میرے برابر کے شریک ہو۔ آگے میرے ہاتھ میں چاقو تھا۔ پیچھے سے تمہارا ارطالہ کردہ دھکا تھا۔ اب بولو مجرم کون ہے؟“

دہ سوچنے لگا۔ کبھی کبھی داغ فیصلہ کن انداز میں بول نہیں سکتا۔ اس لئے یہ  
 ادھر سوچنا پڑتا ہے۔ فیجر رونے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”جناب! سجاد صاحب ایک م



فائدہ ان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر اس مقدمہ میں یہ بات آئے گی کہ انہوں نے کسی لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا تو ان کی جوان بیٹیاں بدنام ہو جائیں گی۔ آپ کسی طرح اس معاملہ کو یہیں ختم کر دیجئے۔“

ساملہ نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں آصف! یہ فیجر ہمارا ساتھ دے گا۔ اس معاملہ کو یہیں ختم کر دو۔ ہم دونوں خواہ مخواہ کے الزامات سے اور عدالتوں کے چکر لگانے سے بچ جائیں گے۔ میں پہلے بھی تمہاری تھی۔ یہاں سے نکل کر آئندہ بھی تمہاری رہوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ اس کے بازو سے لگ گئی۔ بازو سے ایسا بدن لگا کہ آصف کا دل آپ ہی آپ دھڑکنے لگا۔ دماغ کے کئے سے ہی دل دھڑکتا ہے۔ ”اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے۔“

قتل کے مقدمہ میں پریشائیاں ہیں اور پیار کے مقدمہ میں آرام اور سکون ہے اس کی بات مان لیتا چاہئے۔“

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ ”قتل کو چھپایا نہیں جاسکتا کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ لاش کو کہیں چھپا دیا جائے۔“

”ہاں اگر ایسا ممکن ہے تو ضرور چھپا دینا چاہئے۔“

”ناممکن ہے۔“ فیجر نے کہا۔ ”یہاں کوئی تمہ خانہ نہیں ہے کہ لاش چھپا دی جائے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ سجاد مرحوم عزت و احترام سے سپرد خاک کئے جائیں تو کوئی انہیں جوس پرست نہ کہے۔“

ساملہ نے ہاتھ نہ چاکر کہا۔ ”واہ بڑے وقار اور نمک حلال ملازم ہو۔ اپنے مالک کی عزت رکھنا چاہتے ہو اور میری عزت تو جیسے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔“

فیجر نے کہا۔ ”میں آپ کی بھی عزت رکھنا چاہتا ہوں۔ آصف صاحب چاہیں تو اسے دیکھتی اور قتل کا کیس بنا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ آپ دونوں یہاں مجھے اچھی طرح یاد دہ کر چلے جائیں۔ میں بعد میں پولیس والوں کو بیان دوں گا کہ چند آدمی معزز گاہک بن کر آئے تھے لیکن لباس کے اندر ریوالبور اور چاقو رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں پارٹیشن کے پیچھے جانے پر مجبور کیا ہم یہاں آئے تو پہلے انہوں نے مجھے رسیوں سے باندھ کر مرنے میں کپڑا ٹھونس دیا۔ سجاد صاحب نے شور مچانے کی کوشش کی تو انہوں نے اتو سے ہلاک کر دیا۔“

سانلہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”بہت عمدہ تدبیر ہے۔“ وہ پھر آصف سے پلٹ کر  
 ”ہاں آصف! جلدی اس کی بات مان لو۔“

وہ میرے کی کئی تھی۔ دیکھتا ہوا انگارہ تھی۔ انگارہ جہاں جہاں بدن سے چپکنا  
 حصوں کو جلاتا ضرور ہے۔ آصف کا ہاتھ بے اختیار اس کی کمر کے خم پر آگیا۔ جیسے  
 ہو۔ ”اور جلاؤ.....“

سانلہ اسے سوچتے دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ شکاری کو اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہوتا ہے  
 وہ اعتماد سے بولی۔ ”اسے زکیتی کا کیس بھی بنانا ہے۔ اس لئے میں یہاں سے اپنی پرہیز  
 زیورات سمیٹ کر لے جاؤں گی۔“

فیجر نے کہا۔ ”میں اپنے مالک کی زندگی میں نمک حلال اور وفادار رہا مجھے  
 وفاداری کا کچھ صلہ ملنا چاہئے۔ جتنا مال آپ یہاں سے لے جائیں گی۔ اس کے تین  
 ہوں گے ان میں سے ایک حصہ آپ ابھی میری گھر والی کے پاس پہنچائیں گی۔ میں گرا  
 پتہ بتا رہا ہوں۔ آسان ہے آپ یاد کر لیں۔“

اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔ سانلہ نے پتہ یاد کرنے کے بعد وعدہ کیا۔ ”میں ایک  
 گھنٹہ کے اندر تمہارا حصہ تمہاری بیوی کے پاس پہنچا دوں گی۔“

”دیکھئے سانلہ صاحب! میں اور آصف صاحب آپ کو قتل کے الزام سے بچا رہے  
 ہیں۔ اگر حصہ پہنچانے میں بے ایمانی ہوگی تو میں بعد میں اپنا بیان بدل دوں گا۔ ان  
 کموں گا کہ سانلہ اور آصف حمزہ صاحب نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں آپ دونوں  
 ذکر نہ کروں۔ ورنہ آپ لوگ میرے بچوں کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ میں اپنے بچوں  
 نبھال رہی ہوں۔ ذرا کے بعد صحیح جان دے رہا ہوں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں  
 آسانی سے اپنا بیان بدل سکتا ہوں۔“

وہ سمجھ گئی۔ بستر کی چادر اٹھا کر کھلی ہوئی الماری کے پاس بچھادی پھر سونے چلا  
 اور بے موتیوں سے بنے ہوئے زیورات اٹھا کر چادر پر رکھنے لگی۔ دس منٹ  
 جب ان نے گٹھڑی باندھ کر آصف کو دیکھا تو وہ فیجر کو اچھی طرح باندھ کر فرش پر  
 گٹھڑی بنا چکا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

وہ دونوں زیورات کی گٹھڑی اٹھا کر دروازے کے پاس آئے۔ اسے ایک طرف



پہنچائے گئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر ایک قویہ سے ان کے چہرے اور گردن کا پیمتہ پونچھ رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر کا اشارہ پا کر دونوں پولیس عورتیں اس کی بندشوں کو کھولنے لگیں۔  
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ نقاہت سے بولی۔ ”میرا نام سالکہ ہے۔“  
”تم اپنا نام یاد رکھتی ہو مگر یہ یاد نہیں رکھتیں کہ تمہاری ایک خراب عادت ہے۔“  
”کتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔“

”مجھے شاک نہ پہنچاؤ۔ اب یاد رکھوں گی۔“  
”نساء، تمہاری عادت یا تمہاری کمزوری کیا ہے؟“  
”زیورات.....“ وہ ایک گہری سانس چھوڑتی ہوئی بولی۔

”کیا تم زیورات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں؟“  
”رہ سکتی ہوں۔ اب میں کسی عورت کا زیور نہیں اتاروں گی۔“  
”تم نے پہلے بھی وعدہ کیا تھا۔ تمہاری باتوں اور طور طریقوں سے پتہ نہیں چلا کہ تمہارا

پاگل مو۔“  
”پاگل نہیں پگلی کہو۔ ڈاکٹر تمہاری گرامر درست نہیں ہے۔“  
ڈاکٹر نے جھینپ کر لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”سالکہ

سالکہ! تم تو بہت ذہین ہو۔ دوسروں کی غلطیاں پکڑ لیتی ہو۔ کیا اپنی ایک غلطی سے باز نہیں آ سکتیں؟“  
”میں باز آگئی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔“

”ایک ماہ پہلے تمہیں نارمل سمجھ کر چھٹی دے دی گئی تھی۔ ایک ماہ تک تم بالکل ٹھیک رہیں۔ صرف اپنے زیورات پر صبر کرتی رہیں۔ تین دن کے بعد تم نے بیگم حشمت

بیگم کے زیورات پر ہاتھ صاف کیا۔ گیس سلنڈر کو کھول کر انہیں کچن میں بند کر دیا۔ یہ نہیں جانتی تھیں کہ تمہیں عارضی رہائش دی گئی تھی اور ہمارا ایک آدمی برابر تمہارا گھرانی کر رہا تھا۔ اگر وہ موقع پر تمہیں گرفتار نہ کرتا اور کچن میں نہ پہنچتا تو گیس کی زیادتی سے بیگم حشمت بیگ کا دم گھٹ جاتا۔“

سالکہ نے کہا۔ ”میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ان کے گلے سے ہار اتار لی۔“

وقت دو بجھ سے الجھ رہی تھیں۔ میں تے ہار اتارتے ہی انہیں دھکا دیا۔ وہ سلنڈر سے جا کر ٹکرائیں۔ سر پر چوٹ لگتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ شاید ان کے ٹکرانے سے سلنڈر کی چابی گھوم گئی تھی۔“

”کچھ بھی ہو۔ تمہیں زیورات سے اتنی محبت ہے کہ تم نے اس بے ہوش عورت سے ہمدردی نہیں کی۔ کچن کا دروازہ بند کر کے بھاگنے لگیں۔ اگر عین وقت پر وہ نہ آجاتا تو تم ایک نیکس کے لالچ میں قاتل بن جاتیں۔“

”چلو یہ تو ثابت ہو گیا کہ میں بیگم صاحبہ کو ہلاک نہیں کرا چاہتی تھی۔“

”ہاں بیگم حشمت بیگ کے بیان سے تم بچ گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ تم نے گیس ان نہیں کی تھی۔ سلنڈر سے ٹکرانے کے بعد بھی وہ چند لمحوں تک ہوش میں رہیں۔ وہ باقی تھیں کہ ان کا ہاتھ لگنے سے سلنڈر کی چابی گھوم گئی ہے۔ وہ گیس کو سارج ہونے سے روکنا چاہتی تھیں مگر اسی لمحہ ان کا سر چکرا گیا لیکن ہم یہاں بیگم حشمت کی نہیں ہماری باتیں کر رہے ہیں۔ تم کب تک الزامات سے بچتی رہو گی۔ اگر چوری اور چھینا بھٹی کے دوران کسی کی جان جائے گی تو تم قاتل کہلاؤ گی۔“

”قاتل نہیں قاتلہ کو۔ لیڈی ڈاکٹر تمہاری گرامر بھی درست نہیں ہے۔“

اس بار لیڈی ڈاکٹر جھینپ کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”سائلہ! تم مت بڑی فراڈ ہو۔ ہم تمہاری بھلائی کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تم ایک نارمل لڑکی مگر لیکن تمہارا وکیل عدالت میں ایسے ٹھوس دلائل پیش کر کے تمہیں ذہنی مریدہ ثابت کرتا ہے کہ تمہیں جیل خانہ کے بجائے پاگل خانہ بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں تم پاگل خانہ کے ایک کمرہ میں آکر آرام فرماتی رہتی ہو۔“

”ڈاکٹر! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ تم مجھے اب سے پہلے بھی بجلی کے جھٹکے پہنچا چکے ہو۔ میں ایسے اذیت ناک جھٹکے برداشت کرنے کے لئے جان بوجھ کر پاگل خانہ میں نہیں آسکتی۔“

”اپنی علوت سے مجبور ہو کر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے بعض لوگ پھانسی کے تختہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ زیورات کو دیکھ کر تم پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔“

”تو بھر تم کس مرض کی دوا ہو ڈاکٹر۔ جب تم دیکھ چکے ہو کہ دماغ کو جھٹکے پہنچانے

کے باوجود میرا یہ جنون نہیں جاتا تو پھر دوسرا طریقہ علاج کیوں نہیں اختیار کرتے؟“ لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ”پلیز ڈاکٹر! آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ سائلہ فراڈ ہے۔ یہ ہمارے لئے صرف ایک مریضہ ہے۔ اس کے وکیل نے عدالت میں جو باتیں وہ سب درست ہیں۔ یہ دوسری عورتوں سے زیورات ضرور چھینتی ہے لیکن کچھ شوق سے پہننے کے بعد مختلف ذرائع سے انہیں واپس کر دیتی ہے۔ پولیس رپورٹ کے حق میں ہے۔ رپورٹ کا متن یہ ہے کہ سائلہ چور نہیں صرف ذہنی مریضہ ہے۔“ اور ہم ڈاکٹر نہیں گھسیارے ہیں۔“ ڈاکٹر نے چڑ کر کہا۔ ”میں دعوے سے ہوں کہ یہ فراڈ ہے۔“

”فراڈ نہیں فراڈن کمو۔ تذکیر و تائید کا خیال رکھا کرو۔“

ڈاکٹر نے بولنے کے لئے منہ کھولا مگر غصہ کی زیادتی سے سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اس نے منہ بند کر لیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے سائلہ کو مخاطب کیا۔ ”سائلہ! جب تم حشمت کانیکلس چھین کر فرار ہونا چاہتی تھیں۔ تب بچن کے باہر ہمارے ایک آدمی تمہیں پکڑ لیا۔ بتاؤ کہ تم نے اس آدمی کو دیکھتے ہی کیا کہا تھا؟“

”میں اسے دیکھتے ہی حیرانی سے بولی آصف تم؟“

”اس کا نام راشد ہے۔ تم نے اسے آصف کیوں کہا؟“

”اس لئے کہ یہ میرے محبوب کا نام تھا۔ کیا آپ نے میری ڈائری نہیں پڑھی؟“

لیڈی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کے ہاتھ سے ایک ڈائری لے کر کہا۔ ”تمہاری ڈائری میں لکھا ہے کہ ایک بار تم سیٹھ کریم کی کوٹھی سے زیورات کا ایک سیٹ لے کر فرار ہو رہی تھیں۔ اگر ایک نوجوان تمہیں اپنی کار میں لفٹ نہ دیتا تو تم پکڑی جاتیں۔ اس سے متاثر ہو کہیں اس کا نام آصف جمال تھا۔“

سائلہ نے کہا۔ ”ہاں میں اس سے متاثر ہو گئی تھی مگر وہ یو۔ کے سے آیا تھا۔ ملاقاتوں کے بعد واپس چلا گیا۔ پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ اب چورنی کرنے کے بعد کوئی نوجوان میرے سامنے آتا ہے تو میں اسے آصف کہتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے آصف کہتے ہی وہ مجھے پیار کی بانہوں میں سمیٹ کر چوری کے الزام سے بچا کر لے جائے گا۔“ لیڈی ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ”یعنی تمہیں آصف جمال کا پورا نام اچھا نہیں لگتا۔“







آصف جمال نظر آ رہا تھا۔

☆-----☆-----☆

آصف جمال سے وہ دوبار مل چکی تھی۔ وہ بہت سی مختصر ملاقاتیں تھیں۔ پہلی ملاقات میں آصف جمال نے اسے اپنی کار میں لفٹ دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زیورات کے دو ڈبے تھے اور وہ شخص اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ بہر حال جب کار آگے بڑھ گئی اور اس کا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے تو آصف جمال نے ڈرائیو کرنے کے دوران اپنا ایک ہاتھ سائلہ کے زانو پر رکھ دیا۔ وہ فوراً ہی دروازے کی جانب کھسک گئی۔ بعض لوگ اچھے لگتے ہیں مگر ان کی بے باکی اور جلد بازی اچھی نہیں لگتی۔ آصف جمال نے مسکرا کر کہا۔ ”میں یو۔ کے سے آیا ہوں۔ انگلینڈ میں لڑکیاں برا نہیں مانتیں۔“ وہ خاموش رہی۔ اس نے پوچھا۔ ”بائی وی دے۔ وہاں دو آدمی تمہارا پیچھا کر رہے تھے؟“

سائلہ نے جواب دیا۔ ”مشرقی لڑکیاں برا مان جائیں تو مرد اسی طرح پیچھا کرتے ہیں۔“

”تم مجھ پر طنز کر رہی ہو۔“

”نہیں، تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ لفٹ نہ ملتی تو وہ پکڑ لیتے۔ اب اس احسان کے بدلے تم مجھے پکڑنا چاہتے ہو۔“

”میں دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ کل رات کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔ کیا ہم تھوڑا وقت ساتھ نہیں گزار سکتے؟“

”یہاں شریف گھرانے کی لڑکیاں رات کو نہیں گھومتیں۔ میں کل صبح ملاقات کروں گی۔“

اس نے خوش ہو کر سائلہ کا پتہ پوچھا۔ مگر سائلہ نے گھر کا پتہ نہیں بتایا۔ اس سے گارڈن میں ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ گھر پہنچ کر وہ تمام رات آصف جمال کے حلق سوچتی رہی۔ وہ اسے اچھا لگا تھا لیکن اچھا لگنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ایک پلٹسکا پر بھروسہ کر لیتی۔

دوسرے دن گارڈن میں ملاقات ہوئی تو آصف جمال نے ایک اخبار اس کی طرف

بدھاتے ہوئے کہل۔ ”یہ خبر بدھو۔ پولیس ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں ہے جو پرانی  
کی ایک کوٹھی سے زیورات چرا کر بھاگی ہے اور وہ تم ہو۔ کل رات میں نے تمہارے  
ہاتھ میں زیورات کے دو ڈبے دیکھے تھے لیکن انہیں اہمیت نہیں دی تھی۔“

سائلہ وہ خبر بدھ کر پریشان ہو گئی۔ آصف جمال نے طنزیہ انداز میں کہل۔ ”مشرقی لڑکیوں کی پارسائی جتنا ہی تمہیں۔ کیا مشرقی لڑکیوں اس طرح چوری کرتی ہیں؟“

وہ ندامت سے بولی۔ ”میں چور نہیں ہوں۔ پتہ نہیں زیورات کو دیکھ کر کچھ  
ہو جاتا ہے۔ میرا دماغ میں ایک ہی ضد کرتا ہے کہ میں وہ زیورات پہن لوں۔ اس طرح  
میں چھپنے چھپنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ کچھ روز انہیں پہننے کے بعد دل بھر جاتا ہے۔  
میری بھالی اور بھائی جان ان زیورات کو اصل مالک تک کسی نہ کسی طرح چپکے سے  
دیتے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بھالی اور بھائی جان تمہاری اس چوری کی حلیہ  
چھپا کر تمہیں شہ دیتے ہیں۔“

”نہیں“ وہ بھی میری اس حلیہ سے پریشان ہیں۔ مجھے سمجھاتے ہیں کہ ایسا کرنا  
کرنا چاہئے اور بب ایسا کرتی ہوں تو اپنی بدنامی کے ڈر سے پپ چاپ چوری کا مال دلو  
کر دیتے ہیں۔“

”تم اپنے بھائی جان کے ساتھ رہتی ہو؟“

”نہیں۔ اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب اپنی کوٹھی پر  
تھا رہتی ہوں۔“

”تو پھر چلو۔ ہم اس کوٹھی میں وقت گزاریں گے۔“

”نہیں آصف! آج تک کوئی غیر مرد میری کوٹھی میں نہیں گیا۔ میں اسے پسند  
کرتی۔“

”میں تو پسند کرتا ہوں۔ دیکھو میں تمہارا رازدار ہوں۔ تمہیں پولیس کے حوالہ  
نہیں کروں گا۔ بس میرا دل خوش کر دو۔“

”تم مجھے بے سیال لڑکی سمجھ کر میری توہین کر رہے ہو۔“

”یہ فضول باتیں ہیں۔ انگلینڈ میں کوئی شخص کسی لڑکی کے ساتھ اتنا وقت نہ

نہیں کرنا۔ معاملات فوراً طے ہو جاتے ہیں۔ جلدی فیصلہ کرو ورنہ میں تمہیں پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک پریشانی سے سوچتی رہی پھر کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ آصف جمال نے پوچھا۔ ”کیا تم ڈرائیو کرو گی؟“

”ہاں۔ میں تمہیں اپنی کوٹھی میں لے جا رہی ہوں۔ مجھے ہی ڈرائیو کرنا چاہیے۔“ وہ دوسری طرف سے گھوم کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ راستے میں آصف جمال عشق و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ بب گاڑی ایسے راستے سے گزرتی گئی۔ جہاں ٹریفک برائے نام تھی تو اس نے اپنا ہاتھ سائلہ کے زانو پر رکھ دیا۔ سائلہ نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری طرف کا دروازہ اچھی طرح بند نہیں ہوا ہے۔“

”نہیں، اچھی طرح بند ہے۔“

”میں ڈرائیو کر رہی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اچھی طرح بند نہیں ہے۔“

دروازے کو دوبارہ کھول کر بند کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس نے سائلہ کی بات رکھنے کے لئے دروازے کو کھولا۔ اسی لمحے اسٹیرنگ ایک جھٹکے سے گھوم کر پھر سیدھا ہو گیا۔ آصف جمال کی چیخ سنائی دی۔ وہ کار سے باہر جا چکا تھا۔ سائلہ نے بت و دور جا کر کار روکی۔ اس کا دروازہ بند کیا۔ پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

یہ واقعہ وہ اپنی ڈائری میں لکھ چکی تھی لیکن وہ حیران تھی کہ جہاں جہاں اس نے آصف جمال لکھا تھا۔ وہاں اب ڈائری میں آصف حمزہ لکھا ہوا تھا۔ مزید حیرانی کی بات یہ کہ اس کی ڈائری سے آصف جمال کی تصویر برآمد ہوئی تھی۔

اب اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری تھی اور دوسرے ہاتھ میں وہ تصویر تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے پیار سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”سائلہ! اپنے ذہن کو زیادہ نہ الجھاؤ۔ اگر آصف حمزہ تمہاری ڈائری میں آیا ہے تو کسی دن تمہاری آنکھوں کے سامنے بھی آجائے گا۔ تب تم اسی سے بہت کچھ معلوم کر سکو گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔“ دونوں کاشییل عورتیں سائلہ کے اطراف آکر کھڑی ہو گئیں۔





سی۔ کم از کم مجھے سمجھانا تو چاہئے کہ یہ بری عادت ہے۔“

یہ سوچ کر اس نے کہل ”سانلہ! تمہارے بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر عادت سے تمہیں باز آنا چاہئے۔ تمہاری اداؤں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ سمجھو نہیں آتا کہ مجھے کس حد تک تمہارا ساتھ دینا چاہئے۔“

وہ کھٹک گئی۔ ”اچھا تو یہ وہی ڈاکٹروں والی فصیحیتیں کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی بات نہیں مانوں گی تو یہ میرا ساتھ نہیں دے گا۔ پھر میں یہ سارے زیورات پہن کر اپنا پورا نہیں کر سکوں گی۔“

شوق کی بات آئی تو اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ارمن غدی کی طرح پھلنے لگے۔ ”میں پنوں گی میں ایک ایک کر کے سارے زیورات پنوں گی۔ اگر مجھے نہیں روک سکتا۔“

دماغ ضد کر رہا تھا۔ وہ کن آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ آصف حمزہ ڈلیش پورا۔ اس کی ڈائری کھول کر پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے کہل ”اس میں میرا نام لکھا ہے۔“

سانلہ نے ایک سرود آہ بھرتے ہوئے کہل ”ہاں۔ میری محبت کا یہ ایک ثبوت۔ کہ میں پہلے بھی تمہیں چاہتی تھی۔ اب بھی تمہیں چاہتی ہوں مگر تم مجھے زیور پہنے نہ دیکھ سکتے۔“

”کیوں نہیں۔ زیورات پہن کر تمہارے سمن کو چار چاند لگ جائیں گے لیکن زیورات خرید کر پہنے جاسکتے ہیں۔“

”میں خرید سکتی ہوں مگر چھین کر پہننے میں جو ایڈ وینچر ہوتا ہے ایک طرح کی قہر ہوتی ہے۔ اس کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ تم میری بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔“

”میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ایک جاسوس کو صرف جرائم کی روک تھام چاہئے۔“

وہ پھر کھٹک گئی۔ ”کھٹ کھٹ کھٹ“ بیسے دروازہ کھلا رہ گیا ہو اور ہوا کا چوکھٹ سے لگ کر کھٹ کھٹ بج رہا ہو۔ وہ فوراً ہی بولی۔ ”آصف! تم نے اپنی طرف دروازہ اچھی طرح بند نہیں کیا۔“

”نہیں۔ یہ اچھی طرح بند ہے۔“

”میں ڈرائیو کر رہی ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اچھی طرح بند نہیں ہے۔“

آصف حمزہ نے اس کی تسلی کے لئے دروازے کو دوبارہ کھول کر بند کرنا چاہا۔ اسی اسے زبردست جھٹکا پہنچا۔ کار ایک جھٹکے سے گھوم گئی تھی۔ وہ چیخ مارتا ہوا باہر کی لڑھک گیا۔ سہیل نے آگے کی طرف جھک کر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے کیا کیا؟ اس سے پیچھا چھڑانے کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟“

”آپ چپ رہیں۔ میں بہتر سمجھتی ہوں۔“

”جب عورت پر زیورات کا جنون سوار ہوتا ہے تو اسے ایسی ہی حقائق بہتر نظر آئیں۔ کیا وہ تمہیں بعد میں نہیں پہچانے گا۔ مجھے بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔“

”آپ اتنی سی بات سے گھبرا رہے ہیں۔ ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس دکان کا۔۔۔ سجاد میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔“

”ہاں؟“ وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ گار کی چھت سے سر ٹکراتے ہی پھر بیٹھ گیا۔ ”قتل؟“

”نہیں کیا ہے؟ نہیں نہیں تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“

”ہاں ہں ایسا نہیں کر سکتی تھی لیکن ایسا کرنا پڑا۔ جس ہارڈ بورڈ کی دیوار سے وہ لگائے کھڑا تھا۔ اس دیوار کو دھکا لگا۔ وہ اس کی زد میں آکر چاقو کی نوک پر آیا تو میں نے بھی پوری قوت سے چاقو اس کے سینے میں اتار دیا۔ اگرچہ قتل کا ارادہ نہیں تھا لیکن فری لمے ارادہ ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ دکان کے منیجر کو اپنی اداؤں سے رجحانوں کی۔۔۔ سے چوری کے مال میں حصہ دار بناؤں گی لیکن وہ آصف حمزہ اچانک آپہنچا۔ مجھے اس کے تھوڑی سی ڈرامہ کھیلنا پڑا۔“

ایسا کہتے وقت وہ اسکرین کے پار تصویر کی اسکرین پر اس نے خود کو آصف حمزہ کی ٹوٹ میں دیکھ کر دو مضبوط بازوؤں کے حلقہ میں قید باشقیت یاد آنے لگی۔ عورت رف زیور رہی نہیں، خویرو مرو کی محبت بھی پہننا چاہتی ہے۔

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی عقب نما آئینہ میں دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سہیل اپنا آئینہ میں نظر آ رہا تھا۔ اس میں خویرو دیکھی نہیں تھی۔ آصف حمزہ کے مقابلہ میں مچھر لڑا تھا۔ اس جینے نے کان کے پاس ہاتھ جھٹک کر خیالی مچھر کو اڑا دیا۔ وہ صرف

آصف حمزہ کو یاد کرنا چاہتی تھی لیکن سہیل نے مداخلت کی۔ ”تم کہیں گم ہو۔ میں نے کچھ کہہ رہا ہوں۔“

”آں۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”تم نے مجھے اور خود کو مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ ایک تو تم نے قتل کیا اور یہ کہ دوست بننے والے جاسوس سے دشمنی مول لی۔ آخر تم کس دماغ سے ہوتی ہو اس طرح فرار ہو کر قانون کے ہاتھوں سے بچ جاؤ گی؟“

”میں نہیں جانتی کہ مجھ سے کیسے قتل ہو گیا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ قانون ہاتھوں سے کب تک بچتی رہوں گی۔ وہاں زیورات سے بھری ہوئی الماری کھلی تھی میرا دماغ یہی کہہ رہا تھا کہ یہ سارے زیورات میرے ہو سکتے ہیں۔ شاید اسی لئے میرے بے اختیار اسے قتل کر دیا۔“

”تم اس جاسوس کی بات کر رہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈ نہیں سکے گا لیکن مجھے پہچان لے گا اگر تم دوستی نبھالیتیں تو کیا نقصان ہو گا؟“

”بہت بڑا نقصان ہو گا۔ کیا آپ بھول گئے کہ ڈائری میں اسی آصف حمزہ کی تصویر تھی۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ لیڈی ڈاکٹر کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔ ابھی یہ یقین رہا تھا۔ اگر میں نصیحت پر عمل نہ کرتی تو یہ مجھے پولیس اسٹیشن پہنچا دیتا۔ اسی لئے میرے اس سے نجات حاصل کر لی۔“

سہیل صادق اپنا حرقام کر سوچنے لگا۔ عورت بھی کیا چیز ہے؟ مرد اے خوش رہنے کے لئے رشوت لیتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے۔ ہیرا پھیری بھی کرتا ہے۔ سائلہ دانی ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات کی رپورٹ کو قائم رکھنے کے لئے میں کسی نہ کسی طرح سائلہ چرائے ہوئے زیورات واپس کر رہا۔ تاکہ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ اس کا چچا زار سہیل کوئی گھپلا کر رہا ہے۔ پولیس والوں کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد میں نے چچا چرائے ہوئے زیور کی تصویر اتاری۔ پھر ہو ہو دیا یہی ایک زیور بنوایا۔ اس زیور سونے میں کھوٹ شامل کیا۔ نختی ہیرے اور موتیوں سے اسے مکمل کیا۔ اتنے عرصے میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ پولیس والے واپس ملنے والے زیورات کو کہاں پر رکھتے جاتے ہیں، میں نے اس پارکھ سے دوستی گاٹھ لی۔ اسے اپنے کاروبار کا حصہ دار بنا



اس لئے پچھل بار اس نقلی زیور کو دیکھ کر اس کی اصل مالکہ دھوکہ کھا گئی۔  
اس بار لاکھوں روپے کے زیورات ہاتھ آئے ہیں لیکن اس لاکھوں روپے کے منافع پر انسانی لبو کے چھینٹے پڑ گئے ہیں ایک عورت کے لالچ اور اس کی حماقت سے منافع بخش کاروبار فطرے میں پڑ گیا ہے۔

کار ایک کوٹھی کے کپڑوں میں آکر رک گئی۔ دونوں نے ڈگی کھول کر گھڑی نکالی۔  
پھر اسے کوٹھی کے اندر لے گئے۔ ایک کمرے کے فرش پر گھڑی کو رکھنے کے بعد وہ غصہ سے بولی۔ ”آپ مرد ہیں؟ کیا یہ گھڑی تھا اٹھا کر نہیں لاسکتے تھے۔“

یہ کہہ کر وہ ہانپنے لگی۔ سوچنے لگی کہ آصف حمزہ ہوتا تو گھڑی کے ساتھ اسے بھی اغلاک وہ پھر خوابوں میں کھو گئی۔ وہ آ رہا تھا اسے بڑی محبت سے اپنی آغوش میں سمیٹ رہا تھا۔ ایک ایک وہ چونک کر سہیل کو پرے ہٹا کر بولی۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں‘ جابیے پہلے بچاؤ کی تدبیر کیجئے۔“

وہ سنگار نیز کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔  
”کل..... کل سے میں برقعہ پہنا کر دوں گی۔ آپ کچھ دنوں کے لئے ردپوش ہو جائیں یا ضرے باہر چلے جائیں۔“

ایسا کہنے وقت اس کے دماغ نے کہا۔ ”ہاں یہ بہتر ہے کہ سہیل گھر میں قید رہیں یا شہر میں نہ رہیں۔ میں اسی دوران آصف کو تلاش کر دوں گی۔ اس سے معافی مانگوں گی۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دوبارہ اسے مل کر خطرہ مول لیتا چاہتی ہوں۔ بہر حال سہیل کو یہاں سے ٹال دینا چاہئے۔“

یہ سوچ کر اس نے کہا۔ ”میں نے دکان کے منیجر کو ان زیورات میں سے حد دینے کے لئے کہا تھا۔ اس طرح وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ میں پتہ بتا رہی ہوں۔ آپ اس کی گھر دلی کو حصہ دے آئیں۔“

اس نے پتہ بتاتے ہوئے گھڑی کھولی۔ پھر اس میں سے کچھ زیورات الگ کر دیئے۔ اس کے دل میں خواہش چل رہی تھی کہ آئینہ کے سامنے باری باری تمام زیورات کو پہن کر اپنے حسن کا جائزہ لے لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ جب سہیل کچھ زیورات لے کر چلا گیا تو اس نے باقی تمام زیورات کو آہنی الماری میں چھپا دیئے۔ وہ بڑی

الماری کو کھول کر ایک سیاہ برقعہ نکالا۔ اسے پہن کر کوٹھی سے باہر آئی۔ پھر کار میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہو گئی۔

☆=====☆

آصف حمزہ کار کے کھلے دروازے سے گرنے کے بعد سڑک کے کنارے ڈھلوان سے لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں جا کر الجھ گیا تھا۔ ستارے گردش میں آگئے تھے۔ اس لئے کہ پھر سے ٹکراتے ہی دقیق طور پر ہوش دھوا اس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔

وہ شعوری طور پر غائب تھا۔ ایسے وقت لاشعور سپنے دکھاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ زمین اور فرض شناس سرخ رساں تھا۔ شینہ سے اس کی ملاقات ایسے دور میں ہوئی کہ وہ مجرموں کے لئے دہشت بن گیا تھا۔ شینہ کی محبت نے اسے فرائض کی ادائیگی میں ساقاغل بنا دیا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ کہیں کسی مجرم کا سرخ ملتا یا اس کے تعاقب کی ضرورت پیش آتی تو اتفاق سے شینہ کی زلفوں کا سایہ مل جانے کے باعث وہ تھک کر رہ جاتا۔

اسے جو تنخواہ ملتی تھی وہ شینہ کی فرمائشوں کی نذر ہو جاتی تھی۔ پہلے تو قرض لے کر رتنی کپڑے کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ پھر وہ قرض کی ادائیگی کے لئے رشوت لینے پر آمادہ ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو سچے اصولوں کوڑا سکتے ہیں لیکن جھوٹی عورت کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اسے اٹلی جنس کے دفتر کے دارنک ملنے لگی کہ رلو راست پر آجائے، درہ ملازمت سے جائے گا۔ عورت کے لئے جب جنت چھوڑ دی جاتی ہے تو پھر ملازمت کی شمار میں آسکتی۔ ایک باریوں ہوا کہ ایک رئیس زادے نے کسی کو قتل کر دیا۔ وہ سزا سے بچنے کے لئے قتل کا الزام کسی دوسرے پر تھوپنا چاہتا تھا۔ اس غرض سے اس نے شینہ کو ایک نئے ماڈل کی کار خرید کر دی۔ پھر تو وہ عورت آصف حمزہ کے کمزور امولوا کے سامنے چٹان بن کر کھڑی ہو گئی کہ قتل کی تعقیب کا رخ دوسری طرف موڑ دیا جائے۔

آصف حمزہ نے سمجھایا۔ ”شینہ! مقتول کے دریا بھی دولت مند ہیں۔ وہ اپنے دریا سے اپنے قاتل ثابت کر کے بنی دم لیں گے۔ تم اپنی ضد سے باز آ جاؤ میری جان!“

لیکن میری جان نے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے بال کھول دیئے۔ اسے مجبوراً  
نہموں سے اٹھا کر گلے لگانا پڑا۔ پھر اس نے اپنے طور پر تعقیب کا رخ موڑ دیا لیکن انٹیلی  
جنس کے ایک افسر نے اپنے طور پر تعقیب کرنے کے بعد سچائی کو بے نقاب کر دیا۔ قاتل  
بھی پکڑا گیا اور رشوت خوری بھی ثابت ہو گئی۔

وہ صبح اور مکمل رپورٹ ابھی عدالت تک نہیں پہنچی تھی۔ آصف حمزہ کو پتہ چل گیا  
کہ وہ بھی حراست میں لیا جائے گا۔ یہ خبر ملنے ہی وہ بھاگا ہوا ٹمپنہ کے پاس پہنچا۔ ٹمپنہ کو  
توقع نہیں تھی کہ آصف حمزہ اچانک اتنی جلدی واپس آجائے گا۔ اس لئے وہ رئیس  
زادے کی آغوش میں دل بسلا رہی تھی۔ رئیس زادہ اس سے وعدہ کر رہا تھا کہ سزا سے  
بچتے ہی وہ اس کے لئے ایک کوٹھی خریدے گا۔

مارے غصہ کے آصف حمزہ کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اے ہوش نہ رہا کہ وہ کیا کر رہا  
ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اس کے دیوانہ دار قہقہوں کی گونج  
میں ٹھانیں ٹھانیں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

”ٹھانیں، ٹھانیں، ہلباہا میں دیوانہ ہوں، جو اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا اور اپنی عاقبت  
بگاڑ لیتا ہے۔“

ہلباہا ہم جیسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آج سے میں زندگی کی آخری  
سانس تک مرنا رہوں گا.....“

یہ کہتے ہی وہ چکرا کر ٹمپنہ اور رئیس زادے کی لاشوں کے پاس گر پڑا۔ اس کے بعد  
وہ آخری سانس تک زندہ رہ کر مرتے رہنے کے لئے ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔  
ہوش آتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو جھڑیوں میں الجھ گیا۔ اس کے آس  
پاس مینڈ ٹکڑا کے ٹرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ سالک  
کے ساتھ کار شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر بند کرنے سے پہلے ہی گر پڑا تھا لیکن سالک  
اس کا بھائی اور وہ کار کہاں ہے؟

وہ چاند کی روشنی میں سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ کے اندر بیٹھے ہوئے  
سواگر ملانے لگا۔ ”میں گرا نہیں، گرایا گیا ہوں۔ ایک عورت نے پھر مجھ سے فریب کیا  
ہے۔“

وہ غصہ سے تھلنے لگا۔ ”میں نے اس پر بھروسہ کیوں کیا؟ میں تو اس مقصد پر فرار ہوا تھا کہ جو بھی حسین عورت ملے گی اسے قتل کر دوں گا۔ پھر میں نے اسے کیوں نہیں کیا؟“

اس کے دماغ کے چور خانہ سے کوئی بولنے لگا۔ شاید اس لئے کہ میں خوگرنہ ہوں۔ عادتاً حسین عورتوں کی اداؤں سے بہل جاتا ہوں۔ میں عادتاً جاموس ہوں۔ اسی لئے یہ گرفتار بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں پاگل ہوں۔ احمق ہوں۔ مجھے ساری عادتیں بھول کر بہت انتقام کو یاد رکھنا چاہئے۔ میں سانکھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ جھاڑیوں سے نجات پا کر اٹھنے لگا تو گیلی زمین پر پڑی ہوئی ڈائری ہاتھ آگئی۔ یاد آیا کہ کار سے گرتے وقت اس کے ایک ہاتھ میں وہ ڈائری تھی۔ اس فریبی عورت نے پتہ بھانے کے لئے وہ ڈائری اس کے ساتھ کار سے باہر چلی آئی تھی۔

آدھ گھنٹہ بعد جب وہ سانکھ کی کوٹھی کے سامنے پہنچا تو وہ مین گیٹ کے پاس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آصف حمزہ نے آگے بڑھتے ہوئے ”مکار عورت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”اگر میں مکار ہوئی تو تمہارے انتظار میں یہاں کھڑی نہ رہتی۔“ وہ اس کی گردن دبوچتا چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ واقعی وہ اس کے انتظار میں کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ابھی میں یہاں آؤں گا؟“

”میں نے دیکھا تھا کہ تم ڈائری کے ساتھ کار سے گر پڑے ہو۔“

”کیا تم گاڑی روک کر میرے پاس نہیں آ سکتی تھیں؟“

”نہیں سہیل بھائی نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں گاڑی نہ روکوں۔ یقین کرنا دل تمہاری طرف لگا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکل سے سہیل کو دھوکہ دے کر کوٹھی سے آئی ہوں۔ میرا دل کتا تھا کہ میری محبت سچی ہے۔ تم یہاں ضرور آؤ گے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی مرمریں ہانسیں کا ہار اس کی گردن میں پھانسیا۔ وہ ایک سے پکھل گیا پھر دی حسین عورت کی اداؤں سے بہل جانے کی حاوت غالب آگئی۔ بولی۔ ”آصف! میرے آصف یہاں سے فوراً چلو ایسا نہ ہو کہ سہیل یہاں پہنچ جائے۔“

آصف نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے؟“

وہ سوچنے لگی کہ فی الحال سہیل سے دور رہ کر آصف کے ساتھ کہاں وقت گزارنا چاہئے۔ سوچنے کے دوران وہ دونوں خاموشی سے کچھ دور چلتے رہے۔ اسی وقت کتنی ہی گاڑیوں کی ہیلڈ لائٹس نظر آئیں۔ وہ روشنیوں کی زد میں آنے سے بچ گئے۔

گاڑیاں تیزی سے چلتی ہوئی سائلہ کی کوٹھی کو گھیرے میں لے رہی تھیں۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پولیس والوں کو قتل اور ڈکیتی کی واردات کا علم ہو چکا ہے۔ اس حینہ کے پاس صرف اداؤں کے ہتھیار تھے۔ اس لئے وہ فوراً ہی آصف حمزہ سے لپٹ گئی تاکہ اس سراغ رساں کو اپنا فرض یاد نہ آئے۔

پھر رات کے منٹوں میں ایک پولیس افسر کی آواز گونجنے لگی۔ وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کہہ رہا تھا۔ ”سائلہ! ہم تم سے مخاطب ہیں۔ تمہارا بھائی سہیل صادق گرفتار ہو چکا ہے۔ اگر کوٹھی کے اندر تمہارے ساتھ کوئی ہے تو اس کے ساتھ چپ چاپ باہر چلی آؤ۔“

پولیس افسر کی یہ آواز آصف حمزہ کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن اسے اپنا فرض یاد نہیں آیا۔ کیونکہ اس کے سینے پر سائلہ کی جوانی دھڑک رہی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں تمہاری ہوں۔ میرے بدن کا ذرہ ذرہ تمہارا ہے۔ مجھے قانون کے حوالے نہ کرو۔ ہم کہیں دور پلے جائیں گے۔ پھر میں تمہیں اتنی خوشیاں اتنا پیار دوں گی کہ تمہارے سامنے جنت پھینکی پڑ جائے گی۔“

آدی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ جنت کی تلاش میں جنت سے دور نکل جاتا ہے۔ وہ بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک پُر فریب جنت کا ہاتھ تمام کر بھاگتا چلا گیا۔ بھاگنے کے دوران وہ برقعہ سنبھالتی ہوئی سوچنے لگی۔ ”ہائے ساری محنت اکارت گئی۔ جس الماری میں میں نے زیورات چھپائے ہیں۔ وہاں تک میں نہیں جاسکتی۔ جب سہیل گرفتار ہو چکا ہے تو پولیس دلے اس سے سب کچھ انگوٹھیں گے۔ اس الماری تک بھی شاید پہنچ سکے ہوں گے۔“

وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر تقریباً روتے ہوئے بولی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا تمہارے پاس پناہ لینے کی کوئی جگہ ہے؟“

”نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں پولیس والے مجھے بھی تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”تو پھر چلو۔ ایک نرس میری سہیلی ہے۔ ہم فی الحال اس کے ہاں پناہ مانگیں۔“

اس کا دانی سے باہر پہنچتے ہی انہیں ایک عیسیٰ مل گئی۔ تمام راستے وہ خاموش رہی کیونکہ وہ ڈرائیور کی موجودگی میں موجودہ حالات پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ سہیلی نے پہنچ کر اسے حالات کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ دونوں بے تکلف سہیلیاں تھیں۔ اس نے پناہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ وہ تنہا رہتی تھی۔ وہاں کوئی ان کی موجودگی کی اعتراض کرنے والا نہ تھا۔ اس نے دونوں کے لئے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ آصف حمزہ نے حالات کا تجزیہ کرنے کے لئے پوچھا۔ ”وہ تمہارا سہیل بھائی؟“ گرفتار ہو گیا؟ تم اسے کہاں چھوڑ کر آئی تھیں۔“

”میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دکان کے منیجر کا حصہ اس کی بیوی تک پہنچا دے۔ خیال ہے کہ منیجر نے پولیس والوں کے سامنے حقیقت اگل دی ہے۔ پولیس والے فوراً منیجر کے گھر گئے ہوں گے۔ اس طرح سہیل کو وہاں گرفتار کر لیا ہو گا۔“ یہ کہتے ہی وہ تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر پڑی۔ ”ہائے میں بہت تھک گئی۔“ یہ برقعہ اتار دو۔“

آصف حمزہ نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر واپس آکر برقعہ اتارنے لگا۔

☆-----☆-----☆

سائلہ کے معنی ہیں سوال کرنے والی۔ اس کی خواہیدہ خواہیدہ اسی آنکھیں؟ خاموشی سے سوال کرتی رہتی تھیں کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ وہ چور اچکی کہلاتی تھی۔ دنیا والے اس کے سوال کے جواب میں اسے چوری اور شاید بے حیا بھی کہہ دیتے لیکن وہ ایسی حیا والی تھی کہ غیر سروں کے سلسلے کتراتے تھی۔ آصف جمال نے اسے بلیک میل کرنا چاہا اور اس کے ساتھ دقت گزار کی خواہش ظاہر کی تو اس نے چلتی گاڑی سے اسے نیچے گرا دیا۔

اس کی زندگی میں آنے والا ایک اور شخص اس کا چچا زاد بھائی سہیل تھا۔ سہیل اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی چوری کی عادت چھڑا دے گا۔ اگر ناکامی ہوئی تو پھر عدو کے سلسلہ میں اس کا ساتھ دے گا۔ اسے قانون کے پہنچے سے بچا لیا کرے گا۔ اس کی

یہ تھی کہ سائلہ اس سے شادی کر لے۔

لیکن ان دنوں سائلہ کا باپ زندہ تھا۔ اس نے شادی کی مخالفت کی۔ دو اپنے بچے سہیل کو اچھی طرح جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کی عادتیں اور زیادہ بگاڑ دے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ سہیل نے مایوس ہو کر ریحانہ سے شادی کر لی۔ جب سائلہ کے ڈیڑی کا انتقال ہو گیا اور وہ کوٹھی میں شمار ہونے لگی تو سہیل اور ریحانہ اکثر اس کے پاس آکر اس کی دل جوئی کرنے لگے۔

دو محبت کی بھوکی تھی۔ اسے بھائی اور بھانج کا پیار ملا تو انہیں اپنا سمجھ کر دل کی باتیں کہنے لگی۔ جب بھی وہ کسی کا زیور چراتی اور جب اسے پن کر اس کا دل بھر جاتا تو سہیل اسی زیور کو اس کی اصل مالکہ تک معذرت کے ساتھ پہنچا دیتا۔

جب وہ سیٹھ کریم کی کوٹھی سے زیورات لے کر فرار ہوئی تو اس چوری کی خبر انبارت تک پہنچ گئی۔ اسی وقت آصف جمال نے اسے اپنی کار میں لفٹ دی تھی اور دوسرے دن اس پر نیت خراب کی تھی۔ یہ تمام باتیں وہ سہیل اور ریحانہ کو بتا چکی تھی لیکن اس بار وہ دونوں اسے عدالت تک جانے سے نہ بچا سکے۔ پھر بھی جیل جانے سے بچا لیا۔ اس کے وکیل نے ثابت کر دیا کہ وہ دماغی مریضہ ہے۔

وہ کچھ عرصہ مینٹل ہسپتال میں زیر علاج رہی اور بیش مارل ہونے کا ثبوت دیتی رہی۔ لہذا اسے ہسپتال سے اس طرح چھٹی دی گئی کہ اس کی نگرانی کے لئے ایک شخص کو مقرر کر دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ایک تقریب میں ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اس بار سہیل نے بھی اپنا کمال دکھایا۔ چوری کے زیور کی ہو ہو خنک تیار کی۔ پکڑے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ پولیس والے زیورات کو پرکھنے کے لئے جس پارکھ کے پاس لے جاتے تھے۔ وہ پارکھ سہیل کا بزنس پارٹنر بن گیا تھا۔

سائلہ نے پھر کچھ دنوں کے بعد بیگم حشمت بیگ کے ٹیکس پر ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ تقریر اچھی تھی کہ بیگم کی قائلہ بننے سے بال بال بیچ گئی اور دوبارہ پاگل خانہ پہنچا دی گئی۔ وہاں اس کے دماغ کو برقی جھٹکے پہنچائے گئے۔ دماغ کو جھٹکے پہنچنے کے بعد اسے اپنا بچپن یاد کیا۔

اسے یاد آیا جب وہ نو برس کی تھی تو ایک شام اس کی ماما نے کسی پارٹی میں جانے

کے لئے زیورات پہن رکھے تھے۔ اس کے ڈیڈی نے سائلہ کو بچی سمجھ کر اس کے اس کی ممی کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”میری جان! عورت زیورات کے بغیر مکمل ہوتی۔ اب تم مکمل ہو.....“

سائلہ نے کہا۔ ”ممی! میں بھی زیور پہنوں گی۔“

ممی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”بچے نہیں پہنتے۔ ہریت کی خند نہ کیا کرو۔“

ڈیڈی نے کہا۔ ”بھئی ایک نیکس پہنا دو۔ میری بیٹی اچھی لگے گی۔“

”آپ اسے سر پر نہ چڑھائیں۔ بھلا اسے کون پسند کرنے آ رہا ہے کہ یہ ابھی

زیور پہنے کی؟“

یہ کہہ کر ممی اس کے ڈیڈی کو نے کر چلی گئی۔ سائلہ کے ننھے سے دماغ میں دو بھرنے لگا۔ ایک تو ممی نے اسی چیز پر قبضہ جمار کھا تھا، بے پہننے سے ڈیڈی انہیں پیار کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ پیار کرنے والے ڈیڈی کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔

اس کا ذہن جیسے کسی آگ پر کھولتا رہا۔ ایک دن اس نے ممی کی غیر موجودگی میں سنگار میز کی دراز سے ایک نیکس چرا لیا۔ اسے پہن کر ڈیڈی کو دکھایا تو انہوں نے ہاتھ کرتے ہوئے خوب تعریف کی۔ پھر سمجھایا۔ ”بیٹے تمہاری ممی کو معلوم ہوگا تو تمہارے ہو جائیں گی۔ اس نیکس کو چپکے سے واپس رکھ دو۔“

پھر اس کے دماغ میں یہ بات نقش ہو گئی کہ زیور چرا کر پہننا اتنی بری بات نہیں۔ کیونکہ اسے واپس رکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح شوق بھی پورا ہوتا ہے۔ پھر چوری۔ مراحل سے گزرتے وقت عجیب سی سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ ممی کو بے وقوف بنانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

جب وہ جوان ہوئی اور اسے زیور پہننے کے لئے ویسے گئے تو اسے اچھا نہ لگا۔ ممی کا انتقال ہو چکا تھا۔ سیدھی طرح خریدے ہوئے یا تحفہ کے طور پر آئے زیورات پہننے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ممی جیسی دوسری عورتوں کو بے وقوف بنا کر زیورات پہنے جائیں۔ بچپن کا خدی دماغ اب جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ چھوٹی کال میں جو دستور بن گیا تھا، جو طریقہ کار پسند آ گیا تھا، اب اسی طریقہ پر چلنے کے لئے ان جنونی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔



ہوتی جیسے کھانے کے بعد سالک نے یہ بیان دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ خود اپنی کوششوں سے اس بری عادت کو چھوڑ دے گی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے پھر رہائی مل گئی۔ سہیل اور ریحانہ پاگل خانہ آئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ حالانکہ نے اپنے وعدہ کے مطابق اس بری عادت سے باز رہنے کی کوشش جاری رکھی لیکن سہیل اس کے لئے درد سر بن گیا تھا۔ وہ تنہائی میں موقعہ پا کر اس کے قریب آنا چاہتا تھا اور وہ کتراتا رہتی تھی۔ ایک بار اس نے ریحانہ بھابی سے شکایت کر دی۔ ریحانہ نے اپنے میاں کی اچھی طرح خبر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو کچھ دنوں کے لئے ایک شریف آدمی بن گیا۔

لیکن سالک مطمئن نہیں تھی اور سہیل سے پیچھا چھڑانے کے لئے سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

☆-----☆-----☆

وہ بستر پر لیٹی ہوئی موج رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی زلفیں نکیہ پر بکھری ہوئی تھیں اور وہ آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو

تیری صبح کہہ رہی ہے، تیری رات کا فسانہ

دھوپ کھڑکی کے راستے بستر تک پہنچ رہی تھی، آہستہ آہستہ نے ہاتھ روم سے نکلتے ہوئے کہا، ”اب اٹھ بھی جاؤ۔ ذرا اپنی سہیلی سے کو کہ چائے پلاؤ۔“

پھر اس نے فرش پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھاتے ہوئے کہا، ”تمہاری سہیلی سمجھ دار ہے۔ اس نے دستک نہیں دی۔ دروازے کے نیچے سے اخبار پہنچا دیا۔“

یہ کہتے ہوئے دو اخبار کی درق گردانی کرنے لگا۔ آخری صفحہ پر پچھلی رات کے ایک قتل اور دیکھتی کی خبر تفصیل سے شائع ہوئی تھی۔ وہ توجہ سے پڑھنے لگا۔ کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لیتی ہوئی بولی، ”کیا وہ اخبار مجھ سے زیادہ لچپ ہے۔“

آصف حمزہ نے غصہ سے انبار کو دونوں ٹھٹیوں میں بھیج لیا۔ دو پریشان ہو کر بولی، ”کیا بات ہے۔ تم مجھے غصہ سے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

وہ دانت پیس کر بولا۔ ”ذلیل، کمینہ عورت ثواب تک مجھے محبت کا فریب نہ تھی۔ سہیل کو بھائی کہنے والی بدکار عورت تو نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ وہ تیرا بار ہے تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ کہتے ہی اس نے بستر کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ پلٹک کے دوسری طرف چلا کر پھر دور بھاگتی ہوئی بولی۔ ”میں بے وفا نہیں ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ مجھے چاہتے ہو۔ خواہ خواہ و دھمکی نہ دو۔“

اس نے غرا کر کہا۔ ”یہ دھمکی نہیں ہے۔ تجھ سے پہلے بھی ایک اور حسین نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔ کسی دوسرے کو یار بنا لیا تھا۔ میں نے اسے قتل کر دیا۔ تجھے بھی تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔“

اس پر واقعی جنون سوار ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں انتقام پکار رہا تھا۔ وہ تیز آگے بڑھا لیکن سامنے والی نے ایک کرسی آگے کر دی۔ وہ الجھ کر گر پڑا۔ پھر تھلا کر لگا۔ اتنی دیر میں وہ دروازہ کھولنے کے بعد کہہ رہی تھی۔ ”تم یقین کرو۔ میں تم سے پیچھا چھڑا کر تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”اور میں تمہارے لہو سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں۔ میں قاتل ہوں۔ اب تمہارے جیسی حسین عورتوں کو معاف نہیں کروں گا۔“

وہ بھاگتی ہوئی اپنی سہیلی کو پکارتی ہوئی مکان سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ سہیلی اس کے مدد کے لئے موجود نہیں تھی۔ کہیں چلی گئی تھی۔ اب بھاگتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جو پچھلی شب کا ہمسفر تھا، وہ ایک جنونی قاتل کے روپ میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ اس کی زلفیں بکھری ہوئی ہیں اور دو وارنٹ گاؤں میں ہے۔ حیرانی سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ ایک ٹیکسی اس کے قریب آکر رک گئی۔ ڈرائیور پوچھا۔ ”آپ کہاں جانا چاہتی ہیں؟“

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”جلدی چلو۔ ایک قاتل میرا پیچھا کر رہا ہے۔“

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بہت دور آصف حمزہ بھی ایک تیز دروازہ کھول کر بیٹھ رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”تیزی سے چلاؤ۔ وہ بھی ٹیکسی میں“

”ہاں“ ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بی بی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آپ کو پولیس اسٹیشن پہنچاؤں گا۔ وہاں آپ محفوظ رہیں گی۔“

ن ایک دم سے گھبرا گئی۔ تھانے کی طرف جانے کا مطلب یہی ہوتا کہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرے۔ پولیس والے تو پہلے ہی اس کی تلاش میں تھے وہ پھر پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگی۔ پیچھے کھڑا اور آگے کھلتی تھی۔ نہ اُدھر جا سکتی تھی نہ اُدھر وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”نہیں۔ میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ دوسری جگہ لے چلو۔“

”بی بی! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ قاتل سے بچنا چاہتی ہیں اور پولیس کی مدد بھی لینا نہیں چاہتی؟ بات کیا ہے؟“

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک سڑک سے دوسری سڑک پر بھاگی جاری تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ٹیکسی آہستہ آہستہ جھٹکے کھانے لگی۔ شاید کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ قسمت خراب ہو تو راستے میں ایسی ہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹیکسی رکی تو وہ دروازہ کھول کر فٹ پاتھ پر بھاگنے لگی۔ آس پاس بچوں کا شور سنائی دیا۔ ”پگلی ہے۔ پگلی ہے۔ مارو۔ مارو۔ مارو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ چار پتھر اس کی طرف آئے دو اور تیزی سے بھاگنے لگی۔ کچھ دم بھاگتے رہنے کے بعد آصف حمزہ کی گرجدار آواز سنائی دی۔ ”رک جا مکار عورت! تو مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکے گی۔“

مارے وہشت کے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ تب اس نے دیکھا سامنے پاگل خانہ کا بیڑا سادروازہ تھا۔ بچے اسے پگلی سمجھ کر پتھر مار پکے تھے۔ اس کی حالت بھی پگیوں جیسی تھی۔ دماغ نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ پگلی بن کر ہی قانون اور قاتل دونوں سے بچ سکتی ہے۔

زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں تھا۔ دو دروازے پر کھڑے ہوئے سنتری کو دھکا دیتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سنتری اس غیر متوقع دھکے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے گر پڑا۔ جب دوبارہ اٹھا تو دوبارہ دھکا لگا۔ وہ پھر زمین بوس ہو گیا۔ اس بار آصف حمزہ اس سے ٹکراتا ہوا گزر گیا تھا۔

دو ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ نہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ جیل خانہ کی گیارہویں یا پاگل خانہ کے اندر؟ اب بھی اس کی حیثیت جاسوس کی ہے یا مجرم کی؟ اس کے دماغ کے اندر میرے میں صرف ایک حسین عورت نظر آ رہی تھی جسے قتل کرنا اور بعد ہی وہ اچھے برے کی تمیز کر سکتا تھا۔

پاگل خانہ کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ وہاں کے سپاہی دو بھاگنے لگے اور پکڑنے کی کوششیں کرتے ہوئے چلا رہے تھے۔ ”پکڑو۔ پکڑو۔“ قحط کر رہا تھا۔

آصف حمزہ کا دماغ اسے سمجھا رہا تھا کہ لوگ اس حسینہ کو پکڑا چاہتے ہیں۔ مرنے کی گرفتار ہو جائے گی تو اس کے سامنے پیش کی جائے گی کہ لیجئے حضور! اب آپ اسے قتل سے قتل کر دیں۔

اگر دماغ ہمیشہ غلط سمت رہنمائی کرے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ انسان گمراہ نہیں ہے۔ بے شک وہ نارمل نہیں تھا۔ دماغ کے اندر میرے میں دوڑتے دوڑتے خلاخوں سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟

ایک طویل بے ہوشی کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اپنی سلاخ کے پیچھے زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ ایک ڈاکٹر اور چار مسلح سپاہی اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بے وقار عورت ہے جس سے بچ کر نہیں جاسکتی۔“

وہ چیخنے کے دوران اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر رہا تھا لیکن زنجیریں مرنے والی ہوئی نہیں تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”تم جے، ہمیں بت پریشان کیا ہے۔ تم اپنے ساتھ ایک اور پاگل کو لے کر فرار ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ تو پکڑا گیا مگر تم انٹیلی جنس کے ایک آفیسر کو ہلاک کر کے اس کا شناختی کارڈ لے کر آزادی سے گھومتے رہے۔ تین دن کے مختلف ہوٹلوں سے یہ رپورٹ ملی کہ تم کھانے کے بعد بل ادا کرنے کے بجائے انٹیلی جنس کے آفیسر کا کارڈ وکھا کر پلے جاتے ہو۔“

ہمیں اندیشہ تھا کہ تم اس شر کی حسین عورتوں کو قتل کر دو گے۔ اپنے ایشام کی بجھاؤ گے۔ پولیس دالے تمہیں تلاش کر رہے تھے لیکن تم نظر نہیں آرہے تھے۔ تم

اخلی جنس والوں نے مشورہ دیا کہ اگر ایک چوہیا کو آزاد کر دیا جائے تو بلا فطرتاً اور ضرورتاً اس کا پیچھا کرنے کا تم عادتاً ایک سراغریں ہو۔ سائلہ جیسی چور لڑکی کا پیچھا ضرور کرتے اور ہماری نظروں میں آجاتے۔ لہذا ہم نے پاگل خانہ سے سائلہ کی چھٹی کر دی۔ عادت بدلی جاسکتی ہے لیکن عادت فطرت بن جائے تو تمہارے جیسا خو گرفتہ انسان فطرتاً پاگل بن جاتا ہے ہم تمہاری سراغریں کی عادت سے تمہیں گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن تم انتقام لینے والے عاشق بن کر ہمارے دام میں آئے ہو۔“

ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور آصف حمزہ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”افسوس کہ تم انتقام کی آگ بجھانے کے لئے اسے قتل نہ کر سکے لیکن قانوناً اسے موت کی سزا ملے گی۔“

”نہیں۔ قانون اسے جس مارسلک اس مکار اور بے دفاع عورت کو میں قتل کر دوں گا۔“

وہ طلق پھار کر بچ رہا تھا اور زنجیریں توڑنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔

☆-----☆-----☆

لیڈی ڈاکٹر نے کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے خوب صورت سی مازھی بنی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی زیورات کی جگہ گاہٹ میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے شوہر نے آگے بڑھ کر اسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ ”زیورات بننے کے بعد عورت کا سن مکمل ہو جاتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ حسین چہرے پر جھک گیا لیکن قدموں کی آہٹ پاتے ہی فوراً الگ دیکھ دوں نے سر گھما کر دیکھا۔ دروازے پر سائلہ کھڑی ہوئی تھی۔

”سائلہ تم؟“ لیڈی ڈاکٹر شرابی ہوئی ہوئی۔ ”تم اب تک مارل نہیں ہو تمہیں یہ می سکھایا ہو گا کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے دستک دینا چاہئے۔“

سائلہ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”آج کا انبار پڑھ کر میں الجھ گئی ہوں۔ جیوری لی دکن کا فیچر اپنے بیان میں میرا نام لیتا ہے اور ریحانہ بھائی کو شناخت کرتے ہوئے انہیں سائلہ کہتا ہے“ آخر یہ کیا چکر ہے؟ کیا میری بھائی نے سجاد کو قتل کیا ہے؟“

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے شانہ پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں سائلہ! میں امی

لئے تمہیں سمجھاتی آری ہوں کہ تمہیں چوڑی اور چھینا چھنی کی عادت سے باز آؤ۔  
تم اتنی معصوم ہو کہ ساری باتیں اپنے بھائی اور بھالی کو بتا دیا کرتی تھیں، ان معلومات  
فائدہ اٹھا کر انہوں نے یہ سنگین جرم کیا ہے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو تاکہ آئندہ  
مجرم تمہاری اس عادت سے فائدہ نہ اٹھائے۔“

سانلہ کی آنکھیں احسان مندی سے بھیگ گئیں۔ وہ لیڈی ڈاکٹر سے پلٹ کر  
گئی اور کہنے لگی۔ ”آپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ آپ میرا ساتھ نہ دیتے  
دونوں مجھے چھانی کے تختے تک پہنچا دیتے.....“

لیڈی ڈاکٹر اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلیاں دینے لگی۔ وہ دوپٹے سے  
آنسو پونچھتے ہوئے الگ ہو گئی۔ ”ڈاکٹر باجی! میں مادم ہوں۔ آئندہ دستک دے کر  
کروں گی۔“

یہ کہہ کر وہ ہانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے بھیگی آنکھوں سے اپنی ڈاکٹر  
کو دیکھا۔ آنسو پونچھنے کے لئے اس کے دونوں ہاتھوں میں دوپٹہ ابھی تک سٹا ہوا تھا۔  
وہ چلی گئی۔

لیڈی ڈاکٹر کے شوہر نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ”شکر ہے کہ جلدی ہوئی گی  
اب ہمارا روائس ادھورا نہیں رہے گا۔“

وہ اپنی بیوی کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک کر بولا۔ ”ارے تمہارے  
گلے کا ہار کیا ہو گیا؟“

لیڈی ڈاکٹر نے چوک کر آئینہ میں دیکھا تو ہار غائب تھا۔  
”میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔“

وہ غصہ میں ہانے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ ”ہا  
دیکھئے۔ وہ بے چاری مجبور ہے۔ دو چار روز کے بعد واپس کر دے گی۔ میں اس کی بار  
شیٹ سے واقف ہوں۔“

”لیکن.....“ اس کے شوہر نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنی بانہوں کا ہار پہنائی  
بولی۔ ”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ میرا سنگار تو آپ ہیں۔“

## بیچارے

ان جڑواں بھائی بہن کی عجیب کہانی جو دنیا میں اکٹھے آئے تھے اور  
مرے دم تک اکٹھے ہی رہنا چاہتے تھے۔ دنیا والے انہیں اکٹھا نہیں دیکھ سکتے  
تھے۔

المناک انجام کی ایک فکر انگیز کہانی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے جیسے دو دوست آپس میں جڑے ہوئے ہیں یا ایک مرد عورت کو سینے سے لگاتا ہے۔ اسی طرح دونوں کے سینے ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”یہ صرف آپریشن کے ذریعے الگ کئے جاسکتے ہیں لیکن میں اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ یہ آپریشن کے بعد زندہ رہ سکیں گے یا نہیں۔“

سینٹھ غفار بھائی کی ساری ٹوٹیاں خاک میں مل گئیں۔ بیگم غفار سینٹھ نے شروع کر دیا۔ دونوں میاں بیوی دس برس تک اولاد کے لئے ترستے رہے تھے۔ کروڑوں کے مالک تھے۔ ملک کے باہر بھی ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا وہ جہاں جاتے تھے دنیا کی ہر خوشی خرید لیتے تھے لیکن دنیا کے کسی بازار سے اولاد کی خوشیاں نہ خریدیں تھیں۔ بہت منتوں اور مرادوں کے بعد شادی کے گیارہویں برس بیگم غفار سینٹھ کے بھاری ہوئے تھے۔ جیسے جیسے زچگی کے دن قریب آتے جا رہے تھے سینٹھ غفار بھائی دنیا سے دیوانے ہونے جا رہے تھے۔ ان کے در سے کوئی سوائیاں مایوس ہو کر نہیں جاتا تھا۔ اس بات سے ڈرتے تھے کہ اگر انہوں نے کسی کا دل توڑا تو کہیں اس کی بددعا نہ جائے۔ بیگم غفار سینٹھ نے اپنی عالی شان کو خفی کے ایک بہت بڑے کمرے کو ٹوائے لٹا رکھا تھا۔ بچہ ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا مگر وسیع و عریض کمرہ دنیا جہاں کے کھلونوں سے آلود ہو گیا تھا۔

ایسی ہی امیدوں اور آرزوؤں کے بعد پچھلی رات شمر کے سب سے بڑے اپنا لیں اس کے بطن سے جڑواں بچوں نے جنم لیا۔ وہ اس حالت میں پیدا ہوئے کہ جنہوں طرف سے گوشت کا کچھ حصہ جڑا ہوا تھا اور وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی تھی۔ دونوں بچے بے حد خوبصورت تھے۔ اگر بچہ



غفار سیٹھ کے اختیار میں ہوتا تو وہ انہیں اسی طرح پال پوس کر جوان کر دیتی لیکن یہ ناممکن تھا۔ وہ بچے اس طرح آپس میں چپکے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ آپریشن لازمی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ وہ آپریشن کی ناکامی کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ بہت مجبوری تھی اس لئے میں باپ نے رو کر آپریشن کی اجازت دے دی جب بچوں کو آپریشن ٹیبلٹ پر لیٹا دیا گیا تو سیٹھ غفار بھائی نے ایک سادے چمک پر دستخط کر کے اسے ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ اس چمک پر پچاس لاکھ روپے کی رقم لکھ کر بھی کیش کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر آپ میری عمر دیوں کو سمجھتے ہیں۔ جب بچے نہ ہوں گے تو یہ دولت کس کام آئے گی۔ دولت تو اولاد کے لئے ہی کمائی جاتی ہے اور میں اولاد کے لئے ہی اسے خرچ کر رہا ہوں۔ آپ اسے قبول کریں اور کچھ اس طرح آپریشن کریں کہ ہمارے دونوں بچے زندہ سلامت ہمیں واپس مل جائیں۔“

ڈاکٹر نے وہ چمک واپس کرتے ہوئے کہا۔

”میں پوری دباہندہ ارمی سے اپنا فرض ادا کروں گا اور آپریشن کے وقت اپنی بہترین دواؤں سے کام لوں گا۔ اگر کامیاب ہو گیا تو آپ جو انعام دیں گے اسے قبول کر لوں گا۔ ناکامی کی صورت میں انعام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

یہ کہہ کر وہ آپریشن ٹیبلٹ پر چلا گیا۔ سیٹھ غفار بھائی کی تمام ملوں کے منیجر، جنرل منیجر اور دوسرے ملازمین ہسپتال کے اندر اور باہر پھیلے ہوئے تھے۔ ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ سینہ ٹھارہ بھائی نے ان سے التجا کی کہ وہ مسجدوں میں جا کر وضو مانگیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کریں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ اس شہر کا کوئی بھی غریب آج کی رات بھوکا نہ سوئے۔ اس سلسلے میں جتنے روپوں کی ضرورت ہے وہ ابھی اور اسی وقت ان کے خزانے سے وصول کر لیں۔

جب تک آپریشن ہوتا رہا وہ ہسپتال کے باہر ایسے کاموں میں مصروف رہے جن کے نتیجے میں انہیں اور ان کی اولاد کو دعائیں مل سکتی تھیں۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نے آپریشن ٹیبلٹ پر باہر آکر ان سے کہا۔

”فی الحال آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ ابھی انہیں آکسیجن پر رکھا گیا ہے۔ چند ہی منٹ

کے بعد میں ان کے متعلق کوئی بات یقین سے کہہ سکوں گا۔“

ماں باپ کے لئے وہ چوبیس گھنٹے قیامت بن کر گزرنے لگے۔ کبھی انہیں مایوسی تھی کبھی امید کے ہاتھ ان کے آنسو پونچھتے تھے۔ کسی لمحے وہ دونوں مرتے تھے کسی لمحے وہ زندہ رہیں گے لیکن انہیں دن رات مسلسل توجہ کی ضرورت ہے۔ لہذا ابھی دو روز نرسوں کی نگرانی میں پرورش پائیں گے۔ سینٹہ غفار بھائی نے خوش ہو کر کلمہ پڑھوں کی بات ہے مگر آپ نے یہ کہہ کر ہمیں دوبارہ زندگی ولی ہے کہ اب ہم صاحب ہیں اور اولاد کی خوشیاں دیکھتے رہیں گے۔ ڈاکٹر آپ انعام کے مستحق ہیں۔ اب آپ چیک کو قبول کر لیں۔“

ڈاکٹر نے چیک لے کر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی اس بات پر فخر ہے کہ میں نے ایک کامیاب آپریشن کیا ہے۔ ام اطمینان رکھیں، میں دن رات ان بچوں پر توجہ دوں گا اور ان کی طویل عمری کے لئے ممکن کوشش کروں گا۔“

پھر وہ بچے اسی اسپتال میں نرسوں کی زیر نگرانی پرورش پائے گئے لیکن ان کی بارک بھال کرتے وقت نرسوں کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے اگر ایک بچہ روز تھا تو دوسرا بھی رونے لگتا تھا۔ اگر ایک کو بھوک لگتی تو دوسرا بھی بھوک سے تھلا لگتا۔ مہمب ایک کو شہد چنایا جاتا تو دوسرا بھی مطمئن ہو جاتا اور بڑے اطمینان سے اپنی باری کا انتظار کرتا کہ اب اسے بھی شہد چنایا جائے گا۔ نرسوں کے مشاہدے میں عجیب سی باتیں نکلتی تھیں۔ وہ دیکھتی تھیں کہ اگر ایک کی بھوک مٹ جاتی تو دوسرا بھی مطمئن ہو جاتا تھا۔ پھر وہ شہد چائے یا دودھ پینے کے لئے نہیں روتا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد بیگم غفار سینٹہ ان پھول سے بچوں سے لدی ہوئی اپنے گھر آگئیں۔ ان کی سیدائش کی خوشی میں کئی روز تک جشن منایا گیا۔ غریبوں اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری کی گئیں اور تمام ملازمین کو ایک سال کا بونس دیا گیا۔ مہمب ان بچوں کے نام رکھے گئے تو ان کے نام سے مختلف شہروں میں کتنے ہی ہسپتال، یتیم خانے اور سکول کھولے گئے۔ لڑکے کا نام حامر رکھا گیا اور لڑکی امبر کے نام سے پکاری جانے لگی۔

مامر اور امبر ایک قالب اور دو جان تھے۔ جب وہ بالکل ننھے سے تھے اور اس دنیا کے کسی رشتے اور کسی محبت کو نہیں سمجھتے تھے، اس وقت بھی وہ ایک دوسرے سے الگ رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں ایک ہی پالنے میں سلایا جاتا تھا اگر امبر کو نیند آتی تو مامر بھی سو جاتا تھا اور اگر مامر کی آنکھ کھلتی تو امبر بھی جاگ جاتی تھی۔ یوں بھی ماں باپ کے لئے ننھے بچے دلچسپ کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں اور وہ دونوں تو ضرورت سے زیادہ دلچسپ تھے۔ ہر روز ماں باپ کو نت نئے تماٹے دکھاتے تھے۔ مامر وہ گھنٹوں کے بل چلنے لگے تو کسی حد تک ایک دوسرے کو پہچانتے بھی لگے۔ اگر انہیں کہیں الگ چھوڑ دیا جاتا تو وہ گھنٹوں کے بل چلتے ہوئے پھر ایک جگہ آکر مل جاتے تھے پھر وہ اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑے ہونے لگے اور کوٹھی کے لان تک پہنچ کر کھیلنے لگے۔ محلے پر دوس اور رشتہ داروں کے کتنے ہی بچے وہاں کھیلنے آتے تھے لیکن مامر اور امبر کی دنیا ہی الگ تھی۔ وہ کسی بھی بچے کو وقتی طور پر دھت مانتا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ان بچوں سے دور چلے جاتے تھے۔ جب وہ ذرا اور بڑے ہوئے تو ماں باپ نے انہیں سمجھایا کہ انہیں دوسرے بچوں سے الگ تھلگ نہیں رہنا چاہئے اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے دوسروں سے بھی دوستی اور محبت کرنا ضروری ہے۔ ماں باپ کے سمجھانے پر انہوں نے دوسرے بچوں سے دلچسپی لینے کی کوشش کی لیکن وہ اداس اداس سے رہے۔

شام کو اسکول سے واپس آکر امبر نے مامر سے شکایت کی۔  
 ”تم اسکول کے پارک میں شازیہ کے ساتھ کھیلتے رہے۔ کیا وہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟“

”مامر نے جواب دیا۔ ”شازیہ تو کیا تمہارے ہاں نایاں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ میں اس سے پیچھا پھڑکانا چاہتا تھا مگر وہ کہنے لگی کہ میرے ساتھ نہیں کھیلو گے تو میں تمہارے ڈیڈی سے شکایت کر دوں گی۔“

امبر نے کہا۔ ”ہاں! جاوید بھی مجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔ وہ بھی ڈیڈی سے شکایت کرنا چاہتا تھا۔ مامر ڈیڈی ہمارے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟ وہ ہمیں ایک دوسرے سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ میں تم سے الگ نہیں رہ سکوں گی۔ اگر ڈیڈی نے مجبور کیا تو میں اسکول نہیں جاؤں گی۔“

عامر نے کہا۔ ”میں بھی اسکول نہیں جاؤں گا۔“

دونوں بھائی بہن نے فیصلہ کر لیا کہ جو اسکول انہیں ایک دوسرے سے جدا کرے وہاں نہیں جائیں گے۔ جب ماں باپ کو ان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ انہیں مکر لگے۔

”اسکول نہیں جاؤ گے تو تعلیم کیسے حاصل کرو گے۔ اچھے بچے بڑے شوق سے لڑ حاصل کرتے ہیں۔“

امیر نے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ وہاں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا پڑتا ہوں۔“ عامر نے کہا۔ ”میں بھی نہیں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا تو صرف امیر کے ساتھ کلا گا۔“

”میں بھی جاؤں گی تو عامر کے ساتھ بیٹھ کر پڑھوں گی۔“  
وہ دونوں باری باری ضد کرنے لگے۔ دو ماں باپ کے لاڈلے بچے تھے۔ ہارنا نہ تھا۔

”دونوں بھائی بہن ساتھ کھیلتا اور ساتھ پڑھنا چاہتے ہیں آخر بھائی بہن ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہیں گے اتنی چاہت کسی دوسرے بچے سے نہیں ہوگی۔ ان کی طرف ہے۔ آپ انہیں مجبور نہ کریں کہ یہ دوسروں کو بھی اپنے کھیل میں شریک کیا کریں۔“  
باپ نے انہیں ابا بات دے دی۔ دو پھر ایک ساتھ پڑسنے لکھنے اور کھیلنے لگے۔ بارو برس تک یہ حالت تھی کہ ان کی زندگی کا کوئی بھی لمحہ ایک دوسرے سے رو کر نہیں گزرتا تھا۔ حتیٰ کہ رات کے وقت بھی جس طرح وہ پالنے میں ایک ساتھ سوتے تھے اسی طرح اب بھی ایک بستر پر سوتے تھے۔ بھائی بہن کی یہ محبت سب کے دل میں کھلنے لگی۔ اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہونے والے تھے۔ ان کے دل میں لاکھ پیار کی پاکیزگی سی لیکن جوان ہو کر رات کو ایک بستر پر سونا معیوب سی بات اور اسے تہذیب گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

ماں باپ نے سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور کیا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ درست تھا کہ عامر اور امیر کے دلوں میں محبت کی پاکیزگی تھی اور ان کے درمیان بہن کا مقدس رشتہ تھا۔ اس کے باوجود عمر کے اس دور میں داخل ہونے والے تھے۔

مالی اور بہن کو بھی ایک ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔  
جب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ اسی ڈاکٹر کے پاس گئے جس نے انہیں آپریشن کے ذریعہ الگ کیا تھا۔ ڈاکٹر نے ان کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں پھر ان سے کہل  
”یہ بچے عجوبہ ہیں۔ ایسے بچے جو سینے کی طرف سے جڑے ہوں، بمشکل زندہ رہتے ہیں۔ اکثر آپریشن ناکام رہتے ہیں۔ جب میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تو انہیں ایک دوسرے کے سینے سے لگا دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے ان دونوں بچوں کا ایک ہی دل ہے۔ اس کی دھڑکنیں دونوں کے سینے میں ہیں۔ حقیقت یہ نہیں تھی۔ دونوں کے دل الگ الگ تھے مگر ان کی دھڑکنیں اب تک ایک ہیں۔ ان کا دماغ ایک طرح سے سوچتا ہے۔ ان دنیا کی مسرتوں کو اور دکھ مصیبتوں کو دو ایک ہی وقت میں ایک ہی انداز سے سوچتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اور ایک ہی انداز میں ان کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ایک بخار میں مبتلا ہوتی ہے تو دوسرے کو بخار نہ آئے تب بھی دو تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔“

ان مشاہدات اور تجربات کے پیش نظر ایک جان دو قالب والی بات محض کلمات میں ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ واقعی یہ دونوں ایک جان ہیں جیسے بے الناک کی عمر بڑھتی جائے گی آپ لوگوں کی پریشانیاں بھی بڑھتی جائیں گی۔ اگرچہ یہ دوا معصوم ہیں۔ ان کے دل دماغ میں کہیں گناہ کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اگر آپ نہیں ایک ساتھ رہے اور ایک ساتھ سونے سے رد کیں گے تو ان کے دماغ میں تجسس بڑھ جائے گا کہ انہیں ایک ساتھ رہنے سے کیوں رد کیا جا رہا ہے۔ ابھی تو وہ ایک دوسرے کو محسوس بھی نہیں سمجھ رہے ہیں، آپ لوگوں کی رد کو انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرے گی کہ وہ بھائی مخالف ہیں۔ ہمارے یہاں گناہ کا جو تصور پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ والدین کی دقت ہے دقت کی پابندیاں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں ایک ساتھ سونے کی اجازت دی جائے۔ یہ یقیناً خلافِ تہذیب ہے لیکن انہیں براہِ راحت رد کرنے کی بجائے واسطہ ایسا پابندیاں عائد کی جائیں جنہیں یہ شدت سے محسوس نہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کریں وہ آپ کو بہترین اور قابلِ عمل مشورہ دے گا۔“

ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق انہوں نے ایک بہت ہی مشہور ماہر نفسیات کے خدمات حاصل کیں۔ اس سے یہ طے پایا کہ وہ روز صبح ان کے یہاں آئے گا اور انہیں نفسیاتی تجزیہ کرے گا۔

پہلے دن ماہر نفسیات ان کے یہاں آیا۔ اس وقت عامر اور امیر ایک کمرے میں بستر پر ایک دوسرے سے لپٹے سو رہے تھے۔ ایک کابینہ دوسرے کے سینے سے پالنا تھا جیسے پیدائش کے وقت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر سر سے سینہ ملائے روزِ اوّل کی طرح اپنے وجود اور اپنی زندگی کی حرارت کو دل کی دھڑکن سے سمجھ رہے ہیں اور ایک جسم ہو کر ایک دوسرے کو سمجھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نے قریب آکر ان کے سروں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں پوچھا: "دو دونوں آنکھیں کھول کر اسے موائیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ سینہ غفار بھائی سے بچوں سے کہا۔

"بیٹے یہ تمہارے سنے ماسٹر ہیں۔ یہ روز صبح یہاں آئیں گے اور تم لوگوں سے باتیں کر کے چلے جایا کریں گے۔ وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے اور نئے ماسٹر سے اہانتا منہ ہاتھ دھونے کے لئے چلے گئے۔ ماہر نفسیات خاموشی سے ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک بار دوسرے کے تھے۔ بظاہر نوجوانی کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن عمر کی رفتار تھی کہ وہ اب تب میں جوانی کی انگڑائی لینے ہی واسطے ہیں۔

جب وہ دونوں منہ ہاتھ دھو کر ٹشتے کی میز پر آئے تو ماہر نفسیات نے بھی ہاتھ جو ان کا ہاتھ دیتے ہوئے امیر سے پوچھا۔

"بیٹی یہ عامر تمہارے کون ہیں؟"

امیر نے جواب دیا۔ "یہ میرے پیارے پیارے بھائی جان ہیں۔"

"تو پھر تم عامر کیوں کہتی ہو بھائی جان کیوں نہیں کہتیں؟"

"واہ یہ مجھ سے ایک سیکنڈ کے چھوٹے ہیں نہ ایک سیکنڈ کے بڑے ہیں میں جان کیسے کہوں میں تو عامر کہوں گی۔"

ماہر نفسیات نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں تم دونوں ہم عمر ہو۔ بھائی جان نہ کہنے کے بلکہ یہ تمہارے گئے بھائی ہیں۔ بھائی اور بہن کا رشتہ بہت ہی مقدس ہوتا ہے اور جو رشتہ

ندس ہوتے ہیں اور بہت زیادہ اہم ہوتے ہیں، انہیں ددر سے پوجا جاتا ہے۔ ان کے لئے آنکھوں سے 'زمان سے اور دل کی دھڑکنوں سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تم اس باکے کسی بھی حصے میں کسی بھی گھر میں بھائی بہن کا بے انتہا چار دیکھو گی۔ بہن اپنے الی پر اور بھائی اپنی بہن پر جان تک قربان کر دیتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے گلے میں لگتے۔ دنیا میں رہنے کے لئے دنیا کے اصولوں کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہو مگر اس چاہت کا اظہار اپنی زبان سے راہی آنکھوں سے کرو اور اپنی محبت کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے کام آتے ہو۔ کیا تم وہ نول میری باتیں سمجھ رہے ہو؟"

سار اور امبر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر عامر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔  
"نہیں ماسٹر صاحب آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی جو سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟"  
امبر نے کہا۔ "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے الگ رہنے سے اس دنیا کو کیا لہہ پہنچے گا یا ہم ایک ساتھ سوتے رہے تو کیا قیامت آجائے گی۔ ڈیڈی اور مئی بھی تو ساتھ سوتے ہیں۔"

ان کے والدین جیسنپ کر نظریں چرانے لگے۔ ماہر نفسیات نے انہیں سمجھایا۔  
"بیٹے تمہارے مئی اور ڈیڈی تمہاری طرح آپس میں بھائی بہن نہیں ہیں، میاں کی ہیں۔ جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم دونوں کو بھی اپنی بیوی اور اپنے خاوند کے تھ سونے کی قانونی اجازت ملے گی۔"

امبر نے خوش ہو کر کہا۔ "تو بھائی جان سے سیری شادی کر دیجئے۔ میں ان کی بیوی جاؤں گی یہ میرے میاں بن جائیں گے۔ پھر تو آپ اعتراض نہیں کریں گے نا؟"  
ڈاکٹر خاموشی سے ان معصوم بچوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بارہ برس کے تھے لیکن اب تک نامیں اتنی معصومیت تھی کہ وہ محبت کی پاکیزگی کے سوا کسی اور محبت کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ انہیں اپنی مئی اور اپنے ڈیڈی کی طرح بل ساتھ کیوں نہیں سونا چاہئے۔ ماہر نفسیات انہیں بہت دیر تک بھائی بہن اور میاں کی کے رشتے کا فرق سمجھاتا رہا پھر وہ اسی طرح ردز آتا تھا اور روز سمجھاتا تھا۔ ایک دن

اس نے عامر کو ایک علیحدہ کمرے میں لے جا کر پوچھا۔

”تمہیں امیراتی اچھی کیوں لگتی ہے؟“

”اس لئے کہ میری بہن ہے۔“

”ہاں بہن تو ہے لیکن اس میں ایسی کون سی بات ہے جو تمہیں اس کے قریب پر مجبور کرتی ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس میں کیا بات ہے بس کی چیز کہ وہ میرے قریب رہے۔“

”قریب رہ کر کیا جی چاہتا ہے؟“

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ پکڑوں۔ اسے اپنے سینے سے لگاؤں۔ جب

اپنے آپ کو بہن سے دور رکھتا ہوں تو میرا سارا بدن عجیب طرح سے دکھنے لگتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ میرے اندر سے میری جان نکل کر باہر کھڑی ہو گئی ہے اگر وہ میرے

نہیں آئے گی اور اپنے دل کی دھڑکنیں میرے سینے تک نہیں پہنچائے گی تو میں مر

گا۔“

اس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ہے اور

کے دماغ میں کوئی ایسی غلاظت نہیں ہے جسے دنیا والے ایک جوان عورت اور جوان

کی قربت سے منسوب کرتے ہیں۔

دوسری جانب ایک علیحدہ کمرے میں بیگم غفار سیٹھ نے اپنی بیٹی امیرے پوچھا۔

”بیٹی تم اپنے بھائی کے قریب کیوں رہنا چاہتی ہو؟“

”اس لئے کہ وہ میرے بھائی جان ہیں یعنی میری جان کے بھائی ہیں۔“

”لیکن پھر یعنی یہ مناسب نہیں ہے کہ تم دونوں اتنی چاہت سے ایک دوسرے

قریب رہو۔ آج سے تم دونوں الگ الگ کمرے میں سویا کرو گے۔“

”مئی میں مرجاؤں گی۔ آپ مجھے میرے بھائی جان سے کیوں چھڑانا چاہتی ہیں؟“

نے تو کہا تھا کہ ہم ابھی جس طرح سوتے ہیں اسی طرح پیدا بھی ہوئے تھے آپ

ہمیں اس طرح کیوں پیدا کیا تھا؟“

میں بوکھلا کر لاجواب ہو گئی۔ پھر وہ بولی۔



”بیٹی کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں لے جان بوجھ کر تو پیدا نہیں کیا۔ ایسا تو قدرت کو

منظور تھا۔“

امبر نے کہا۔ ”قدرت کو جو منظور تھا وہ آپ نے کیا۔ قدرت کو جو اب بھی منظور ہے اس سے آپ انکار کیوں کرتی ہیں؟ آپ کی قسم، مئی میں لے آپ کے سمجھانے پر حتی الامکان کوشش کی تھی کہ عامر سے دور رہوں مگر چند گھنٹوں سے زیادہ دور نہ رہ سکی۔ اس دوران مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری سانسیں رک گئی ہوں اور دل اپنی دھڑکنیں بولتا جا رہا ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی مئی کہ میں عامر کے بغیر کیا ہوں ہم دونوں ایک ہی جسم کے دو حصے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتے۔“

ماں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب رہنے کے باوجود دنیا کے انتہائی معصوم انسان تھے۔ اب ان کی معصومیت پر شبہ کرتے ہوئے بڑوں کو شرم آتی تھی۔

اس رات انہوں نے یہ کیا کہ عامر اور امبر کو وایسے مختلف کمروں میں سلایا جن کی درمیانی دیوار میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے ایک طرف عامر کا بستر تھا اور دوسری طرف امبر کا۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے دور نہیں تھے اپنے اپنے بستر پر سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور نیند آنے تک باتیں کر سکتے تھے۔ کھڑکی میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔

دوسری صبح ماں باپ نے آکر دیکھا کہ وہ دونوں اپنے اپنے بستر پر کھڑکی سے لگے بیٹھے تھے۔ اہنی جالی کے پار انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور بیٹھے ہی بیٹھے سو گئے تھے۔ ان کے خوابیدہ چہروں سے ایسی معصومیت ٹپک رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مگر ماں باپ بھی کیا کرتے دنیا کے دستور سے مجبور تھے، اپنے بچوں کی معصومیت کی قسمیں کھا سکتے تھے۔ اس کے باوجود دنیا والوں کو ان کے پیار کی پاکیزگی کا یقین نہیں دلا سکتے تھے۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگے ہوئے اور ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے پیدا ہوئے تھے تو وہ اس ہم آغوشی کے ساتھ گناہ کا کوئی تصور لے کر اس دنیا میں نہیں آئے تھے اور اب تک ان کے اندر گناہ کے کسی نیال نے چٹکی نہیں لی تھی۔ آج

بھی وہ انسان سے زیادہ فرشتے نظر آتے تھے مگر دنیا کو کون سمجھائے؟

بچوں کو سمجھاتے سمجھاتے ماں باپ بوڑھے اور بچے جوان ہو گئے۔ عامر نے جوانی  
ابتدا ہی میں ایک قد آور گہرہ جوان کی طرح قد نکالا تھا، امیر قیامت کا شباب سلاخی  
باپ کا دل دھلا رہی تھی۔ ایسے وقت انہوں نے دوسری تدبیر کی، اپنے قریبی رشتے داروں  
میں بھٹے جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں انہیں اپنے یہاں بلایا۔ سینہ غفار بھائی اسے  
مند تھے کہ تمام رشتے دار ان کے آگے بچھے رہتے تھے۔ ہر ماں باپ کی یہ خواہش تھی  
ان کے بیٹے سے امیر کی شادی ہو جائے اور ان کی بیٹی عامر کی ولین بن جائے۔ غفار  
اور ڈیڈی تھے سیٹھ غفار بھائی نے ان کے کالوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ غفار  
جو لڑکا امیر کا دل بیت لے گا اور جو لڑکی عامر کو اپنی طرف مائل کرنے گی ان کے ہاتھوں  
اپنے دونوں بچوں کا رشتہ کر دیں گے۔ اس انعامی مقابلے کی وجہ سے تمام رشتے دار  
کے درمیان رس کشی شروع ہو گئی۔ ایک طرف نو جوان لڑکے امیر کا دل جیتنے کے  
عشق و محبت کے نئے نئے تماشے دکھانے لگے۔ دوسری طرف حسین و شیراز میں  
ادائیں دکھا دکھا کر عامر کو لہانے کی کوشش کرنے لگیں۔ صرف اتنا ہی نہیں ان لڑکے  
لڑکیوں کے بوڑھے والدین بھی تھے جو صبح سے شام تک ٹوٹوٹ میں کرتے رہتے تھے  
اپنے اپنے بچوں کی خوبیاں بیان کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ عامر اور  
عامر کا رشتہ انہی کے بچوں سے ہو سکتا ہے۔ سینہ غفار بھائی کی عالیشان کوٹھی مچھلی بازار پر  
تھی۔ ہر وقت کبھی قشقوں کی اور کبھی لڑائی جھگڑوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔  
غفار بھائی تنگ آکر رشتہ واردوں کو چھانٹنے لگے جو ناپسند اور ناقابل برداشت تھے  
ایک ایک کر کے کوٹھی سے رخصت کر دیا۔ جوان لڑکوں میں سے صرف ایک احمد  
جس سے امیر کبھی کبھی دلچسپی لیتی تھی۔ دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ احمد زندہ دل تھا اور  
نئے نئے لطیفے سنا کر اسے ہنساتا رہتا تھا لیکن ایسے وقت بھی وہ عامر کے ساتھ بیٹھ کر  
تھی۔ ماں باپ کے لئے یہی نصیحت تھا کہ امیر عامر کے علاوہ احمد کو بھی کسی حد تک  
کرنے لگی تھی۔

عامر بھی کسی حد تک شاذ یہ کو پسند کرنے لگا تھا۔ پسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ غفار  
نفسیات کی طالبہ تھی اور عامر کے پاس بیٹھ کر زیادہ تر امیر کی باتیں کرتی تھی جو لڑکی

من کی باتیں کرے اور تعریفیں کرے بھلا وہ اسے کیوں نہ پسند کرتا۔ ماں باپ نے فیصلہ لیا کہ عامر اور شازیہ اور امیر اور احمر کی شادی جلد ہی کرو دی جائے۔ ماہر نفسیات نے یہی انہیں یہی مشورہ دیا کہ امیر نے اب تک اپنے بھائی کے سوا کسی دوسرے مرد کی محبت کو نہیں سمجھا ہے۔ یہی عامر کا ہے اسے بھی شازیہ کے روپ میں ایک چمکنے والے گانے نے جذبہ اور نئی محبت سے آگاہی ہوگی۔ پھر عامر کو شازیہ سے اور امیر کو احمر سے اتنی بات اور دلچسپی پیدا ہو جائے گی کہ اس کے بعد بھائی اور بہن کی محبت صرف رسمی طور پر اُم رہے گی۔ شادی کے بعد مرد اور عورت کی دنیا بدل جاتی ہے وہ دونوں بھی اپنی پرانی بات سے نکل کر ایک نئی دنیا میں جا بیٹھیں گے۔

جب شادی کا اعلان ہوا تو امیر اور عامر بوکھلا گئے۔ امیر نے اپنی ماں کے پاس آکر بچھا۔

”یہ شادی کیوں ضروری ہے؟ اس طرح تو میں احمر کے گھر چلی جاؤں گی۔ کیا عامر میرے ساتھ جائے گا؟“

”اے لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ سسرال نہیں بلایا کرتے۔“

”تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔“

”نئی جوان ہو جائے تو اسے گھر میں بیٹھا کر نہیں رکھتے۔ دنیا کے دستور کے مطابق اس شادی کرنی ہوگی اور اپنے سسرال جا کر رہنا ہوگا۔“

وہ پاؤں میچ کر بولی۔ ”میں شادی نہیں کروں گی۔ کروں گی تو عامر کو چھوڑ کر نہیں دے گی۔“

دوسری طرف عامر نے بھی ماہر نفسیات سے کہا۔

”میں امیر کی شادی نہیں ہونے دوں گا۔ اگر شادی ہو بھی گئی تو میں اسے اس گھر سے جانے نہیں دوں گا۔“

گھر کے سب لوگ پریشان ہو گئے۔ بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی انہیں اس بات کا ذرا کہ ان کے رشتوں کی وجہ سے امیر، احمر اور عامر شازیہ سے نفرت نہ کرنے لگے۔ صبح سے شام تک سر جوڑ کر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شادی تو ضرور ہوگی لیکن امیر نصرت ہو کر اس گھر سے نہیں جائے گی بلکہ احمر گھر والوں بن کر وہاں رہے گا۔ اسی طرح

دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے قریب رہیں گے اور اپنے شوہر اور اپنی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاریں گے۔ ان دونوں بھائی بہنوں کو شازیہ اور احمر سے اتنی دلچسپی ہو جائے گی کہ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سونے کی ضد چھوڑ دیں گے۔ عامر اور امبر کو بزرگوں کا فیصلہ پسند آیا کہ شادی کے بعد وہ ای گھر میں رہیں اور یہ شادی بھائی بہن کی محبت میں حائل نہیں ہوگی۔

ان کی رضاعندی حاصل ہوتے ہی بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جو رشتے دار امبر کو بہنوئی بنانے اور عامر کو داماد بنانے میں ناکام رہے تھے وہ اندازاً اندر جل بھن رہے تھے اور اب بھی اس فکر میں تھے کہ کسی طرح سیٹھ غفار بھائی کا دل بدل جائے۔ ناکام ہونے والے نوجوان امبر کے لئے آپس بھر رہے تھے اور ناکام ہو کر والی لڑکیاں شازیہ کی خوش قسمتی پر رشک کر رہی تھیں۔

شادی سے ہفتوں پہلے ہی عامر اور امبر کو سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ علیحدہ کمرہ سوا کریں گے ورنہ یہ رشتے دار ذرا سی بات کا ہتکڑ بنا دیں گے لیکن وہ پھر انہی کمرہ اپنی کچھ راتیں گزارنے لگے جس کی درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی تھی اور وہ کھڑکی کے پار ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیٹھے ہی بیٹھے موجود تھے۔ دروازے اندر سے بند ہوتے تھے کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوتے تھے اس لئے وہاں آنے والے رشتے داروں کو یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کس انداز میں مومتے ہیں۔

لیکن شادی سے ایک دن پہلے ایک رات زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ پتہ نہیں چل سونے سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ یا وہ شخص کسی دوسری سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ بہر حال اسے اندر آنے کا موقع مل گیا۔ وہ سیارچہ اور سیارہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر فلیٹ بیٹ تھی جس کا انگا حصہ اس کے چہرہ جھکا ہوا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں ریوالور تھامے دے قدموں سے چلتا ہوا امبر کے کمرے قریب آیا امبر بستر پر سونے کی بجائے کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے دوسری طرف عامر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور وہ دونوں آہنی جالی سے سر جکے بے خبر سو رہے تھے۔

اس شخص نے اس کمرے کے دروازے کو دیکھا تو باہر لان کی طرف کھلا تھا۔

نے پہلے دروازے کو کھول دیا تاکہ فرار ہونے میں آسانی ہو۔ دروازہ کھولنے کے بعد امبر نے پاس لیا۔ اس نے اپنا پایاں ہاتھ بڑھا کر بڑی آہستگی سے امبر کا ہاتھ عامر سے الگ کیا۔ برنید میں کسمائی دوسری طرف عامر بھی کسمانے لگا۔ جب اس شخص نے امبر کے منہ ہاتھ رکھ کر مہتر سے اپنی طرف کھینچا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ کو اتنی سختی سے دبایا گیا تھا کہ وہ چیخ نہیں سکتی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ دونوں بھائی بہن کا جسم ایک نظام کے تحت بنایا گیا ہے کیونکہ امبر کی آنکھ کھلتے ہی عامر کی آنکھ بھی کھل گئی پہلے تو مانے پریشان ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھا بس کی گرفت سے بہن کا ہاتھ نکل گیا تھا۔ پھر اس نے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا تو کھڑکی کے اس پار کوئی شخص اس کی بہن کی گردن کا ہاتھ ڈالنے اے کھینچنے لئے جا رہا تھا۔

اس نے لٹکار کر کہا۔ ”خبردار رک جاؤ۔“

اس کی لٹکار سننے ہی اس شخص نے ناز کر دیا۔ گولی عامر کے بازو کو چھیدتی ہوئی نکل لی۔ عامر کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی امبر بھی اپنا بازو پکڑ کر چیخنے لگی۔ شخص ہوائی فائر کرتا ہوا اور امبر کو کھینچتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر تمام کوٹھی میں ہلچل مچ گئی۔ عورتیں سہم کر چیخنے لگیں۔ مرد داز کی سمت دوڑتے ہوئے آئے لیکن اس وقت تک پورچ سے ایک کار اشارت ہو کر اسٹے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ امبر کی چیخیں سمی نے سنی تھیں۔ آخر تیزی سے دوسری کار آ کر بیٹھا گاڑی اشارت کی اور تیزی سے اسے ڈرائیو کرتا ہوا اس کار کے پیچھے چلا گیا۔

عامر اپنا خون آلود بازو تھامے لڑکھڑاتا ہوا اور امبر کو پکارتا ہوا کوٹھی سے باہر آیا۔ وہ دم کا تعاقب کرنا چاہتا تھا لیکن گولی کا زخم ایسا تھا کہ باہر آتے ہی گر کر بے ہوش ہو گیا۔ دوسری طرف کار کی پچھلی سیٹ پر امبر اپنا بازو تھامے تکلیف سے کرا رہی تھی۔ مجرم نے غما کر کہا۔

”میں تمہیں پھول کی طرح اٹھا کر لایا ہوں، تمہیں ذرا تکلیف نہیں پہنچائی پھر یہ بازو نام کر کیوں کرا رہی ہو؟“

وہ جواب دینے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئی کیونکہ اس وقت عامر بھی کوٹھی سے

باہر آکر بے ہوش ہو گیا تھا امبر کو اٹھا کر لے جانے والا مشکل میں پڑ گیا تھا۔ جب وہ اڑے پر آیا تو بے ہوش لڑکی کو بازوؤں میں اٹھا کر اپنے کمرے تک لے جاتا تھا۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو کر بے ہوشی کا بہانہ کر رہی ہے۔ آزمائش کے طور پر اس نے زور کی چنگی لی لیکن امبر پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ پانی لا کر اس کے چہرے پر دہا۔ پھر بھی اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ جو گولی عامر نے اس کے ورد کی ٹیسس امبر کے بازو سے بھی اٹھ رہی ہیں۔ عامر یقیناً بے ہوش ہے اس سے یہ بھی ہوش میں نہیں ہے۔

اسے لانے والا اس کا ایک کزن تھا۔ اپنی ناکامی سے جھلا کر اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ جو لڑکی محبت سے حاصل نہیں ہوتی اسے جبراً حاصل کیا جائے۔ اس نے سوچا کہ اسے اٹھا کر لائے گا، اسے شادی کے لئے مجبور کرے گا اگر وہ نہیں مانے گی تو ہمارے مہینوں اس کی عزت سے کھیلتا رہے گا۔ جب عورت اپنا سب کچھ ایک عرو کی آغوش میں لٹا دیتی ہے تو پھر رفتہ رفتہ اس کے آگے جھکنے لگتی ہے اور اسی کو اپنا سب کچھ کو شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جب اس سے شادی ہو جائے گی تو وہ سیٹھ غلام محمد کو داماد بن جائے گا۔ بیٹی کے سہاگ کی خاطر وہ اس کا قصور معاف کر دیں گے اور پھر اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے اور وہ کروڑوں کی جائیداد میں سے آدمی جائیداد کا مالک بن جائے گا۔

اس نے اپنی دانست میں زیروست پلاننگ کی تھی لیکن امبر کی بے ہوشی اور پلاننگ کے مطابق اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ اسے ہوش میں لانا تمام تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں۔ چونکہ وہ امبر کا کزن تھا اس لئے اس کی پیدائش سے کر اب تک اس کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بہن سوتی ہو جائے گی یا نہ ہو جائے گی۔ بھائی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہن بھی اس تکلیف سے بڑھتی ہے۔ جب ایک شخص کے بعد امبر کو ہوش آیا تو اس کے کزن نے سمجھ لیا کہ دوسری طرف اس کی بھی مرہم پٹی ہو چکی ہے اور اسے ہوش آ گیا ہے اور اب تھوڑی دیر میں امبر کرنے کے قابل ہو جائے گی لیکن وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی اپنے بازو پر ہاتھ بٹے چینی کا اظہار کرتی رہی۔ اس کے کزن نے کہا۔

”امبر میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ تم ولسن ن کراہر کی آغوش میں جاؤ۔ میں تمہیں اس طرح اٹھا لایا ہوں تو اسے میری زیادتی نہ سمجھو۔ یہ بھی میری محبت کا ثبوت ہے۔“

امبر اپنے بازو کی تکلیف سے بے چین تھی، اس کی باتیں سن رہی تھی نہ اسے جواب دے رہی تھی۔ بار بار حاصر کا نام لے رہی تھی اور کراہتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس کے کزن نے پریشان ہو کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”دیکھو امبر اس وقت نہ موتا۔ میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتا ہوں اسے پیچھے ہی تمہاری ٹینڈر اڑ جائے گی۔“

وہ دڑڑاتا ہوا کچن کی طرف گیا اور جلدی جلدی کٹنی تیار کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سب لوگ امبر کے لئے پریشان ہوں گے۔ تھانوں میں رپورٹ درج کرا دی گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی طرح سراغ لگا کر وہاں تک پہنچ جائے۔ اس سے پہلے ہی وہ امبر کا دل جیت لینا چاہتا تھا۔ اپنے جرم کو تابی معافی بنانے کے لئے امبر کی حمایت لازمی تھی۔

جب وہ کٹنی کی پیالی لے کر کمرے میں آیا تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ تب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اب اسے لاکھ جھنجھوڑ کر اٹھاؤ، وہ نہیں اٹھے گی۔ اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا اس سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اسے عامر کو گولی نہیں چلائی چاہئے تھی۔ وہ کوئی سنگین جرم نہیں کرنا چاہتا تھا وہ صرف امبر کو دھمکی دینے کے لئے ریوالور اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن اس نے بوکھلاہٹ میں عامر پر گولی تھڑا دلی بعد میں خیال آیا کہ اسے ہوائی فائر کرنا چاہئے تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ عامر کو گولی لگے گی تو امبر بھی تکلیف میں مبتلا ہو کر اس کے منصوبوں کو ناکام بنا دے گی۔ اب تو یہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ صبح تک اس کے پاس بیٹھا رہے اور اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہے۔

لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی پولیس نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا، امرجو اس کے تعاقب میں آیا تھا اس نے وہ جگہ دیکھ لی تھی اور پولیس کی مدد لے کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ صرف رات بھر کا ہنگامہ تھا امیر چند شخصوں کے لئے اغوا کی گئی اور پھر اسے کر لیا گیا۔ دوسرے دن احمر کے سامنے امیر کا نکاح پڑھایا جاسکتا تھا لیکن عامر زخمی فوجی لئے جڑواں بہن کے رشتے سے وہ بھی زخمی تھی اس لئے عامر کا زخم اچھا ہوتا۔ شادی ملتوی کر دی گئی۔

عامر اسپتال میں تھا۔ امیر ضد کرنے لگی کہ وہ بھی ہسپتال جائے گی لیکن ماں باپ دونوں بھائی بہن کو اسپتال میں رہنے کی اجازت دے کر وینا والوں کے سامنے تھانہ بنا چاہتے تھے۔ انہیں تھوڑی دیر کے لئے یہ خوشیاں حاصل ہوئی تھیں کہ عامر اور بہن کی شادی جو بجائی گئی تو بھائی بہن کے ساتھ رہنے والی سادہ ختم ہو جائے گی لیکن اب نامعلوم مدت تک کے لئے ان کی خوشیاں برباد ہو گئیں۔ وہ عامر کو اسپتال سے گھر لائے۔

دونوں بھائی بہن ایک ہی تکلیف میں مبتلا تھے اس لئے اب وہ الگ الگ کمرے میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ ان کی ضد دیکھ کر گھر میں آئے ہوئے رشتے وار طرح طرح کی بات کرنے لگے۔ انہیں بدنام کرنے کا موقع مل گیا کہ جوان بہن بھائی ایک کمرے میں کیوں رہتے ہیں اور ایک بستر پر کیوں سوتے ہیں؟ ماں باپ نے بات بتانے کی کوشش کی کہ ہم ہمیشہ نہیں ہوتا چونکہ یہ دونوں ایک ہی تکلیف میں مبتلا ہیں اس لئے ایک دوسرے سے قریب رہنا چاہتے ہیں لیکن ان کے جواب سے دوسروں کی تسلی نہ ہوئی۔ بہت سے رشتے وار لعن طعن کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

عامر اور امیر اب نادان بچے نہیں تھے۔ وہ نیکی اور بدی کا فرق سمجھتے تھے۔ امیر اس ہو کر کہتا۔

”عامر یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے تمہارا ساتھ ایک بستر پر نہیں رہنا چاہئے مگر تم ہی بتاؤ میں تم سے دور کیسے جاسکتی ہوں؟“

”میری تو مجبوری ہے۔ میں بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا ہم تو ہزار بار کوشش کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں ہم اپنے آپ پر قابو کیوں نہیں پاسکتے۔ ہمارے اندر سے کوئی چیز نہیں آ رہی۔ دوسرے کی طرف کھینچتی ہے ہم کیسے کہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

امیر نے کہا۔ ”اس ڈاکٹر نے ہمیں آپریشن کے ذریعہ الگ کر کے ہم پر ظلم کیا۔“



اس نے سوچا تھا کہ ہمارا جسم الگ ہو جائے گا تو ہماری روحمیں بھی الگ ہو جائیں گی کیا دنیا کا کوئی ڈاکٹر ہماری روحوں کا آپریشن کر سکتا ہے؟

”نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں کی روحمیں ہمیں روزِ ازل کی طرف واپس بلا رہی ہیں۔ ہمارے خالق نے ہمیں ایک ہی مٹی سے جوڑ کر بنایا ہے، لیکن بنانے والا صرف مٹی سے بنا کر تو نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ جسموں کی طرح روحوں کو بھی جوڑتا ہے۔ جذیوں کو بھی جوڑتا ہے۔ اگر ہمارا اس طرح لپٹ کر رہنا کوئی جرم ہوتا، کوئی گناہ ہوتا تو وہ بنانے والا کبھی اس طرح بنا کر ہمیں پیدا نہ کرتا۔“

امبر نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اس دنیا میں محبت روح کی پاکیزگی سے نہیں سمجھی جاتی۔ مرد اور عورت کے جسمانی اتصال سے سمجھی اور پرکھی جاتی ہے۔ اس دنیا میں جتنے جوان مرد ہیں اور جتنی جوان عورتیں ہیں وہ سب جسم کی پیاس بجھانے کے لئے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا جسم تو پیاسا نہیں ہے البتہ ہماری ردحمیں پیاسی ہیں۔ کیا یہ دنیا والے ہمارے پاکیزہ خیالات کو سمجھ کر ہمیں معاف نہیں کر سکتے۔ ہمیں ایک ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر یہ ہماری معصومیت پر یقین کر لیں گے تو ان کا کیا بگڑ جائے گا؟“

حاضر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”چونکہ اس دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گناہ کی سیاہی پھیلی ہوئی ہے اور بھائی بہن کا مقدس رشتہ بھی اس لپیٹ میں آگیا ہے اس لئے اب کوئی ہماری معصومیت کا یقین نہیں کرے گا۔“

وہ دونوں باتیں کرتے رہے، سوچتے رہے اور اس دنیا میں پیدا ہونے پر کڑبھتے رہے۔ ایک ماہ بعد عامر کے بازو کا زخم اچھا ہو گیا، امبر بھی صحت یاب ہو گئی۔ بہت سے دشتے دار اب بھی گھر میں موجود تھے۔ اس لئے سیٹھ غفار بھائی اور ان کی بیگم نے ٹکٹات سے کام نہیں لیا، فوراً ہی ان کا نکاح پڑھا دیا۔ اس گھر سے نہ کسی دلہن کی رخصتی ہوئی اور نہ ہی کوئی ولہن بہو بن کر آئی۔ لڑکے لڑکیاں بھی گھر میں نہیں دین انہیں دولہا دلہن بنا دیا گیا۔ جب رات آئی اور امبر کو سہاگ کی تیج پر بٹھا دیا گیا تو وہ گھونگھڑا اٹھا کر اپنے دولہا کی بجائے عامر کو تلاش کرنے لگی۔ عامر دوسرے کمرے کے باہر بے چینی سے ٹپل رہا تھا۔ اس دوسرے کمرے میں شازیہ ولہن بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نئی لوب

دلہن کو اپنے عامر کا انتظار تھا لیکن عامر باہر ٹھٹھا ہوا بڑی بے چینی سے اس کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں امبر کو پہنچا دیا گیا تھا۔

جب امبر کے کمرے میں جانے لگا تو عامر نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک دیا۔  
ہوئے کہا۔

”امبر بھائی آپ کی بہن اس کمرے میں ہے آپ کو وہاں جانا چاہیے۔“

امبر نے بھنا کر کہا۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو۔ مجھے میری بہن شہناز کے کمرے میں بھیجنا چاہیے؟“

سیٹھ غفار بھائی اور ان کی بیگم دونوں ہی سمجھتے تھے کہ سہاگ کی رات بھی وہاں بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی ضد کریں گے۔ جب انہوں نے عامر کو امبر کے کمرے میں لے کر دیکھا تو جلدی سے ان کے پاس آئے سیٹھ غفار بھائی نے عامر کو ایک طرف کھینچ کر لے جاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے ہم بدنام ہو جائیں۔“

عامر نے کہا۔ ”ڈیڈی آپ نے ہمیں یہ تو نہیں بتایا تھا کہ شادی کے بعد امبر کو الگ کر دیا جائے گا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ وہ اسی گھر میں رہے گی۔ اب وہ اس گھر سے ہے تو مجھے اس سے دور کیوں رکھا جا رہا ہے؟“

سیٹھ غفار بھائی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”بیٹے میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں؟ اس میں میں صبر کے لحاظ سے محبت اور جذبے بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن سے جوانی تک انسان کی محبت بہن کی محبت سے بدلتی ہے۔ جوانی میں جذبات بدلتے ہیں وہاں سے میاں بیوی کی محبت شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد بڑھاپے تک انسان کو اولاد کی محبت زندہ رکھتی ہے۔ تم نادان نہیں ہو تمہیں ان بدلتے ہوئے جذباتوں اور رشتوں کو سمجھنا چاہئے اور انہیں تسلیم کرنا چاہئے۔“

باتیں کرتے ہوئے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اسے اس کمرے تک لائے جہاں شہناز دلہن بنی بیٹھی تھی۔ پھر باپ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”بیٹے آج اپنے بوڑھے باپ کی بات مان لو، اپنی ضد کو بھول جاؤ اور خدا کے لئے اس کمرے میں چلے جاؤ۔“

کہہ کر انہوں نے عامر کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ دوپٹ کر واپس آئے۔ انہوں نے دروازے کو بند کر کے باہر سے لاک کر

دیا۔ اندر سے عامر نے دروازے کو دو چار جھٹکے دے کر کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ کھلا پھر وہ مایوس ہو کر اپنی دلہن کی طرف دیکھنے لگا۔ دلہن بھی گھونگھٹ اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ کسی حد تک اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ دونوں بھائی بہن باہر کیا تماشے کر رہے ہیں۔ اس وقت بھی عامر جبراً اس کمرے میں بھیجا گیا ہے۔ یہ اس کے لئے بڑے دکھ کی بات تھی کہ دولہا اس کی آرزو نے کر اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ دیسے شادی شادی سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ عامر کو زبردستی اپنی طرف مائل کرنا ہو گا۔ ساگ رات کو جو رخصت دولہا ادا کرتے ہیں وہی فرض اسے دلہن بن کر نبھانا ہو گا۔ اس لئے اس نے ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنا گھونگھٹ خود ہی اٹھالیا پھر پھولوں کی بیج سے اتر کر اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

”عامر آؤ۔ یہاں بیٹھو میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“  
دو اس کا ہاتھ پکڑ کر بیچ کی طرف لے جانے لگی۔ عامر نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔  
”شادی میں اس کمرے میں نہیں رہ سکتا۔ تم نہیں جانتیں تمہارا بھائی احمر میری کن کے کمرے میں گیا ہے میں یہاں سکون سے بیٹھ رہ سکوں گا وہ اپنے کمرے میں میرا نظارہ کر رہی ہو گی۔ میں نہیں جاؤں گا تو روئے لگے گی۔“

شادی نے اسے سمجھایا۔ ”عامر یہ رات کسی بھی دلہن کے روئے کے لئے نہیں ہے۔ آج کی رات وہ میکے کی تمام محبتوں کو بھول کر صرف ایک مرد کی آغوش میں سرسری لاش کرتی ہے۔ امیر بھی آج نہیں روئے گی۔ احمر اسے اتنی خوشیاں دے گا کہ آج کی رات دو تہیں بھڑا بھول جائے گی۔“

”نہیں سرسری دنیا مجھے بھول سکتی ہے لیکن امیر کسی بھی لمحہ مجھے نہیں بھلا سکتی۔ تم لگا باتیں کیوں کرتی ہو پہلے تو تم امیر کی حمایت میں خوب بولتی تھیں۔“

”میں اب بھی اس کی حمایت کرتی ہوں۔ وہ تمہاری بہت اچھی بہن ہے تم میری مت مانو آؤ آؤ کے طور پر صبح تک صبر کر لو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ امیر نے رات

بھر تمہیں یاد نہیں کیا ہے۔“

”اچھی بات ہے میں صبح تک صبر کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔“

”شازیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”شرط یہ ہے کہ صبح تک تم مجھ سے امبر کی باتیں کرتی رہو۔ شازیہ کو یہ بات بہت بری لگی پھر بھی اس نے برداشت کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے سناگ رات اس لئے نہیں ہوتی کہ نئی نویلی دلمن اپنے ہاتھ

اور اپنی خوشیوں کو بھول کر تمہاری بہن کی باتیں کرتی رہے۔ تم مجھے پتھر کی سوار سمجھو عامر! دیکھو تمہارے قریب میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ مقصد یہ تھا کہ مامی

نے بدن کی حرارت سے آشنا ہو جائے۔ عامر تھوڑی دیر تک اس کے زرخیز سینے پر رکھے اس کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ ہٹا کر کہا۔

”ہاں امبر کا دل بھی اسی طرح دھڑکتا ہے۔“

شازیہ اک دم سے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کجخت اس کی جذباتی دھڑکنوں

بھی بہن کی پاکیزہ محبت سے منسوب کر رہا تھا، لیکن شازیہ بھی ہار ماننے والی نہ تھی۔ اس نے اسے دھکا دے کر سچ پر بٹھایا، پھر خود اس کے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔

”اچھی بات ہے میں صبح تک تمہاری بہن کے متعلق گفتگو کروں گی، لیکن میرنا!

یہ شرط ہے کہ میں جو کتنی جاؤں تم اس پر عمل کرتے رہو۔“

”مجھے اپنی بہن کی باتیں سنانے کے لئے اگر تم زہر بھی پینے کے لئے کوئی ذرہ

انکار نہیں کروں گا تم جو کوئی میں اس پر عمل کروں گا۔“

شازیہ نے کہا۔ ”امبر اتنی خوبصورت ہے کہ اس کی خوبصورتی کی مثال نہیں ملتی

میرا یہ گھونگھٹ اتار کر ایک طرف رکھ دو۔“

عامر نے بڑی خوشی سے اس کا گھونگھٹ اتار اور سرہانے رکھ دیا۔ پھر شازیہ

کہا۔

”تم دونوں بھائی بہن آپس میں اتنی شدید محبت کرتے ہو کہ اس محبت کی مثال

کہیں نہیں ملتی۔ یہ زیور بوجھ لگ رہے ہیں انہیں بھی اتار دو۔“

عامر ایک ایک کر کے اس کے زیورات اتارنے لگا۔ پہلے اس کی نتھ اتار دی، پھر ماتھے کا جھومر اتار دیا۔ کانوں سے جھمکے الگ کئے پھر اس کی گوری اجلی گردن سے ہار اتارنے لگا۔ اس دوران اس کے ہاتھ اس کی ناک کو چھوتے رہے کبھی شفق رنگ رخساروں پر پھیلتے رہے۔ کبھی اس کی انگلیاں گردن کے صلیج خم پر سرسراتی رہیں۔ شازیہ کی آنکھوں میں نشہ چھانے لگا۔

عامر نے کہا۔ ”تم ولین بن کر بہت اچھی لگ رہی ہو لیکن امیر تو اس روپ میں گزرا لگ رہی ہوگی۔“

ایک ایک شازیہ کی آنکھوں سے نشہ اڑ گیا۔ اس نے دانت کچکا کچکا کر عامر کی طرف دیکھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس کا منہ نوچ لے لیکن عامر کی صورت دیکھ کر وہ پھر نرم پڑ گئی۔ وہ سچ سچ اسے دل و جان سے چاہتی تھی اور اسے اپنا لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی، اس نے اپنی بائیں اپنے ٹانوں دو لہا کی گردن میں ڈال کر کہا۔

”تم زیورات اتارنے کے دوران مجھے کتنی دیر تک چھوتے رہے ہو۔ کیا تمہارے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ کیا میرا یہ حسن اور میرے بدن کی یہ ملائکت تمہیں اچھی نہیں لگتی؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”ہاں تم اچھی لگتی ہو تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں بار بار چھو کر دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔“

وہ خوش ہو کر اس سے پٹ لگئی۔ پھر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتی ہوئی بولی۔

”تمہیں روکنا کون ہے۔ تم ایک بار میں ہزار بار مجھے چھو کر دیکھو۔ دیکھو میری آنکھوں میں دیکھو میرے عامر مجھے پیار کر دو۔“

عامر چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس نے جھک کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ شازیہ نے تڑپ کر کہا۔

”پیشانی کو نہیں سامر میرے ہونٹ چاہے ہیں اپنے ہونٹوں سے ان کی پیاس بجھا دو۔“

عامر نے ہنسی کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں..... نہیں ہونٹوں کو چومنا تو گندی بات ہے۔“  
میں تو ہمیشہ امبر کی پیشانی کو چومتا ہوں۔“

وہ ایک دم سے زخمی شیرنی کی طرح بھڑک اٹھی۔ عامر کے سر کے بالوں کو دونوں طرف سے جکڑ کر زور زور سے جھٹکا دیتی ہوئی بولی۔

”کیا تم مجھے اپنی بہن سمجھ کر یہاں آئے ہو۔ کیا تم بیوی اور بہن کا فرق بھی نہ جانتے؟ تم آدمی نہیں پتھر ہو، اور ایک پتھر جیسی بہن سے چپک کر رہنا چاہتے ہو لیکن پتھر گوشت پوخت کی عورت ہوں۔ میرے سینے میں دل ہے اور یہ دل اپنے شوہر کی طرف سے لے لے کر تڑپتا ہے ترستا ہے۔ میں تمہاری پیاسی ہوں عامر تمہاری پیاسی ہوں تمہیں بازو پیاس بجھائی ہوگی۔“

وہ ہنسی انداز میں چیخ رہی تھی۔ کبھی اس کے ہل نوحہ رہی تھی، کبھی اس کے کپڑے پھاڑ رہی تھی۔ عامر بار بار اسے دھکے دے کر الگ کر رہا تھا۔ ادھر شازبہ اپنے ہاتھوں سے نوحہ کھسوت کر رہی تھی۔ ادھر دوسرے کمرے میں امبر چیختی ہوئی کہہ رہی تھی کہ کوئی اس کے چہرے کو نوحہ کھسوت رہا ہے اس کو ٹھنی کے دو کمروں میں اچھا لگا رہا ہے۔ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ دونوں والدین کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے اپنے کمروں سے نکلے۔ امبر بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ سیٹھ غفار بھائی نے شازبہ کی چیخ سن کر اس کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا۔ اور پھر مب ایک ساتھ اونچی آوازوں میں اپنی باتیں سناتے لگے۔ تب ایک ساتھ بول رہے تھے اس لئے کسی کی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ سیٹھ غفار بھائی نے کہا کہ وہ مب ڈرائنگ روم میں چلیں اور دہل اٹھیں۔ سے بیٹھ کر اپنی شکایتیں سنائیں۔

ان کی ہدایات کے مطابق وہ سب ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ سیٹھ غفار بھائی نے جب سے پہلے اپنی جو شازبہ سے پوچھا۔  
”بیٹی تم بتاؤ تم کیوں چیخ رہی تھیں۔ کیا عامر نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے؟“  
وہ جواب میں سر جھکا کر نظریں چرانے لگی۔ سماگ کے کمرے میں جو کچھ بھی ہوا اسے وہ زبان سے دہراتے ہوئے شرا رہی تھی۔ سیٹھ غفار بھائی نے گھور کر عامر کو دیکھا اس نے کہا۔

”ڈیڈی محبت ایک پاکیزہ جذبے کا نام ہے۔ جب مجھے امبر پر بہت زیادہ پیار آتا ہے میں اس کی پیشانی کو چومتا ہوں۔ وہ پیشانی جو سجدہ کرتی ہے اسے چوما جائے تو محبت کی بڑی برقرار رہتی ہے مگر آپ کی یہ بہو ہونٹوں کو چومنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ بتائیے یہ نئی گندی بات ہے؟“

شازیہ تو جیسے مارے شرم کے زمین میں گر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے رے کو چھپا لیا۔ پھر بھی وہاں نہ بیٹھ سکی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم تک باہر چلی گئی۔

سیٹھ غفار بھائی غصے سے لرزتے ہوئے بولے۔

”مامر تم گدھے ہو۔ کیا ایسی باتیں دوسروں کے سامنے کہی جاتی ہیں؟“

”ڈیڈی جو باتیں نہیں کہی جاسکتیں پھر وہ کیوں کی جاتی ہیں؟ یہ کیسی دنیا ہے جس نے کو چار آدمیوں میں برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بات تنہائی میں اچھی کیسے بن جاتی ہے؟ میں راہبر تنہائی میں اسی طرح رہتے ہیں جس طرح آپ ہمیں دنیا والوں کے سامنے دیکھتے رہتے ہیں لیکن ہمارے پیار کی دیانتداری کو کوئی نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔ ہم اپنی دیانتداری سے باز تو نہیں آسکتے؟ میں نے اسی دیانتداری سے شازیہ کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ تعجب ہے کہ آپ دیانتداری اور پاکیزگی پر لعنت ملامت کر رہے ہیں۔ ڈیڈی سچ پوچھتے تو یہ دنیا دی سمجھ میں نہیں آتی جی چاہتا ہے کہ اپنی معصوم بہن کا ہاتھ تھام کر چپ چاپ اس دنیا سے گزر جاؤں۔“

یہ کہنے کے بعد وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔ امبر بھی اس کے پیچھے جانے لگی۔ امبر نے سیٹھ غفار بھائی سے کہا۔

”انگل میں امبر کے ساتھ ازدواجی رشتہ نبھا نہیں سکوں گا۔ عامر نے جو سلوک ازہر کے ساتھ کیا ہے امبر نے وہی سلوک میرے ساتھ کیا ہے۔ وہ مجھے اپنا خاوند سمجھنے لگا ہے۔ سمجھتی ہے۔ مہرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں اس کے دل میں بھائی کی جگہ کے علاوہ کسی دوسری محبت کی آگ بھڑکا سکوں۔“

سیٹھ غفار بھائی نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں ناقابل علاج ہیں۔ یہ دونوں بھائی بہن ساری عمر ایک

دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے اور اپنی محبت کے درمیان کسی کو حائل نہیں دیں گے، لیکن یہ دونوں نوجوان ہیں اگر یہ دنیاوی دستور کے مطابق اپنے شوہر بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزاریں گے تو دنیا ہمیں بدنام کرے گی۔ احباب بہت دسج ہے میں ہر ایک کو فرداً فرداً نہیں سمجھا سکتا اور یہ یقین نہیں دلاؤں کہ یہ دونوں بھائی بہن دنیا کے ہر غلط جذبے سے پاک ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ کر رہیں۔ دنیا والوں کی زبانیں بند رکھنے کے لئے میں نے تمہیں اپنا داماد اور شازیہ کو اپنا بیٹا ہے۔ اس طرح بھائی بہن کی ناقابل فہم محبت پر پردہ پڑ جائے گا۔

”معاف کیجئے گا انکل میں ساری عمر ایک بے جان پردہ بن کر امیر کی حماقتوں کو ڈھانپ سکتا کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا میرا دل ایک بیوی کی محبت کے لئے نہیں رہے گا؟“

”بیٹے میں تمہاری دلی کیفیت کو اچھی طرح سمجھا ہوں۔ تم ذہین ہو اور دنیا کا پہلی ہی کوشش میں مردہ دل کیوں بن گئے؟ تمہیں حوصلہ رکھنا چاہئے اور یہ کوشش کرنا چاہئے کہ وہ رفتہ رفتہ تمہاری طرف مائل ہو جائے۔ بیٹے اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں انعام کے طور پر پانچ لاکھ کی ایک کوشش ہو۔ پچیس لاکھ روپے دوں گا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ خواہ انعام کے لئے خواہ محبت کے لئے کسی طرح بھی اس معصوم لڑکی کو اپناؤ۔“

اعمر اور شازیہ کے والدین وہاں بیٹھے یہ باتیں سن رہے تھے۔ اتنے بڑے اور بات آئی تو وہ خوش ہو کر بولے۔

”غفار بھائی آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میرا احرار میری شازیہ بہت ذہین ہیں۔ دونوں اپنا اپنا ازدواجی رشتہ ضرور نبھائیں گے۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے بیٹے احمر کو سمجھانے کے لئے اسے لے کر دوسرے کمرے میں گئے۔ سیٹھ غفار بھائی نے جیب سے رد مال نکال کر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے سے کہا۔

”بیگم تم ہی کچھ کم عجیب نہیں تھیں۔ یہ عجوبے پیدا کر کے تم نے راتوں کی حرام کر دی ہیں۔“



ایک کمرے میں حامد اور امیر ایک دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے بستر کے اطراف لیٹے ہوئے تھے۔ امیر نے کہا۔

”تم سے نہیں بولوں گی۔ تم شازیہ کے پاس کیوں گئے تھے؟“  
”میں اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا ڈیڈی نے مجھے اس کے کمرے میں دھکیل دیا“

”پھر بھی تم احتجاج تو کر سکتے تھے۔ چیخ چیخ کر انہیں دروازہ کھولنے پر مجبور کر سکتے تھے۔“

”تم مجھے ہی الزام دے رہی ہو، اپنی بات نہیں کہتیں کہ میں دلہن بنی خاموش یوں بیٹھی تھیں؟“

”میں مجبور تھی۔ می نے مجھے تمہاری قسم دے رکھی تھی کہ میں دلہن کی طرح خاموش بیٹھی رہوں جب تک احربات کرنے پر مجبور نہ کرے۔ میں کچھ نہ بولوں اسی لئے لپٹ چلی تھی۔ جب احمر نے آکر میرا گھونٹ گھٹ اٹھایا اور مجھے پیار کرنے کے لئے میرے دونوں پر جھکنے لگا تو میں نے اسے دھکا دے کر ہٹا دیا اور اسے سمجھایا کہ یہ گندی بات ہے۔ اگر پیار کرنا چاہتے ہو تو میرے عامر بھائی کی طرح میری پیشانی کو چوم لو۔“

”تم نے احمر کو اجازت کیوں دلی کہ وہ تمہاری پیشانی کو چوسے تمہارا بھائی میں ہوں وہ ہے؟“

”تم نے شازیہ کی پیشانی کو کیوں چوما تھا۔ تمہاری بہن میں ہوں یا وہ ہے؟ میں اچھی طرح سمجھ گئی اس چڑیل نے تم پر جادو کر دیا ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو میں وہاں تمہیں یاد کرتا رہا۔“  
”تم جھوٹ کہتے ہو تمہاری محبت میں کمی آگئی ہے۔ یہاں آئے اتنی دیر ہو گئی اور تم نے ابھی تک مجھے سینے سے نہیں لگایا۔“

عامر نے پلنگ کے دوسری طرف سے گھوم کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔  
”تم مجھ سے منہ پھیر کر کھڑی ہوئی ہو، اور سینے سے نہ لگانے کی شکایت بھی کر رہی ہو تم مجھ کو کہہ رہے ہو کہ ہمارے سینے میں ایک ہی دل دھڑکتا ہے پھر میں تم سے کیسے الگ رہ سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے امبر کو اپنے سینے سے لگالیا۔ دو دلوں کی دھڑکنیں دوسرے  
سنگم پر ہم آہنگ ہو گئیں۔ ایسے وقت میں ان دونوں کو ایسا سکون ملا تھا جیسے پہلا  
وقت ایک دوسرے سے چپک کر انہیں سکون حاصل ہوا تھا۔ چند لمحوں تک  
دوسرے سے لگے خاموش کھڑے رہے پھر عامر نے پوچھا۔  
”امبر تمہارے زیورات کیا ہوئے؟“

امبر نے جواب دیا۔ ”احمر نے ایک ایک کر کے اتار دیئے۔“  
”اوہ! اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کینٹ تمہیں ہاتھ لگاتا رہا تھا۔“  
”ہاں! شازیہ کے زیورات بھی تو اترے ہوئے تھے کیا تم نے اسے اتارنے  
ہاتھ نہیں لایا تھا؟“  
”ہاں لگایا تھا۔“

”سچ بتاؤ حامدہ چھونے سے تمہیں کیسی لگی؟“  
”پہلے تم بتاؤ، احمر نے تمہیں ہاتھ لگایا تو تم نے کیا محسوس کیا؟“  
”پہلے میں نے پوچھا ہے۔ اس لئے پہلے تم بتاؤ۔“  
”اس طرح تو ہم ایک دوسرے کو کچھ نہ بتا سکیں گے۔ ایسا کرتے ہیں کہ جس  
میں نے شازیہ کو ہاتھ لگایا تھا اسی طرح تمہیں بھی ہاتھ لگاتا ہوں تم اپنے احسانات  
جاؤ میں اپنے بتاتا جاؤں گا۔“

امبر راضی ہو گئی۔ اس نے اپنا چہرہ اس کی طرف اٹھلایا۔ اس کے زیورات پہلے  
اترے ہوئے تھے لیکن حامر نے اس کی خیالی تھ اتارنے کے لئے اس کی ٹانگ کو ہاتھ  
ہاتھ کی دوسری انگلیاں شفق رنگ رخساروں پر بکھر رہی تھیں۔ امبر نے کہا۔  
”ہائے عامر اب مجھے یاد آیا۔ احمر کی انگلیاں ہی کچھ اور تھیں وہ انگلیاں کچھ عجیب  
جذبہ میرے اندر پیدا کر رہی تھیں لیکن اس وقت میں نے تمہاری محبت میں اس  
توجہ سے محسوس نہیں کیا۔“

”اب میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں شازیہ کی ننھ اتارتے وقت میری انگلیاں  
پتھری پر پھسل رہی تھیں اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا اس وقت تم ذہن پر چھل  
تھیں۔“

”ہاں! بالکل گلاب کی تازہ پتھری ہے کیا میری انگلیوں میں احمر کی انگلیوں جیسی تاثیر ہے؟“

”ہاں یہ..... تمہاری انگلیاں پہلی بار مجھے کسی اجنبی مرد کی انگلیاں.....“

”لگ رہی ہیں۔“  
یکبارگی بجلی کے کڑکنے کی زور دار آواز سنائی دی جیسے ان دونوں کے درمیان بجلی لڑی ہو۔ وہ ہڑکا کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ باہر زور زور سے بادل گرج رہے تھے۔ تیز ہوائیں کھڑکیوں کے پردے اڑا رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی زو میں امبر کی بکھری ہوئی زلفیں ادھر سے ادھر لہرا رہی تھیں۔ عامر کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ ایک لوانا آ رہا تھا۔ وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے کو سہمی ہوئی اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”یہ کیا ہو گیا؟“ یہ سوال دونوں کو پریشان کر رہا تھا۔ ابھی تو ہم تھوڑی دیر پہلے صرف ایک بھائی بہن تھے اور ابھی ہم صرف ایک مرد اور عورت کیسے بن گئے؟ یہ دنیا والوں نے ہمارے ساتھ کیسی سازش کی ہے؟ ہمارے پتھر جیسے سینوں پر کیسے بوند بوند زہر پگھلا ہے جو ہمیں معلوم نہیں تھا، وہ زہریلی معلومات ہم تک پہنچائی ہیں۔

کیا بچے جانتے ہیں کہ مرد اور عورت کا رشتہ کیا ہوتا ہے؟ نہیں وہ تو معصوم ہوتے ہیں۔ وہ ماں باپ کے پیٹ سے جنسی بھوک لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ یہ دنیا اپنی اپنی سیدھی تعلیم اور تمدن کے ذریعہ اپنی نفسیات اور جنسیات کی معلوماتی کتابوں کے ذریعہ اپنے ماں باپ کی ازدواجی زندگی کے ذریعے اور اپنے رنگا رنگ ماحول کے ذریعہ ان معصوم بچوں کو رفتہ رفتہ بالغ بنا دیتی ہے۔“

”میری بہن جب میں تمہیں سینے سے لگا کر اس دنیا میں آیا تھا تو میں نہیں جانتا تھا کہ دلہن کی نئے اتارنے سے کون سا جذبہ انگڑائی لیتا ہے۔“

”میرے بھائی اپنی جوانی کے چند لمحے پہلے تک میں نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا تھا اور سمجھا تھا کہ جب ایک مرد کے ہاتھ آہستہ آہستہ ایک دلہن کے زیور اتارتے ہیں تو آہستہ

آہستہ کون سا چور جذبہ سر ابھارتا ہے۔

”ہائے میری بہن! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا۔ اب ہم پوری دیانتداری کے ایک دوسرے کے قریب کیسے آئیں؟“ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

وہ رات تیامت کی طرح گزری۔ وہ دونوں الگ ہو گئے تھے۔ مگر الگ نہیں تھے اور ایک دوسرے کے قریب آنے سے بھی جھجھک رہے تھے۔ احمر نے امیرؔ سے بھلائی کی ہر ممکن کوشش کی پہلے امیرؔ نے بھی یہی سوچا کہ احمر کی قربت سے بھلائی یہ درست ہے کہ اسی دولہا کی انگلیوں نے اس کے اندر ایک آگ بھڑکائی تھی اور مرد اور عورت کے فرق کو سمجھایا تھا اور وہ ایک مرد تھا۔ اس کا دولہا تھا لیکن ایسی صورت میں بھی اپنی اپنی پسند کا سوال آتا ہے۔ اور جہاں تک پسند کا تعلق تھا، اتنی بڑی بات صرف ایک عامر ہی تھا جس پر وہ کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتی تھی۔

دوسری طرف عامر نے بھی شازیہ سے بھلنے کی کوشش کی لیکن خود کو دھوکہ نہ دے سکا۔ زندگی کی مہم سے عزیز ہستی تو وہی تھی جو سینے سے لگ کر پیدا ہوئی تھی اور اپنے سینے سے دل کی دھڑکنوں کو الگ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بیچارے دونوں ہی مجبور تھے۔ کسی غلط راستے پر جانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا باوجود امیرؔ کی کو بھائی کی جگہ اور عامرؔ کی کو بہن کی جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔

ایک رات تو انہوں نے کسی طرح گزار لی۔ وہ ان کی زندگی کی پہلی رات تھی۔ وہ الگ رہ کر صبح تک ترپتے رہے تھے اور ایک انجانے سے خوف کے تحت ایک دوسرے کے قریب نہیں آئے۔ شب بیداری کے باعث ان دونوں کی آنکھیں مر رہی تھیں۔ شازیہ اور احمر تھک ہار کر سو گئے تھے۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی رات کے سوئے ہوئے تھے اس لئے نیند پوری کر رہے تھے۔ پھر دہی ود کمرے تھے جن کے درمیان کھڑکی تھی اور وہ کھڑکی کے آ پار ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے خاموش بستر پر بیٹھے تھے۔ عامر نے کہا۔ ”میری بہن تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو، اب سو جاؤ۔“

”تم بھی تو جاگے ہوئے ہو پہلے تم سو جاؤ۔“

”ہم میں سے جو بھی پہلے سوئے گا اس کے ساتھ دوسرے کو خود بخود نیند آجائے۔“

”مگر ہم میں سے کوئی سو نہیں سکے گا کیا تم سو سکو گے؟“  
 ”نہیں جس کی آنکھیں نہ ہوں اس کے لئے نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم  
 پیری آنکھیں ہو تمہیں آنکھوں سے لگائے بغیر مجھے نیند نہیں آئے گی۔“  
 ”اور تم میرے دل کا سکون ہو۔ مجھے میرا سکون نصیب نہیں ہو گا تو میں کیسے سو  
 سکوں گی؟“

”ہاں امبر ایک دوسرے کے بغیر ہمارا سینہ خالی ہے مگر اب ہم پینے سے نہیں لگ  
 پتے۔ پہلے ہم نہیں ڈرتے تھے اب ڈرتے ہیں کہ دنیا کیا کہے گی۔“  
 ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس دنیا سے بہت دور پہلے جائیں ایسی جگہ جہاں ہمیں  
 رکے والا کوئی نہ ہو۔“

”ایسی جگہ مل بھی گئی تو کیا ہو گا اب تو ہمیں اپنے آپ کو روکنا تو کتنا چاہئے ہمیں کوئی  
 لینے والا نہ ہو تب بھی میں تمہارے قریب نہیں آ سکتا۔ پہلے تم بہن تھیں۔ اب شازیہ  
 لا قربت نے میرے ذہن میں زہر پکادیا ہے کہ تم ایک عورت ہو۔“  
 ”ہاں احمر کے ہاتھوں کے لمس نے بھی مجھے یہی سمجھایا ہے کہ اب تم غالی خولی بھائی  
 میں ہو ایک مرد ہو۔ مگر ہم کیسے دور رہ سکیں گے۔ ہمیں کسی طرح نیند نہیں آئے گی کیا  
 اسی طرح باگتے ہوئے زندگی گزاریں گے؟“

”مگر ہم کب تک جاگتے رہیں گے؟ آؤ ہم پہلے کی طرح اس کھڑکی کے آہوار ایک  
 دوسرے کا ہاتھ تھام کر سو جائیں۔ نیند ایک عارضی موت ہے۔ زندہ رہنے کے لئے ہمیں  
 بہت مرنا ہو گا۔“

انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ عامر نے اس کے ہاتھ کی ملائیت محسوس  
 کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ہتھیلی کیسی نرم نرم گلابی گلابی ہے پہلے یہ نزاکت محسوس نہیں  
 دلتی تھی۔“

”تمہارے ہاتھ کتنے مضبوط کھردرے ظالم اور مہربان ہیں۔ پہلے مجھے بھی یہ اظہیر  
 ماری باتیں سمجھ جی نہیں آتی تھیں۔ جی چاہتا ہے تم پہلے کی طرح اس ہاتھ کو تھام کر  
 بہن نہ رہو۔“

”میرا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ چپ نہ رہوں۔ اسے آہستہ آہستہ دانا دے دو۔ پھول کی پنکھڑیوں کی طرح مسلا رہوں۔“

امبر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑی سراسیمگی سے اسے دیکھ کر مامر کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بھی امبر کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سامنے ایک جیسا ہاتھ لئے ایک اجنبی عورت بیٹھی ہو۔

”اُدہ! حامر ہم ہلک رہے ہیں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا امبر ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ دنیا دالوں نے ہم سے کسی دلم ہے؟“

حامر نے اپنا سر تھام لیا۔ امبر اپنے بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”میرا تم سے الگ نہیں رہ سکتی میں مر جاؤں گی۔“

”میں بھی مر جانا چاہتا ہوں میری ایک بات مانو گی؟“

”ہاں بولو ضرور مانوں گی۔“

”جب ہمیں مرنا ہی ہے تو ہم یہاں سے دور جا کر کیوں نہ مرس کیونکہ جہاں ہمیں ایک دوسرے کے بغیر نیند نہیں آتی اسی طرح ایک دوسرے کے بغیر موت بھی آئے گی۔ یہاں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں مرنا چاہیں گے تو کوئی نہ کوئی روکے آجائے گلہ۔“

امبر نے کلمہ ”بڑی مشکل ہے ہم ایک دوسرے کے بغیر مر بھی نہیں سکتے۔ تم لے جانا چاہو گے میں انکار نہیں کروں گی۔ اس لئے کہ نہ میں تمہیں چھوڑ کر جا سکتی ہوں اور نہ ہی تم میرے بغیر کہیں جا سکتے ہو۔“

”تو پھر چلو سب لوگ سو رہے ہیں ہم چپ چاپ یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”ہم اپنے ساتھ کچھ سالان لے چلیں؟“

”مرنے کے لئے کسی بھی سالان کی ضرورت نہیں ہے ہم تو شرم سے مرنے ہیں کہ بھائی من ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں آکر ایک دوسرے کے گلے نہیں دے سکتے۔“

دو دونوں اپنے اپنے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے باہر آئے وہاں انہیں قلاب

دیکھو وانا نہ تھا۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے سے ذرا الگ الگ تھے۔ باہر سڑک پر آکر امبر نے پوچھا۔

”ہم کہاں جائیں گے؟“

”ہمارے لئے جنگل مناسب ہے وہاں صرف جالور رہتے ہیں اور جالور کسی ددغلی

تندیب کے ذریعہ بھائی بہن کے درمیان کسی غلاطت کا چھیٹا نہیں اڑاتے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ ایک ٹرین کہیں جانے کے لئے تیار تھی۔ وہ دونوں ایک کپار ٹنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس کپار ٹنٹ میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ جب ٹرین چلنے لگی تو امبر نے کہا۔

”نامر مجھے نیند آ رہی ہے۔ اس کپار ٹنٹ میں بھی تنہائی نہیں ہے میں تمہارے

سنے سے گئے بغیر کیسے سو سکتی ہوں؟“

”مجبوری ہے یہاں میں تمہیں سننے سے لگا کر نہیں سلا سکتا۔ اب ہم ایک ہی بار

ایک دوسرے کے سننے سے لگیں گے اور ایک بار سوئیں گے‘ اس کے بعد کبھی نہیں

اٹھیں گے‘ لیکن اب ابدی نیند کے لئے بھی انسانوں کی اس دنیا میں جگہ نہیں ہے۔ ہم

اس کوئی کے باہر دیکھتے رہتے ہیں‘ جہاں گھنا جنگل نظر آئے گا ہم وہیں اتر جائیں گے۔“

وہ دونوں خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ کپار ٹنٹ کے لوگ ان دونوں کو

عجیب شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کے ساتھ مسلمان سفر نہیں تھا اور وہ

دونوں جوان تھے‘ ان کی موجودہ حالت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دونوں عاشق اور معشوق ہیں

اور گھر سے بھاگ کر کہیں جا رہے تھے۔

کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد ٹرین ایک گھنے جنگل کے درمیان سے گزرتے

لگی۔ انہیں وہی جگہ مناسب نظر آئی۔ جب ٹرین ایک جھوٹے سے پاڑی اسٹیشن پر پہنچ

کر ہوئی تو وہ وہاں اتر گئے۔ کپار ٹنٹ کے لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر انہیں دیکھ رہے

تھے۔ وہ سب مجبور تھے اپنا سفر ملتوی کر کے ان کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ جب ٹرین آگے

بڑھ گئی تو وہ پلیٹ فارم سے باہر جانے لگے۔ اس ویران اسٹیشن پر اترنے والے وہی دو

مسافر تھے اور وہاں کا اسٹیشن ماسٹر نکٹ کلکٹر اور پور ٹر بھی ایک ہی آدمی تھا۔ وہ بیک وقت

تمام فرائض انجام دیتا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس نے نکٹ طلب کیا لیکن نکٹ نہیں

تھا۔ جیب میں پیسے بھی نہیں تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔

”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”یہ میری بہن ہے۔ اس ٹرین میں چند دشمن ہمارا پیچھا کرتے تھے ہم اپنی جان بچانے کے لئے اپنا حالان چھوڑ کر یہیں اتر گئے؟“

اسٹیشن ماسٹر نے کہل۔ ”ہوں! تم دونوں اپنے لباس سے اور چلے سے کسی گھرانے کے معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ آؤ میرے گھر چلو جب دوسری ٹرین آئے تو گھر واپس چلے جانا اور مجھے یہ بتاؤ کہ کون سے کپار نمٹ میں بیٹھے ہوئے تھے میں ان کو فون پر بات کرتا ہوں۔ اگلے اسٹیشن پر تمہارا سلمان اتار لیا جائے گا۔“

عامر نے کہل۔ ”ہمیں سلمان کی پردہ نہیں ہے۔ جان بچ گئی یہی بہت ہے۔ اب یہاں سے جنگل ہی جنگل واپس جائیں گے کیونکہ دشمن دوسری ٹرین سے واپس بھی آئے ہیں۔“

”میاں صاحبزادے اب تم دونوں میری پناہ میں ہو، میں اگلے اسٹیشن سے سپاہیوں کو بھی طلب کر لوں گا وہ تم دونوں کو بحیریت گھر پہنچا کر آجائیں گے۔“

وہ دونوں مجبور ہو کر اس کے ساتھ جانے لگے اسٹیشن ماسٹر نے کہل۔

”تم کہتے ہو کہ تمہیں سلمان کی پرواہ نہیں ہے کیا لکھ پتی باپ کی اولاد ہو؟“

اسہرنے فخر سے کہل۔ ”لکھ پتی نہیں کروڑ پتی کہئے ہم سیٹھ غفار بھائی کے۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عامر نے کہتی سے شوکارا کر اے خاموش

رہنے کا اشارہ کیا۔ اسہر کو فوراً عقل آگئی کہ اسے اپنا صحیح نام دیتے نہیں بتانا چاہئے۔ بوزہ تجزیہ کار اسٹیشن ماسٹر انہیں کن آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھا۔ اسٹیشن کے پیچھے ایک چھوٹی سی بستی تھی وہیں اس کا کوارٹر تھا۔ وہ اپنے کوارٹر میں انہیں چھوڑ کر واپس اسٹیشن آیا اور لون کے ذریعہ دوسرے اسٹیشن سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ جب رابطہ قائم ہو گیا تو وہ دوسری طرف کسی کو بتانے لگا کہ وہاں ایک نوجوان جوڑا آیا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن کہتے ہیں اور اپنی اصلیت چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لڑکی کی بات سے پتہ چلا ہے کہ کروڑ پتی سیٹھ غفار بھائی سے ان کا کوئی تعلق ہے۔



آپ یہاں چند سپاہی بھیج دیں اور سیٹھ غفار بھائی سے رابطہ قائم کر کے مزید معلومات حاصل کریں۔

فون پر باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی بستی سے شور مٹا دیا۔ وہ جلدی سے پلیٹ فارم کے باہر آکر دیکھنے لگا۔ دور بہت دور امیر اور حاکم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جنگل کی طرف بھاگ رہے تھے اور بستی کے مرد، عورت، بچے اور بوڑھے ان پر پتھر سارہے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آگے بڑھ کر چیخے ہوئے کہا۔

ٹھہرو! انہیں نہ مارو۔ انہیں بھاگنے کا موقع نہ دو! انہیں پکڑ کر سیرے پاس لے آؤ۔

اسٹیشن ماسٹر کی بیوی نے آگے بڑھ کر راستہ روکتے ہوئے کہا۔  
”اے جی، تم کن لوگوں کو پکڑ کر لے آئے تھے؟ تم تو کہتے تھے کہ وہ بھائی بہن ہیں مگر وہ تو عاشق معشوق نکلے۔“

ایک بوڑھے نے کہا۔ ”ہاں دیکھنے میں تو بڑے سیدھے سادے نظر آتے تھے۔ وہ دونوں نیند کے جھونکوں سے یار پار گرتے اور سنبھلتے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔ آپ کی گھر والی نے انہیں مونے کے لئے الگ الگ چارپائیاں دیں، مگر دو کبجنت ایک ہی چارپائی پر مونے لگے۔ ہم نے روکا تو کہنے لگے ہم سچ بھائی بہن ہیں ہمارے دل میں کوئی گناہ نہیں ہم بچپن سے اسی طرح سوتے آئے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ماننے کی بات ہے۔ میں نے انہیں بڑا برا بھلا کہا۔ ہماری باتیں سن کر بستی کے دوسرے نوگ بھی آگئے۔ لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر اس نوجوان نے کہا۔ چلو اسیریہ دنیا والے ہمیں یہاں بھی نہیں سونے دیں گے۔ یہ کہتے ہی وہ نوجوان لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگا۔ ایسے لوگ جو دنیا والوں کے سامنے خود کو بہن بھائی کہتے ہیں اور تشریف میں ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے ہیں انہیں سنگسار کرنا چاہئے۔ انہیں اتنے پتھر مارنے چاہئیں کہ پتھروں کے ڈھیر میں ان کا گنہگار وجود چھپ جائے۔ اسی لئے سب لوگ، انہیں پتھروں سے مارنے لگے۔ وہ دونوں بھاگتے بھاگتے بھی لو لہان ہو چکے ہیں آگے جا کر کہیں گر پڑا ہے۔“

اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ ”تم لوگ ان کا پیچھا کرو میں دوسری ٹرین سے آسکرے سپاہیوں کا انتظار کر رہا ہوں ہم انہیں سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے۔“

اس کی ہدایت کے مطابق ہستی کے کتے ہی نوجوان اور بوڑھے ہاتھوں میں لائے جنگل کی طرف چلے گئے۔

پھر جنگل انسانی قدموں کی دھمک سے گونجنے لگا۔ لوگ اوپر اوپر منتشر ہو گئے اور چاروں طرف پھیل کر انہیں تلاش کرنے لگے۔ شام تک وہ سب جنگلوں میں بھاگے۔ دے پھر اندھیرا ہو لے گا تو وہ سب واپس آ گئے۔ ہستی میں سپاہی آ گئے تھے۔ ایک بڑا میں سینٹھ غفار بھائی 'شازیہ اور احمر' نفسیاتی تجزیہ کرنے والا ڈاکٹر سب ہی وہاں آپہنچے۔ ان کا پیچھا کر کے ناکام واپس آنے والے انہیں بتانے لگے کہ وہ بری طرح لولہاں ہوئے ہیں۔ جنگل میں دور تک کیس کیس خون کے دھبے نظر آئے تھے لیکن پھر اندھیرا ہو گیا۔ لائے ہم مجبوراً واپس چلے آئے۔

یہ سن کر کہ حامر اور اسبر بری طرح زخمی ہو گئے ہیں اور جنگل میں دور تک آپہنچے خون کی دھار بہاتے گئے ہیں 'سینٹھ غفار بھائی اپنی اولاد کی اس حالت پر رونے لگا۔ انہوں نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔

”ہم ابھی کار میں چلیں گے آپ لائین اور ٹارچ لائٹ دھیرہ کا انتظام کریں۔ جلد تک یہ گاڑی جلسے کی ہم جائیں گے اس کے بعد پیدل چلیں گے اور انہیں تلاش کریں گے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ ایک انسپکٹر 'چار سپاہیوں اور شازیہ اور احمر کے ساتھ اپنی کار میں روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو ٹارچ لائٹ اور آدھی ورجن لائینیں تھیں بانی سپاہیوں اور ہستی سے سووں سے کہا گیا تھا کہ وہ ان کے پیچھے چلے آئیں۔ راستے میں پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

”سینٹھ صاحب آپ کو بچپن ہی سے ان کی حالت پر کنٹرول کرنا چاہتے تھے۔ بچپن کا حاور۔ مجبور ہو کر وہ آج بھی ایک ساتھ سوتے ہیں اور آپ بدنام ہوتے ہیں۔“

سینٹھ غفار بھائی نے کہا۔ ”میں نے حتی الامکان کوشش کی۔ تجربہ کار ڈاکٹر اور ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کیں لیکن وہ پیدائشی طور پر ایسے ہیں۔ انہیں جبراً آپریشن کے

ذریعے جدا کیا گیا تھا۔  
ماہر نفسیات نے کہا۔ ”انسان قدرت کے آگے بے بس ہے۔ قدرت نے انہیں  
جس طرح بنا کر بھیجا تھا۔ دنیا والوں نے انہیں اس طرح رہنے نہ دیا پہلے ہی دن آپریشن  
کے ہتھیاروں سے انہیں کاٹ کر ان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اب یہ دو ٹکڑے آخری دم  
تک ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔“

کار ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ آگے راستہ خراب تھا۔ گھنی جھاڑیاں اونچے نیچے  
نیلے اور دلدلیں تھیں۔ انہوں نے کار سے اتر کر لالٹینوں کو روشن کیا پھر خون کے دھبوں  
کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کہیں وہ دھبے گم ہو جاتے تھے اور کہیں نظر آنے لگتے  
تھے۔ سینٹہ غفار بھائی کا خون ان سے آنکھ پھوٹی کھیل رہا تھا۔ وہ دوسروں کے ساتھ آدھی  
رات تک بھٹکتے رہے۔ پہلے خوشخوار بھیزپوں کی آوازیں جنگل کے سائلے میں گونج رہی  
تھیں اور اب آوم خورشیدوں کی دہائیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ انسپکٹر نے کہا۔

”میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جنگلی جانوروں کو  
بھگانے کے لئے اڈل تو رائفٹوں کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ ان جانوروں کو مارنے  
سے پہلے فارسٹ آفیسر کی اجازت لینی ہوگی۔ اس جنگل میں مرکار کی طرف سے خطرناک  
پتے پاتا جاتے ہیں۔“

وہ مجبور تھے تھک ہار کر واپس چلے آئے۔ سینٹہ غفار بھائی کی دنیا لٹ رہی تھی۔ وہ  
آرام سے سو نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنی گاڑی لے کر وہاں سے بچاس میل دور فارسٹ آفیسر  
کے پاس پہنچے اور اس سے التجا کی کہ اس کے لئے رائفلیں مہیا کی جائیں اور انہیں اس  
جنگل میں جانے کی اجازت دی جائے۔

فارسٹ آفیسر نے کہا۔ ”اس سلسلے میں مجھے اعلیٰ حکام سے اجازت لینی ہوگی۔  
دوسرے ملکوں کے سربراہ یہاں آکر شکار کھیلتے ہیں ان کے لئے خاص طور سے یہ درندے  
ہائے جاتے ہیں۔“

سینٹہ غفار بھائی نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کی ایک بھاری گڈی نکال کر اس  
کے آگے رکھ دی اور اس سے کہا۔

”وہ انسانی زندگیوں کا سوال ہے انہیں بچانے کے لئے آپ چاہیں تو خصوصی

اجازت دے سکتے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اس جنگل کے کسی بھی گوشہ اس وقت تک نقصان نہیں پہنچائیں گے جب تک کہ وہ ہمارے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ فارسٹ آفیسر نے کہا۔ ”نوٹوں کی یہ گڈی زیادہ سے زیادہ ایک برس تک کام آئے گی لیکن اس کے لئے مجھے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ اپنی گاڑی میں مجھے شہر لے چلیں میں وہاں اجازت حاصل کرنے کے لئے فوراً طور پر کوشش کروں گا۔“

سیٹھ غفار بھائی اسے اپنی کار میں بٹھا کر شہر لے گئے۔ اس بدحواسی میں وہ دو دن بھول گئے تھے کہ چھٹی کا دن ہے اور تمام دفاتر بند ہیں۔ وہ دھپ کو شہر پہنچے تو انہیں حماقت کا پتہ چلا۔ سیٹھ غفار بھائی کا جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیں ان کی بے پناہ دولت کسی کام نہیں آرہی تھی۔ پتہ نہیں وہ دونوں کہاں تھے اور کس جگہ میں تھے۔ اپنے بچوں تک پہنچنے کے لئے دل تڑپ رہا تھا اور جان نکلی جارہی تھی۔ حکام سے اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس لئے وہ دوسرے دن کے انتظار میں دلم رک گئے۔

وہ ایک رات نہیں سوئے تھے اور اب دوسری آگئی تھی۔ نیند ان پر غالب آ رہی تھی اور وہ اونگھتے ہوئے بھی سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں ان کے بچوں کو سونے کی جگہ نصیب ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ سونے کی جگہ تلاش کرنے کے لئے ہی گھرے بھاگے جنگل میں تو کوئی انہیں روکنے والا نہ ہو گا۔ وہ تو آرام سے سو رہے ہوں گے۔

دوسرے دن وہ اعلیٰ حکام سے خصوصی اجازت لے کر راتقل بردار سپاہیوں کے ساتھ اپنے بچوں کی تلاش میں پھر اسی لمبی میٹھی میں واپس آ گئے۔ اب ان کے اس جی کار میں بھی تھیں۔ سبھی ایک قافلے کی صورت میں جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ غفار بھائی دل ہی دل میں حساب کر رہے تھے کہ وہ دونوں کتنے دن سے غائب ہیں۔ وہ اور دو راتیں گزر چکی تھیں اور اب تیسرا دن تھا نہ جانے وہ کجھ کجھ سے جنگل میں کجھ جی رہے ہوں گے۔ مگر انہیں ایسی بھی جگہ کی تلاش تھی جہاں کوئی مذہب ان کے رہنا حائل نہ ہو۔

وہ بہت دور تلاش کرتے ہوئے جنگل کے قلب آ گئے۔ وہاں پھر انہیں خانا

سوئے ہوئے دھبے نظر آئے۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھے تو انہیں انسانی کھال کی کچھ دھجیاں نظر آئیں۔ سیٹھ غفار بھائی کے حلق میں سانسیں رکنے لگیں۔ وہ جب ایک غار کی طرف بڑھتے جا رہے تھے اور جیسے جیسے بڑھتے جا رہے تھے انہیں کھال کی دھجیاں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ بوڑھے باپ کے قدم لڑکھڑاتے جا رہے تھے۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ایک سپاہی کے بازو کا سہارا لے کر ایک غار میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھے تو کتنے ہی گدھ اڑتے ہوئے غار کے دھانے سے باہر نکل گئے۔ سب سے آگے اسپیکر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے ہاتھ میں نارچ لائٹ تھی۔ غار میں اندھیرا تھا۔ وہ نارچ لائٹ کی روشنی ادھر ادھر پھینک کر دیکھنے لگا۔ سرنگ کے ایک موڑ پر انسانی لہو نیڑھے میڑھے راستے سے بہتا ہوا اس کے قدموں تک آ رہا تھا اور وہ لہو موکھ چکا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا سرنگ کے موڑ پر آیا اس کے پیچھے سیٹھ غفار بھائی اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی سب کے قدم رک گئے۔

وہاں عامر اور امبر نہیں تھے۔ سیٹھ غفار بھائی اپنے جن بچوں کو ڈھونڈنے آئے تھے۔ وہ بچے وہاں نظر نہیں آئے۔ کیا کوئی باپ ہڈیوں کے ڈھانچے دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ان ڈھانچوں کو اپنی گود میں کھاتا رہا ہے اور اس دنیا کی شرمیلی تہذیب کا درس دیتا رہا ہے؟

وہ محض ڈھانچے تھے، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ایک کا سینہ دوسرے کے سینے سے ملا ہوا تھا۔ قدرت نے جس ردز جس صورت میں انہیں بنایا تھا وہ اسی صورت میں اسی ردز اقل کی طرف لوٹ گئے تھے۔

☆=====ختم شد=====☆

# انجانے دشمن

ٹرین کے ان دو مسافروں کی خوفناک داستان جو اپنی زندگی کے آخری اسٹیشن تک آپہنچے تھے۔ وہ موت سے بھاگ رہے تھے مگر پراسرار موت ان کی ہمرکاب تھی۔

پھاڑی کے دامن میں وہ چھوٹا سا ریلوے پلیٹ فارم کمر کے دھندلکے میں چھپا ہوا تھا۔ آدھے چاند کی آدھی چاندنی کمر سے لپٹ کر دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ دور رات بسنے میں کسی تیز رفتار ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انجن لائٹ دھندلکے کو چیرتی ہوئی نظر آنے لگی دیر ان پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے اسٹیشن ٹرنے ہاتھ میں لگی ہوئی سنگل لائٹ ادبھی کر دی اور آنے والی ٹرین کو سبز روشنی ملنے لگا۔ وہ اس چھوٹے سے پھاڑی اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر بھی تھا، سنگل مین بھی تھا اور ٹکٹ کلر بھی۔ جب ٹرین دندناتی ہوئی پلیٹ فارم تک آگئی تو ہیڈ لائٹ کی روشنی میں اس ٹرین کا سامن بورڈ نظر آیا۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”آخری اسٹیشن۔“

وہ بڑی لائن کا آخری اسٹیشن تھا۔ دوسری طرف کے پلیٹ فارم سے چھوٹی لائن یا گج پھاڑ کی بلندیوں تک جاتی تھی۔ اس وقت براؤ گج پر آنے والی ٹرین آہستہ آہستہ رہی تھی۔ ریل کے کپار ٹمٹ زرد روشنی میں تقریباً خالی نظر آ رہے تھے۔ کنتی کے مسافر پلیٹ فارم پر اترے اور اسٹیشن ماسٹر یا ٹکٹ کلر کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنے ٹکٹ رکھتے ہوئے گزر گئے۔ اسٹیم انجن کا ڈرائیور اور فائرمن آپس میں باتیں کرتے سٹیشن ماسٹر کے پاس آئے اور اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلے گئے۔

پلیٹ فارم انسانوں سے خالی ہو گیا۔ بظاہر ٹرین بھی مسافروں سے خالی تھی لیکن اگلے ٹمٹ میں ایک مسافر بند کھڑکی سے ٹیک لگائے سما ہوا مایٹھا تھا۔ اوپر کوٹ کے آدھے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے اور آدھے چہرے پر فلیٹ ہیٹ جھکا ہوا تھا۔ وہ ٹمٹ سے باہر نکلنے سے پہلے موج رہا تھا کہ اس کے لئے کھلا پلیٹ فارم مناسب ہو گا۔ بند کپار ٹمٹ میں محفوظ رہ سکے گا۔

اس ٹرین کے سب سے آخری کپار ٹمٹ میں ایک اور مسافر تھما سا، سا ہوا سا بیٹھا

تھا۔ اس کے سر پر اونی ٹوپی تھی۔ وہ میرے رنگ کے کبیل میں اس طرح پہن رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کبیل کے اندر چھپ گئے تھے۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا، موت کی زندگی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے میں یہاں چھپا بیٹھا رہوں گاتب بھی موت میری طرف کے قریب رہے گی۔ مجھے ڈرنے کی بجائے ہمت سے کام لینا چاہیے۔ بستی یہاں سے میل کے فاصلے پر ہے، میں اپنے دشمن کو سینکڑوں میل پیچھے چھوڑ آیا ہوں، وہ کبھی بھوت نہیں ہے کہ اس دیرانے میں بھی آجائے۔ میں فضول ڈر رہا ہوں۔ مجھے یہاں نکل کر فوراً ہی بستی کی طرف جانا چاہیے۔ ابھی میری سوی جاگ رہی ہوگی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اگلے کمپارٹمنٹ کا مسافر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پلیٹ فارم پر اڑنے پہلے دوسری طرف کی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ وہ اس علاقے میں پہلی بار آیا تھا۔ اس پاس کے ماحول کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری تھا۔ ٹرین کے دوسری طرف کی کھڑکی سے درر تک کچھ دکھائی نہ دیا کیونکہ کمر کی چادر نے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ وہاں ہی چند گز کے فاصلے پر بنی پرانی قبرس نظر آرہی تھیں۔

قبروں کو دیکھ کر موت یاد آئی اور موت کی یاد نے اس کے جسم میں جھرجھری دی۔ وہ کہاں پہنچ گیا تھا؟ ٹرین کے ایک طرف ریلوے کا آخری اسٹیشن تھا اور دوسری طرف انسانی مسافرت کا آخری اسٹیشن نظر آرہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کا شرٹہ کھینچا۔ وہ جلدی سے پلیٹ کر کمپارٹمنٹ سے باہر نکلا اور پلیٹ فارم پر آگیا۔ کھینچنے سے آکر اسے یوں لگا کہ وہ اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا کھڑا ہوا ہے۔ درر دور تک آدھے چاند کی چاندنی رات کی سیاہی میں دم توڑ رہی تھی۔ چاروں طرف شبی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ پلیٹ فارم پر پتھر لے کوئلے کی بجڑاں تھیں۔ جو اس کے قدموں تلے چر سرائی تھیں، سسک رہی تھیں اور گہری خاموشی گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ چلتے چلتے ٹھک گیا۔ اسے پلیٹ فارم کے آخری حصے سے بجڑوں کا نام نہ تھا۔

چند لمحوں تک سناٹا طاری رہا۔ پھر دونوں نے سوچا کہ وہاں کوئی دوسرا نہیں اپنے ہی قدموں کی آوازیں ہیں جو نساٹے میں درر تک جاتی ہیں اور باز گشت کرتی ہیں۔



مطمن ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف جانے لگے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لاٹین کی روشنی باہر تک آ رہی تھی۔ اس روشنی کے قریب پہنچ کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سہم کر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔

شہنی دھند میں وہ ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے، قریب ہو کر ایک دوسرے کو پہچاننے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ دلوں میں ایسی دہشت تھی کہ ایک دوسرے کے متعلق ذرا زبان ہلا کر پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے قہقہے کی آوازیں سن کر ان میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا کہ قریب ہی کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہاں پناہ لی سکتی ہے۔

وہ دونوں تیزی سے کمرے کی طرف بڑھے، اور کوٹ والا مسافر چلے کمرے میں پہنچا اس کے بعد کمبل والا آیا۔ اسٹیشن ماسٹر انجن ڈرائیور اور فائرمن کے ہاتھوں میں جانے کی پالیسیاں تھیں اور اجنبیوں کو دیکھ کر ان کے قہقہے رک گئے۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

وہ دونوں مسافر بھی ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ سوت کا چہرہ کس نے دیکھا ہے؟ انہوں نے تو ابھی تک نہیں دیکھا تھا، لیکن اتنا یقینی طور پر جانتے تھے کہ موت ان کے آس پاس ہے۔ بالکل قریب ہے اور ٹھیک اسٹیشن کے سامنے ٹرین کے دوسری طرف انسانی زندگی کا آخری اسٹیشن ہے۔ وہ ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے، کمبل والے مسافر نے اسٹیشن ماسٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سہرا نام رب نواز ہے۔ جلیں کی بستی میں سیری موی رہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بستی یہاں سے تین میل پر ہے۔ میں رات کو تنہا وہاں نہیں جاسکتا۔ کیا آپ مجھے یہاں پناہ دیں گے۔“

”تم خما کیوں نہیں جاسکتے؟“ اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔ ”لوگ راتوں رات پچاسوں میل ہڈل چلے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں کبھی چوری یا کیتی یا قتل کی واردات نہیں ہوئی۔ تم بٹے کئے نوجوان ہو۔ تمہیں تو ہشتے گا۔ تر جانا چاہئے۔ جہاں تک پناہ دینے کا تعلق ہے، میں اس کمرے میں مسافر کو رات گزارنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہاں تمہارے لئے دھنگ دم کھول سکتا ہوں۔“

رب نواز سر جھکا کر سوچنے لگا وہ کن انٹھیوں سے دوسرے مسافر کو دیکھ رہا تھا  
دوسرے مسافر نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔

”میرا نام ہاشم علی ہے۔ میں نے ریلوے ٹائم ٹیبل میں دیکھا ہے کہ باگیسری جانے  
کے لئے یہاں سے دس بجے رات کو ٹرین جاتی ہے۔ اب دس بجنے والے ہیں کیا ٹرین کا  
آمد تک میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔ ”باگیسری جانے والی ٹرین چوبیس گھنٹے لیٹ ہے۔ اس  
کے علاقوں میں برفباری ہو رہی ہے۔ صبح ریلوے لائن سے برف ہٹائی جائے گی تب ٹرین  
چلے گی۔“

”اوہ.....!“ ہاشم نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میرے لئے تو مصیبت ہو گئی۔ رات  
کہاں گزار دوں گا۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔“  
وہ تینوں رب نواز اور ہاشم علی کو دیکھ کر سوچنے لگے۔ ان کے چہروں سے صاف ظاہر  
تھا کہ وہ دونوں مسافر گھبرائے اور سسے ہوئے ہیں۔ انجن ڈرائیور نے ذرا سوچنے کے بعد  
کہا۔

”آپ ہاشم صاحب! اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں۔ یہاں آپ کا کوئی نمبر  
ہے۔ آپ دیننگ روم میں رات گزار سکتے ہیں بشرطیکہ آپ وہاں تنہا سو سکیں اور وہ  
نواز صاحب آپ کی موسی جلیاں کی بستی میں رہتی ہے لیکن آپ تنہا تین میل کا سفر نہیں  
کر سکتے۔ آپ ایسا کریں کہ ہاشم صاحب کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ انہیں آپ کی موسی  
کے ہاں دیننگ روم سے زیادہ آرام ملے گا اور آپ کو بھی ایک ہم سفر مل جائے گا۔“

رب نواز نے خوفزدہ نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔  
”میں ایک اجنبی کے ساتھ اتنی رات کو کہیں نہیں جاسکتا۔ آپ لوگ نہیں جانتے  
ایک شخص میری جان کا دشمن ہے۔ اس نے ایک کرائے کے قاتل کو میرے پیچھے لگا رکھا  
ہے۔ میں قاتل کو اس کے چہرے سے نہیں پہچانتا۔ پتہ نہیں وہ کون ہے میں اس اجنبی  
کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں۔“

”میں کرائے کا قاتل نہیں ہوں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں بھی ایک قاتل سے بچنے  
چھڑانے کے لئے بھاگ کر یہاں آیا ہوں اور یہاں سے باگیسری جانا چاہتا ہوں۔ میں نے  
اپنے اس دشمن کو دیکھا ہے اس کے باوجود میں اسے پہچان نہیں سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے

ردپ بدلتا ہے آپ لوگ شاید یقین نہ کریں وہ کسی ڈائن کی ادلاو ہے۔“  
اشیشن ماسٹر انجن ڈرائیور اور فائر مین نے اسے ویدے پھاڑ کر دیکھا۔ پھر قہقہے لگانے لگے۔ فائر مین نے کہا۔

”آپ نے چلون اور ادور کوٹ پہن رکھا ہے۔ سر پر فیلٹ ہیٹ ہے۔ اس لباس سے آپ پر مھے کھسے سمجھ دار آدمی نظر آتے ہیں اور باتیں بھوت چڑیل کی کرتے ہیں۔ جی میں نے تو آج تک کسی ڈائن یا چڑیل کو نہیں دیکھا مگر آپ نے تو چڑیل کی ادلاو بھی پیدا کر دی۔“

وہ پھر قہقہے لگانے لگے۔ رب نواز نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
”بیٹے جناب! یہ ہاشم صاحب کی باتیں سن کر میں بھی اب یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرا قاتل بھی کسی چڑیل کی ادلاو ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ میں اسے چہرے سے نہیں پہچانتا۔ دراصل میرے کہنے کا مطلب بھی یہی تھا کہ وہ اپنا ردپ بدلتا ہوگا۔ اس لئے وہ ہر بار میرے لئے اجنبی ہوتا ہے۔“

”یک نہ شد دوشد۔“ اشیشن ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ دونوں آسیب زدہ ہیں اور اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں۔ آپ انہیں ردپ بدلنے والا شخص سمجھتے ہیں اور یہ آپ کو چڑیل کی ادلاو سمجھ کر سے جارہے ہیں۔ بھئی یہ تو بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ ہم آپ دونوں کو انسان کی ادلاو سمجھتے ہیں آپ بھی ایک دوسرے کو انسان سمجھتے۔“

انجن ڈرائیور نے کہا۔ ”ہاں آپ دونوں دور دور رہ کر اور خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے رہیں گے۔ آگے بڑھ کر مصافحہ کیجئے اور دوست بن جائیے۔“  
”بالکل ٹھیک۔“ فائر مین نے کہا۔ ”آپ دونوں دوست بن کر اور متحد ہو کر اپنے اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس بات کا یقین ہم دلاتے ہیں کہ اتنی رات کو اس ریرانے میں آپ کا کوئی دشمن نہیں آئے گا۔“

ہاشم علی اور رب نواز نے ایک دوسرے کو ذرا سہمی ہوئی نظروں سے اور ذرا دوستانہ نظروں سے دیکھا۔ اپنے جیسے تین انسانوں کے ساتھ کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے سے انسانوں کی طرح مصافحہ کر کے آپس میں دوست بن سکتے تھے یا دشمن کو پہچان سکتے تھے۔ ہاشم علی نے ادور کوٹ کی جیب سے وایاں ہاتھ باہر نکالا اور جھجکتے ہوئے

آگے بڑھ کر رب نواز نے بھی کبیل کے اندر سے اپنا دایاں ہاتھ نکالا وہ بھی ڈر سے کھڑا رہا تھا لیکن دونوں نے مصافحہ کر ہی لیا۔

وہ تینوں چلے کی پالیاں رکھ کر ہنستے ہوئے تالیاں بجانے لگے۔ ہاشم اور رب نواز بھی کسی قدر مطمئن ہو کر مسکرا رہے تھے۔ اب بظاہر وہ خوفزدہ نہیں تھے لیکن ان کے دل چرے بتا رہے تھے کہ کسی ناہیدہ دشمن سے وہ اب بھی سسے ہوئے ہیں۔

اشیشن ماسٹر نے کہا۔ ”اب آپ دونوں اچھے دوستوں کی طرح رات گزاریں گے۔ کسی تیسرے کی سبیل نہ ہوگی کہ وہ دو دوستوں پر حملہ کر سکے۔ پھر یہ کہ ہم تین ہفتے یہاں موجود ہیں۔ میں ریلوے کے قانون اور حفظ ماتقدم کے پیش نظر آپ لوگوں کو اس کمرے میں مونے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ یہاں ریلوے کے ٹکٹ اور کیش وغیرہ کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ آپ دونوں اتنی رات گئے جلیں کی بستی تک بھی نہیں جاسکتے۔ آپ لوگوں کے دل دماغ میں کسی چیز کی اولاد کا خوف سایا ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ وینٹنگ روم میں چلے جائیں اگر زیادہ ڈر لگے تو دروازے کو اندر سے بند کر لیں۔ اگر کوئی خطرہ محسوس کریں تو ہمیں آواز دے لیں۔ وینٹنگ روم یہاں سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر ہے۔“

ہاشم اور رب نواز نے ایک دوسرے کو اعتماد سے دیکھا۔ اعتماد اس لئے بھی ضروری تھا کہ رات گزارنے کی کوئی دوسری پناہ نہیں تھی اور وہ دوست بن کر ہی اس رات کا صبح کر سکتے تھے۔

رب نواز نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہاشم صاحب میرے دوست ہیں۔ ہم وینٹنگ روم میں رات گزاریں گے۔“

اشیشن ماسٹر نے میز کی دراز کھول کر چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور فارمین کو دینے ہوئے بولا۔

”تم ان کے ساتھ باؤ اور وینٹنگ روم کا دروازہ کھول دو۔“

ہاشم علی نے میز پر رکھے ہوئے اسٹود کو دیکھا جس پر چائے گرم کی گئی تھی۔ ان نے کہا۔

”میرے پاس گوشت کا سالن اور روٹیاں ہیں۔ میں سالن کو اسٹود پر گرم کر چاہتا ہوں۔“

ایشین اسٹوڈنٹس اسٹوڈنٹس اسٹوڈنٹس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور یہ چائے تیار ہے۔ اسے بھی لے جائیے۔  
 روٹیاں کھانے کے بعد چائے گرم کر کے پی لیں۔ رات اچھی گزر جائے گی۔“  
 رب نواز نے آگے بڑھ کر اسٹوڈنٹس کو اٹھایا۔ ہاشم نے چائے کی کیتلی اور دو پیالے پکڑ  
 لئے۔ پھر وہ دونوں فلائین کے ساتھ باہر آگئے۔

باہر وہی کمر کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ فلائین لائین پکڑنے ان کے آگے چل  
 رہا تھا۔ وہ دونوں محتاط نظروں سے آگے پیچھے دیکھتے جا رہے تھے۔ صرف دس قدم کا فاصلہ  
 تھا۔ فلائین دروازے کا تالا کھولنے لگا۔ خاموش کھڑی ہوئی ٹرین کی دو بوگیوں کے درمیان  
 سے دد مری طرف قبرستان نظر آ رہا تھا۔ دھند میں تو کچھ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن ان دونوں کو  
 چشم تصور میں نظر آ رہا تھا اور وہ دیکھنے سے کتر رہے تھے۔

وینٹگ روم کا دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے اندر باکر چاروں طرف محتاط نظروں سے  
 دیکھا کہ کہیں وہ ناہیدہ دشمن تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ ٹائلٹ کا دروازہ بھی کھول کر دیکھا گیا۔  
 کوئی نہیں تھا۔ اس چار دیواری میں خطرہ نہیں تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی گول  
 میز تھی۔ اس کے اطراف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ لائے سج تھے۔  
 جن پر سوا جاسکتا تھا لیکن ان کی آنکھوں سے نیند اڑی ہوئی تھی۔ فلائین کے بانے کے  
 بعد ہاشم نے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹنی چڑھا دی۔ پھر سر اٹھا کر چھت کی طرف  
 دیکھا۔

چھت کھیرل کی تھی۔ ایک آدھ کھیر اپنی جگہ سے ذرا سرک گئی تھی۔ مگر گہری  
 دھند نہ ہوتی تو ان کھیروں کے درمیان سے آسمان نظر آ جاتا۔ چھت کمزور نہیں تھی۔  
 صرف ایک آدھ جگہ رخنے پڑ گئے تھے۔

”ان سوراخوں سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔“ ہاشم نے کہا۔  
 رب نواز بھی ذرا سہمی ہوئی نظروں سے چھت کے اس سہمے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے  
 کہا۔

”ہاں۔ مگر صرف ٹھنڈی ہوا آسکتی ہے۔ اتنے چھوٹے شکانوں سے کوئی دشمن نہیں  
 آسکتا۔“

”نہیں آسکتا۔“ ہاشم نے بڑی مشکل سے تھوک نکل کر کہا۔ ”بالکل نہیں آسکتا۔ وہ



موری چٹی اور پکنی ہوتی ہیں جیسے خالص دودھ کی بالائی کو گوندھ کر بنائی گئی ہوں۔ ریشی بھی ایسی ہی تھی کہ اسے آنکھیں دیکھتی تھیں اور دل پھسلتا تھا۔ جب وہ بستی کی گلیوں سے چپٹی بل کھائی مزاراتی تو اس کے بھرے بھرے بدن کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ ایسی ستابہ چال تھی کہ نہ دیکھنے والے بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ میں بھی دیکھتے دیکھتے اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

پہلے پہل میں اسے راستے اور گلیوں میں اپنی نگاہوں سے گرفتار کرتا رہا۔ کچھ ہی دنوں میں دو میری حوصلہ افزائی کرنے لگی۔ کبھی وہ مسکراتی اور کبھی قاطانہ انداز میں دیدے منکا کر سامنے سے گزر جاتی تھی۔ رمضو چمار ڈیزہ پبلی کا آدمی تھا۔ ریشی کی طرار جوانی کو لگام نہیں دے سکتا تھا۔ اسی لئے وہ لاسے پر چڑھ گئی تھی۔

اس کی خاطر میں رمضو چمار سے دوستی بڑھالے لگا۔ پہلے میں ایک گاہک کی حیثیت سے اپنے لئے نئے جوتے بنوانے گیا۔ اس نے ایک ہفتے کا وقت مانگا کیونکہ اس کے پاس کام زیادہ تھا۔ صبری طرح کتنے ہی منچلوں نے نئے جوتوں کے آرڈر دے رکھے تھے۔ اس کی آمدنی بڑھ گئی تھی اور دل والوں کو دیدار کا بہانہ مل گیا تھا۔

ایک انار اور سویار دلی بات تھی لیکن ریشی کی لائری میرے ہی نام نکلی۔ وہ مجھ پر مہربان تھی۔ رمضو چمار بھی میری بڑی آؤ بھگت کرتا تھا۔ میں اس کی ساوہ لوجی سے خاندہ اٹھا کر اس کی جھونپڑی میں گئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا۔ وہ جوتے گانٹھنے میں مصروف رہتا۔ ریشی ہزار بہانوں سے وہاں آتی جاتی رہتی اور میں آنکھیں پینکتا رہتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ رمضو چڑا خریدنے یا جوتے بیچنے کے لئے بازار چلا جاتا۔ ایسے وقت میں جھونپڑی میں پہنچ جاتا تھا۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ چمار کی ہانڈی میں کھاؤ تو ہم شریف لوگ کبھی اس ہانڈی کو نہ نہیں لگاتے لیکن ریشی منہ لگ گئی تھی۔ جمائی سے فائدہ اٹھا کر میں نے کئی بار اسے آغوش میں لے کر چوم لیا۔ یہ وہ آگ تھی کہ بوسے ہو ا دیتے تھے اور آتش شوق بھڑکتی جاتی تھی۔ ایک دن اس نے رات کو ملنے کا وعدہ کیا۔

”آج رات بارہ بجے..... قبرستان کے پیچھے.....“ گلے لگتے وقت اس کی سرگوشیاں میرے کانوں میں سرسرائیں۔ ایک حسینہ سے جنم میں بھی ملاقات کی جاسکتی ہے اس لئے کہ وہاں تک جذبات لے جاتے ہیں۔ میں نے جذبات کی رو میں یہ نہیں سوچا کہ بعض عورتیں بڑے پیار سے ہمیں ہماری قبر تک لے جاتی ہیں۔ یوں بھی ہمارے

ملنے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ نہیں تھی۔ جھوپڑی میں رہنا چار سو تھا۔ یہاں وہاں سے بہت دور تھا اور اس کی بہ نسبت قبرستان جھوپڑی کے قریب تھا۔ وہ نوچندی جمعرات تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور..... اور آج بھی تو میری یاد ہے؟“

رب نواز کے سوال نے ہاشم کو ذرا پریشان کر دیا۔ وہ اندر ہی اندر زبان کو توڑتا رہتا ہے کیلی کرتے کے بعد بولا۔

”ہاں آج نئے چاند کی پہلی جمعرات ہے۔ میری زندگی میں اس رات کی بیٹی ابھی نہ ہوئی ہے۔ کیا آپ کی دامتان میں بھی اس کی اہمیت ہے؟“

”ہاں.....!“ رب نواز نے جواب دیا۔ ”جب میں قبرستان کے پیچھے پہنچا تو وہاں آدھی تھی اور آسمان پر چاند آدھا تھا۔ میرے اندر آدھی دلیری تھی اور آدھی ہمت تھی۔ اتنی رات کو میں اپنے باپ کی قبر پر بھی کبھی فاتحہ پڑھتے نہیں جاتا لیکن ایک جزائلی فاتحہ سننے کی ہوس میں چلا آیا تھا۔“

وہ مقررہ وقت پر آئی۔ وہ حمام طور پر گھاکھر اور چولی پہنتی تھی لیکن اس وقت ملک انداز کی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ دونوں بازو اور شانے اور سینے کی بلندیوں کا اوپر کی طرف حصہ عریاں تھا۔ بدن کی اچلی اچلی چکناسٹ چاندنی کو اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔ پٹیلیوں سے نٹنوں تک ریشم کی باریک میکسی تھی جس کے پیچھے سے بدن کی رنگت چھوٹ رہی تھی۔ کلائیوں میں کلنگن۔ دونوں بازوؤں پر سونے کے بازو بند اور گلے میں نٹھی۔

ہاشم علی نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہڈی کو ہڈیوں کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ وہ جانتا تھا اب رب نواز آگے کیا کہے گا۔ وہ کہے گا کہ اس حسینہ کی دائیں ہتھیلی پر ایک سرورہ انسان کی استخوانی کھوپڑی تھی۔ بہت سی کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا انجام پلے میں معلوم ہو جاتا ہے اور ہاشم علی اس کہانی کے کچھ حصوں سے جنس نفیس گزر چکا تھا۔

نے بے چینی سے پوچھا۔  
”کیا ریشمی خالی ہاتھ تھی؟“  
”نہیں۔“ رب نواز ہڈی سے گوشت نوچتے لگا۔ اس کے دانت مصروف تھے۔  
سرف نہیں کہہ کر رہ گیا۔



”پھر تو اس کی ہتھیلی پر کچھ ہو گا؟“  
”ہاں! اس نے ہڈی پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اس کے دائیں ہاتھ میں پھولوں کا گلہ دستہ

ہاٹم ایک سری سانس نے کر پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ رب نواز نے اپنی  
جان جاری رکھی۔

”اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ اس کا سنگھار بدلا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور  
ش ہو گئی تھی۔ میں نے بازو پھیلا دیئے تاکہ وہ میری آغوش میں آجائے لیکن وہ دور  
ور سے مسکرانے لگی، ذرا لہرانے لگی۔ ریشم کی میٹھی بھی ہوا کی زور لہرا رہی تھی۔  
لے دیکھا اب وہ آہستہ آہستہ تھرک رہی تھی۔ رقص کے انداز میں اس کے پاؤں  
رہے تھے۔ کھلی ہوئی ہتھیلی پر پھولوں کا گلہ دستہ یوں رکھا ہوا تھا جیسے وہ پوجا کے لئے  
اپنے دیک کا تھال سجائے میری آرتی اتار رہی ہو۔

میں تم صم کھڑا رہ گیا۔ جانے کیا بات تھی کہ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ وہ دالمانہ  
میں جھوم جھوم کر راج رہی تھی۔ کتنے ہی زاویوں سے انگ انگ کی نمائش کر رہی  
میں نے محسوس کیا کہ رقص کے پس منظر میں کہیں مازنج رہے ہیں۔ درختوں کی  
انگنائیاں ہیں۔ شاخوں سے شاخیں نکل کر تال دے رہی ہیں اور ٹوٹی ہوئی قبروں  
لڑنے والی ہوا میں سیٹیاں بھا کر ہڈیاں انداز میں چیخ رہی ہیں۔

پھر وہ رقص کرتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ میری جانب پشت کر کے تھرکتی ہوئی دو  
ہو گئی۔ اس نے مجھے کی جانب خم کھا کر بلیاں ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ ولایاں ہاتھ میری  
انٹھا ہوا تھا۔ اس کی ہتھیلی پر بدستور گلہ دستہ موجود تھا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا  
کی جانب خم کھانے کے باعث سینہ ترن گیا تھا۔ بلندیاں غضب ناک ہو گئی تھیں۔ یوں  
تھا کہ اب تب میں انگلیاں کا بند ٹوٹ جائے گا..... ویسے میرے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔  
نے جھک کر اس حسین مکھڑے کو ہاتھوں میں لیا اور اپنے ہونٹ اس کے دہکتے ہوئے  
اوپر رکھ دیئے۔

انہی وقت دمپ سے کوئی چیز گری۔ میں نے بوسے کے دوران سزا دیکھوں سے  
لہ اس کی ہتھیلی غالی تھی اور نیچے زمین پر ایک انسانی کھوپڑی اس طرح لڑھک کر  
ب میں جاری تھی جیسے ابھی ہتھیلی سے کری ہو، لیکن ہتھیلی پر تو گلہ دستہ تھا۔ شاید

گلدستہ بکھر گیا تھا۔ پھول ہوا سے بکھر گئے تھے۔ مجھے زیادہ سوچنے کی فرصت نہ رہی۔ حسن و شباب کا ایک گلدستہ میرے بازوؤں میں تھا، جو پھولوں کی طرح ملائم تھا اور ان کی طرح دھبہ رہا تھا۔ میں ان انگاروں سے کھیلتا چلا گیا۔

☆ = = = = ☆ = = = = ☆

دوسرے دن شام کے وقت میں رضو چمار کی جھونپڑی میں آیا تو وہ کچھ پریشان نظر  
پا تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی اس نے ریشمی کو کسی دکاندار سے جوتوں کے پیسے وصول  
کے لئے بھیج دیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔

”تواذ باؤ۔۔۔۔۔ میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری  
نکداتی نہ سمجھیں تو کہوں؟“

میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی بات کو سنجیدگی سے سنوں گا۔ وہ چند لمحوں تک  
جھکائے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

”یہ جو میری گھر والی ہے ناں۔۔۔۔۔ یہ ریشمی۔۔۔۔۔ یہ رات کو مر جاتی ہے۔“  
میں جرات سے آنکھیں پھیلا کر اسے یوں دیکھا جیسے میرے سامنے کوئی پاگل بیٹھا  
اس نے مجھے ٹٹاتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”میں پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن آپ ذرا صبر سے میری  
وہ بات سن لیجئے۔ جب میں اسے بیاہ کر لایا تو وہ ایسی نہیں تھی۔ میں نے کئی راتیں  
اس کے ساتھ گزاریں۔ آج میں آپ سے یہ بات کھل کر کہتا ہوں کہ وہ میرے بس کی  
نہ ہے۔ مجھے بری طرح تھکا دیتی ہے۔ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ میں ہارے ہوئے سپاہی کی  
حالت چھا کر سو جاتا ہوں۔“

ایک رات وہ مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی اور میں اسے  
رونا نہیں چاہتا تھا۔ عورت اپنی مرضی سے طلاق لے کر جائے تو جگ ہنسائی ہوتی ہے۔  
اپنی کمزوری دنیا والوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ مجھے چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دے۔  
اس گھر میں رہے گی تو میری عزت بنی رہے گی لیکن عورت صرف شہ زور کے بس میں  
استیلا کرتی ہے، کمزور کے آگے شیرینی بن جاتی ہے۔ اس نے صاف طور سے کہہ

دیا کہ اگر میں نے اسے یہاں رہنے پر مجبور کیا تو وہ کسی کو اپنا یاد بتالے گی۔  
یہ اور زیادہ بدنامی کی بات تھی۔ نہ تو میں اسے چھوڑ سکتا تھا نہ اس کے  
برداشت کر سکتا تھا۔ میری مردانگی کا بھرم اسی طرح قائم رہتا کہ وہ مر کر ہی اس  
نکلتی۔ پہلے تو غصہ کی حالت میں سوچا کہ اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالوں لیکن وہ  
نگزنی ہے۔ مجھے ہی پچھاڑ دیتی۔ آخر میں نے سب سے آسان راستہ اختیار کیا۔  
دو بخار میں مبتلا تھی۔ میں نے دوا کے بہانے اسے زہر پلا دیا۔ زہر پیتے ہی وہ بڑبڑ  
ٹھنڈی ہو گئی۔

مجھے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ میں زہر دینے کے الزام میں پکڑا جاؤں گا۔  
ڈاکٹر نے دی تھی۔ میں نے اس میں زہر کے چند قطرے پٹکائے تھے۔ پولیس اس  
تو میں صاف مکر جاتا۔ بھلا مجھ جیسا محبت کرنے والا شوہر اپنی حسین بیوی کو زہر  
سکتا ہے۔ ڈاکٹر کی دوا غلط تھی لہذا ڈاکٹر پر الزام آتا۔  
میں بہت دیر تک ریشمی کی لاش کے قریب بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر غصے میں  
وینے کے خیال سے اٹھ گیا۔ دیکھئے نواز بابو، ریشمی کی لاش اس کمرے میں تھی۔  
سے چلتا ہوا اس کمرے میں آیا۔ پھر باہر جانے کے لئے میں نے یہ دروازہ کھولا تو  
سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ باہر برآمدے میں ریشمی کھڑی ہوئی تھی۔  
گھور کر دیکھ رہی تھی۔

میں نے ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کر دیا۔ میرا سارا بدن خوف سے  
کانپ رہا تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد میں نے خود کو منہ لاپٹ کر  
بند ہو چکا تھا اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس لئے وماغ نے کہا وہ غصے  
تھا۔ ریشمی تو مری پڑی ہے۔ وہ بھلا برآمدے میں کیسے پہنچ جائے گی؟  
میں اپنے اطمینان کے لئے اس کمرے میں گیا تو اس کی لاش جون کی ٹول  
پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا لیکن اس  
کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔  
تیزی سے چلتا ہوا آگن میں گیا۔ مجھے کسی طرح تھانے تک پہنچنا تھا۔ اس لئے میں  
نکلنے کے لئے پچھلا دروازہ کھولا تو مارے دہشت کے میری گھٹی بندھ گئی۔  
دروازے کے باہر میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔

میں اس کی گھورتی ہوئی نظروں سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہاں سے پلٹ کر بھاگتا ہوا پھر اس کے کمرے میں آیا۔ ریشمی کی لاش اسی طرح کھاٹ پر پڑی ہوئی تھی وہ مردہ تھی اور زندہ بھی تھی۔ میں حیات اور موت کے درمیان گھبرایا گھبرایا سا ادھر سے ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ باہر نکل سکتا تھا نہ گھر میں سکون سے بیٹھ سکتا تھا۔ چیخنے چلانے کا خیال آیا کہ محلے والوں کو مدد کے لئے پکاروں لیکن دل میں یہ خوف بھی سما یا ہوا تھا کہ چیخے ہی وہ میرا گلا دو بچ لے گی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میں یہاں اس کوٹے میں دیک کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے یہ دروازہ بھی نظر آ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی لاش بھی نظر آ رہی تھی۔ صرف آنگن کا پچھلا دروازہ نگاہوں سے اوجھل تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں وہاں جا کر اسے بند کر دیتا۔

میں ساری رات اسی طرح بیٹھا رہا۔ سب صبح کی ہلکی ہلکی سی روشنی جھلکنے لگی تو وہ آنگن کے کھلے ہوئے دروازے سے اس کمرے میں آگئی۔ اس نے کھاٹ کے پاس آکر اپنی لاش کو دیکھا۔ پھر وہ کھاٹ پر اس طرح لیٹ گئی کہ ایک روح کی مانند اس لاش کے اندر سا گئی۔ دوسرے ہی لمحے مردہ ریشمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دوبارہ زندہ ہوتے ہی وہ مجھے گھورنے لگی اور کھاٹ سے اتر کر آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگی۔ میں خوف سے لرزے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ فرار کے تمام راستے روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، اس لئے وہاں سے بھاگنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ میرے قریب آئی اور میری گردن دو بچ کر دانت پیستی ہوئی بولی۔

”تم نے مجھے زہروے کر مار ڈالا ہے۔ میں مر چکی ہوں مگر ذہریلی ڈائن بن کر بیشمار تمہاری گردن پر سوار رہوں گی۔ اگر تم نے کسی سے یہ کہا کہ میں عورت نہیں ڈائن ہوں تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔“

”نہیں.....“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ ”مجھے معاف کر“

”میں مرنا نہیں چاہتا۔ تم جو کہو گی، میں وہی کروں گا۔“

”میں جو کروں گی، اسے تم خاموشی سے دیکھو گے اور گونگے تماشائی بن کر رہو گے۔“

”ہاں۔ مجھے منظور ہے۔ میری گردن چھوڑ دو۔“

اس نے میری گردن چھوڑ دی اور آنگن کا دروازہ بند کرنے چلی گئی۔ اس دن سے

یہ ڈانٹ میرے پاس ہے۔ دانا کے وقت دوسروں کے سامنے یہ بڑی فرمانبرداری کی رہتی ہے۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرتی ہے۔ ابھی میں نے آپ کے سامنے اسے بازار دکاندار سے پیسے وصول کر کے لانے کے لئے کہا تو وہ چپ چاپ چلی گئی لیکن تھوڑے لمحے سے نفرت کرتی ہے، مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ پھر رات ہوتے ہی نام بستر پر جا کر لیٹ جاتی ہے اور لیٹتے ہی صبح تک کے لئے مرجاتی ہے۔

یہ کہہ کر روضہ چار ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس نے اب تک جو کہہ میں اسے بکواس سمجھ رہا تھا۔ اس کی رام کہانی کے مطابق ریشمی زندہ نہیں تھی، مرے بعد چڑیل بن گئی تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی بات کا یقین کر لیتا لیکن میں پچھلے دن اس حینہ کے ساتھ گزار چکا تھا۔ اس کے ریشمی بدن کے ایک ایک حصے کو چھونے چومنے کے بعد یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ چڑیل اتنی حسین اور دل نشین ہو سکتی ہے بکواس کر رہا تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ شاید اسے میرے اور ریشمی کے ناجائز تعلقات کا علم ہو گیا ہے چونکہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھا، غریب تھا۔ مجھے لگا کہ نہیں سکتا تھا اس لئے ایسی ہی من گھڑت کہانی سنارہا تھا کہ میں اس حینہ کو چڑیل سمجھ کر خوفزدہ ہو جاؤں اور اس کا ڈر دل سے نکال دوں۔

میں نے اس کی حماقت پر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیا چڑیل بن کر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ ابھی تو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی ہے لیکن مجھے نقصان پہنچ سکتی ہے۔ وہ اکثر آدھی رات کو قبرستان کے پچھواڑے جاتی ہے اور وہاں ایک کاٹھ کے پتے سے منہ کالا کرتی ہے۔“

”کاٹھ کا پتلا۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا کاٹھ کے پتے میں جان بڑھتی ہے؟ پھر تم کچھ بھول رہے ہو۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ وہ راتوں کو مرجاتی ہے۔ پھر وہ دن کے وقت قبرستان کی طرف کیسے جاتی ہے؟“

”میں نے غلط نہیں کہا ہے۔ وہ راتوں کو مرجاتی ہے۔ تمام رات اس کی لاش ان کمرے میں پڑی رہتی ہے چند راتیں اس لاش کے ساتھ گزارنے کے بعد میرے دل کی دہشت کچھ کم ہو گئی تھی لیکن میں سکون سے سو نہیں سکتا تھا۔ ایک رات میں نے

ہو کر تھر سے باہر نکل گیا۔ سوچا کہ دیکھو چہار کے ہاں جا کر سو جاؤں گا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے جب میں قبرستان کے پیچھے سے گزرنے لگا تو وہاں ریشی کو دیکھ کر پھر مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میں نے سمجھا کہ وہ پھر میرا راستہ روکنے آگئی ہے لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بھی انجان بن گئی تھی۔ اس وقت وہ انگریزی عورتوں جیسا لباس گاؤں اپنے ہوئے تھی۔ اس کی دائیں ہتھیلی پر کسی مردہ انسان کی کھوپڑی تھی اور وہ کاٹھ کے ایک پتلے کے سامنے رقص کے انداز میں لہرا رہی تھی۔

رمضو چہار کی یہ بات سن کر میرا یقین ڈگر گانے لگا۔ مجھے وہ انسانی کھوپڑی یاد آگئی جو قیب میں لٹھکتی جا رہی تھی لیکن میں نے تو اس کی دائیں ہتھیلی پر پھولوں کا گلہ مستہ دیکھا تھا۔ پھولوں بھرے گلہ مستے اور مردہ انسان کی کھوپڑی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میں رمضو چہار کا یہ بیان سن کر الجھ گیا کیونکہ وہ ریشی کے رقص کرنے کا جو انداز پیش کر رہا تھا وہ میری چشم تصور میں واضح ہوتا جا رہا تھا۔ میں کاٹھ کے پتلے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا اور ریشی رقص کے ذریعے مجھے لہانے کے انداز اختیار کر رہی تھی۔

پھر رمضو کے بیان کے مطابق وہ پتلا اس پر جھک گیا تھا (جیسا کہ میں اس پر جھک کر اسے چوم رہا تھا) اس کے بعد وہ قبرستان کی ویرانی میں ریشی کے ساتھ گناہ کی تاریکی میں ڈب رہا تھا۔

وہ جو کچھ بیان کر رہا تھا میں اس رنگین اور نیکیں واقعہ سے گزر چکا تھا اور اب میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جب تک وہ رقص کرتی ہوئی میرے قریب نہیں آئی تھی۔ اس وقت تک میں ایک کاٹھ کے پتلے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔

میرے جسم میں اندر ہی اندر جھرجھری سی پیدا ہوئی میں اس وقت فیصلہ نہ کر سکا کہ واقعی میں بے جان پتلا بن کر رہ گیا تھا یا نہیں اور میں نے واقعی اس کھوپڑی کو لڑھکتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں؟ میں تذبذب میں رہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا اس کاٹھ کے پتلے کی کوئی شکل و صورت تھی؟“

”ہاں اس کی شکل و صورت تھی۔“ رمضو نے جواب دیا۔ ”پچھلی کئی راتوں تک میں اس پتلے میں ایک اجنبی نوجوان کی صورت دیکھتا رہا۔ جب اس کا شیطانی ناچ مکمل ہو جاتا ہے اور جب وہ اس کے قریب آ جاتی ہے تو اس پتلے میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ پتلا اس اجنبی نوجوان کے روپ میں مکمل ہو کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور مردہ

کھوپڑی اس کی پھیلی سے لڑھک کر زمین پر آجاتی ہے۔

سب کچھ وہی تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میرے تجربے کے عین مطابق کہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے کچھ اور زیادہ چونکا دیا۔

”نواز بابو! اب جو بات میں کہنے جا رہا ہوں شاید اس پر آپ یقین نہ کریں۔ رات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کل رات کاٹھ کے پتے میں اس اجنبی نے صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ صورت بدل گئی تھی اور وہاں آپ کی شکل نظر آتی تھی۔“

میں چونک کر رمضو چمار کو دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ وہ کاٹھ کا پتلا آپ کی صورت اور اس کی جسامت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آپ یقین کریں کہ کل رات سے پہلے وہ جس نوجوان کے ساتھ گناہ کا شیطانی کھیل نکھلتی تھی اس سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس کا کل رات اس نے اپنے شیطانی عمل سے آپ کو وہاں بلایا تھا۔ پتہ نہیں آپ کو اس کا علم ہے یا نہیں لیکن میں نے کل رات ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو ساری باتیں بتا دوں گا۔ آپ شریف آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اس کے قریب میں آکر ہو جائیں۔“

اس کی باتیں سن کر میں عجیب الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی باتیں صد اذیت پر مبنی تھیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا لیکن اس سے پہلے میں ان پر سنجیدگی سے غور کرتا رہیسی وہاں آگئی۔ وہ دروازے پر کھڑی رمضو چمار کو کر دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کا سناؤ اس کے متعلق الٹی باتیں کر رہا ہے۔ اس دقت میں اس کی گھورتی آنکھوں پر توجہ نہ دے سکا کیونکہ گھر اور چوٹی میں کسا ہوا بدن میری نگاہوں کو پکار رہا تھا اور پچھلی رات کے جذباتی لمحے زندہ کر رہا تھا۔

وہ خاموشی سے رمضو کے پاس آئی۔ دس دس کے چند نوٹ اس کے سامنے اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ روپے وہ کلنڈر سے وصول کر کے لائی تھی۔ کے جلنے کے بعد رمضو نے دبی زبان سے کہا۔

”نواز بابو.....! جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ میں کہہ چکا۔ اگر آپ خود قبرستان



پھوڑے جلتے ہیں تو آئندہ اس سے پرہیز کریں۔ اگر وہ شیطانی عمل سے آپ کو بلاتی ہے تو آپ فوراً کسی عامل سے رجوع کریں۔“

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اس کی باتوں پر غور کروں گا۔ وہاں آدھ گھنٹے تک بیٹے رہنے کے دوران ریشمی دو چار بار میرے سامنے آئی۔ اس نے رمضو کی نظریں بچا کر پدے ملکاتے ہوئے اشارے سے کہا کہ آج رات ہم پھر اس جگہ پر ملیں گے۔ اگرچہ رمضو کی باتوں نے مجھے متاثر کیا لیکن ایک جوان اور حسین عورت کے اشارے سے رمضو کی باتوں سے زیادہ رشتہ تھے اور میرے دماغ میں ایک مچلتے ہوئے شہاب کی دیکھی اور چکھی دلی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس بار قبرستان جاؤں گا تو محتاط ہو کر ریشمی کی شیطانی اور انسانی واؤں کا مطالعہ کروں گا۔ ذاتی تجربات سے گزرے بغیر میں رمضو کی باتوں پر چین نہیں کرنا پاتا تھا۔

میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے اطلاع ملی کہ رمضو ہمار خون کی نئے کوئے کے بعد مر گیا ہے۔ اس کی اچانک موت سے میرے ذہن کو زبردست جھٹکا پہنچا۔ ریشمی دوبارہ زندہ ہونے کے بعد اسے دار تک دے چکی تھی کہ اگر تم نے کسی سے کہا کہ میں عورت نہیں ڈاؤن ہوں تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ ریشمی نے گلا گھونٹا ہو اکئی دسرا عمل کیا ہو، مگر حال اس کے چیلنج کے مطابق رمضو اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد مجھے ریشمی کے پیچھے نہیں جانا چاہئے تھا۔ مگر اب میں کیا کموں؟ ایک شرابی کو شراب کس طرح پکارتی ہے؟ ایک حسینہ اپنے دیوانے کو اپنی طرف کس طرح کھینچتی ہے؟ میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ چھپلی رات اس نے اپنے جسم کے جوڑھکے چھپے خزانے مجھے پیش کئے تھے میں ان خزانوں کی جستجو میں ہر رات اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتا رہا۔

وہ ایک بوہ کی حیثیت سے رمضو کی جھونپڑی میں زندگی گزار رہی تھی اور رات کو قبرستان کے پچھواڑے مجھ سے رنگ رلیاں مناتی تھی۔ ایک رات اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرے سچے کی ماں بننے والی ہے۔

میں نے کہا۔ ”بچہ ضائع کر دو۔“

اس نے کہا۔ ”کیسے ضائع کر دوں؟ کیوں ضائع کر دوں؟ رمضو اس قابل نہیں ہے اس کے بچے کی ماں بن سکتی۔ اس لئے میں نے تم جیسے خورد مرد کا احتساب نہیں کیا۔ میں اس ہونے والے بچے کی ماں ہوں اور تم باپ ہو اور ہم دونوں اس سچائی سے نہیں کر سکتے۔“

یہ سچ ہے کہ سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن بعض حقیقتوں سے چشم پوشی جاتی ہے۔ اگر بیابتا بیوی سے اولاد ہو تو ہم اسے اپنا خون اور اپنا وارث کہتے ہیں۔ داشتہ کے بطن سے دیی اولاد ہو تو ہم اس کے حقوق سے انکار کرتے ہیں۔ حلالہ کے بھی ہمارے خون کی ایک بوند سے ہوتا ہے لیکن عزت داری کے لئے ہم فرد اولاد سے کراں حقیقت سے انکار کر دیتے ہیں۔

میں نے انکار کیا تو وہ جھلا گئی۔ عورت شریف ہو، بدکار ہو یا چڑیل ہو، برداشت نہیں کرتی کہ باپ اپنی اولاد سے متنفر ہو۔ پہلے تو میں نے اسے سمجھایا کہ باپ بننے کا الزام نہ دے لیکن وہ بغض تھی کہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ میں تب میں نے بھی اسے جھنجھلا کر گالیاں دیں کہ نہ بہانے وہ اب تک کتنوں سے کر چکی ہے اور بچے کا باپ مجھے بنا رہی ہے۔ مجھ جیسا شریف آدمی ایک چار عورت بطن سے جنم لینے والے بچے کا باپ نہیں بن سکتا۔

جب محبت ہوں اور گناہ کا انجام ایک بچے کی صورت میں سامنے آئے تو ہم اس کے سمن و شباب کی تمام جاذبیت ختم ہو جاتی ہے اور وہاں سے نفرت و عدالت ہو جاتی ہے۔ ریشمی نے کہا، اگر میں نے اس بچے کا باپ بننے سے انکار کیا تو وہ مجھے بستی میں بدنام کر دے گی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اسے رمضو چمار کی اولاد بنائے اس کے اخراجات پورے کروں گا لیکن وہ صرف اخراجات ہی نہیں بچے کا جائز مال مانگ رہی تھی اور مجھے دھمکی دے رہی تھی کہ میری شرافت کے اہلے دامن پر اس کا وارغ ضرور لگائے گی۔

ایک تجربہ میرے سامنے تھا کہ اس نے رمضو چمار کو دھمکی دی تھی اور اس کے مطابق رمضو کو ہمیشہ کے لئے ختم کرویا تھا۔ اس طرح وہ میری عزت پر کچھ راجہ تھی مجھے خطرے کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کے بالوں کو بائیں ہاتھ کی جکڑ لیا۔ میں نے سنا تھا کہ چڑیل کے بال مٹھی میں آجائیں تو وہ اطاعت اور فرماؤں

تی ہے۔ اگر وہ جنرل نہیں عورت تھی تو ایسی صورت میں بھی عورت کی چوٹی  
 نہ ہونی چاہئے۔ وہ چوٹی پکڑ کر جدمھر چاہے ادھر عورت کو گھما سکتا ہے۔

یوں میں ہوں پتھر پتھر کی طرح۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گروں کی طرف کی اس جرات پر وہ بھڑکتی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گروں کی طرف انداز میں تھاکہ وہ میرا گلا گھونٹنا چاہتی تھی جیسا کہ اس نے کبھی رمضو کو دھمکی لیکن میں رمضو کی طرح کمزور اور بزدل نہیں تھا۔ ایسا صحت مند نوجوان تھا کہ دو عورتوں کو دونوں بازوؤں میں لے کر ان کا کچھو مریٹا دیتا۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو پرے جھٹک کر اس کی گردن دیوچ لی۔ اس کی خون آگشتی ہوئی سرخ لہجے گھور رہی تھیں۔ اس نے کہا۔

نے چھوڑ دے۔ اگر میں مرگئی تو میرا بچہ تم سے انتقام لے گا۔ تم چوہے کے بل میں نہ پڑنا لو گے تو وہ وہاں بھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔.....“

کہہ کر رب نواز یک لخت خاموش ہو گیا۔

ہاکی خاموشی بے معنی نہیں تھی۔ ہاشم علی کو بھی ایسی آہٹیں سنائی دیں جیسے کوئی آ رہا ہے۔ ویننگ ردم میں وہ دونوں تھما تھے۔ کوئی تیسرا نہیں تھا۔ پھر یہ تیسری

دونوں محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ دینگ دم کا دروازہ بند تھا۔ ٹائلٹ کا دروازہ بھی انہوں نے بند کر رکھا تھا۔ کمرے میں لائٹیں کی زد رہی تھی کہ کسی تیسرے کا وجود نہیں ہے۔ باتیں کرنے اور کھانے کے دوران گوشت کا سالن ختم کر دیا۔ اب میز پر ہڈیوں کی مٹھی بھر پڑی نظر آ رہی تھی۔ اہل زندگی کا اختتام یہی ہے کہ صرف ہڈیاں رہ جاتی ہیں۔

انہوں نے بیک وقت سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ کپھریل کی چھت ہولے سا بڑی تھی جیسے کوئی دبے پاؤں کپھروں سے گزر رہا ہو لیکن وہ دہم بھی ہو سکتا تھا۔ ختم ہو گئی تھیں۔ جب سنانا چھا جائے تو ہر بات دہم و دنگل کے زمرے میں آئے گی۔

ہاں نواز کا بلیاں ہاتھ اب تک کبیل کے اندر تھا یعنی شدید سردی کے باعث وہ بیٹھ کر اندر سے تھامے ہوئے تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کو میز پر ٹیک کر اٹھ گیا اور اچھٹا جمل وہ پہلے بٹھا تھا۔ اب وہ دونوں پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے

تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک گول چیز تھی جس کا قطر دو گز کے قریب تھا۔ ہاشم علی نے اسنو پر چائے کی کیتلی رکھتے ہوئے پوچھل۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر وہ مر گئی۔۔۔۔۔ میں اسے ٹوٹی ہوئی ایک قبر کے پاس چھوڑ کر عزت رہ گئی۔ اب وہ مجھے بدنام کرنے کے لئے زندہ نہیں تھی۔“

”سات ماہ کے بعد ایک صبح بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ قبرستان کے پچھلے ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس ایک نوزائیدہ بچہ پایا گیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی میرے دل میں ریشمی چیخنے لگی، اگر میں مر گئی تو میرا بچہ تم سے انتقام لے گا۔۔۔۔۔ میرا بچہ تم سے لے گا۔“

وہ دن میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ رات آئی تو کروٹیں بدل بدل کر دلی۔ دوسری صبح معلوم ہوا کہ دو چار نے اس بچے کو گود لیا ہے اور اب پرورش کر رہا ہے۔ جانے کیوں مجھے اس بچے سے عداوت ہو گئی؟ مجھے اس وقت کا احساس ہوا۔ اس رات گھبراہٹ میں، میں اس کی موت کی تصدیق نہیں کر سکا تھا۔ ماہ کی حاملہ تھی اور اس کے سات ماہ بعد ٹھیک اسی ٹوٹی ہوئی قبر کے پاس وہ نوزائیدہ گیا تھا۔

میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ وقت گزرتا رہا اور بچہ پر دان چڑھتا رہا۔ ہمارے گود سے نکل کر آنگن میں کھیلنے لگا۔ پھر آنگن سے نکل کر محلے کے بچوں کے کھیل میں شریک ہو گیا۔ مجھے خاص طور سے ایک بات کا علم ہوا کہ وہ بھی شال سے گزرتا تھا وہ بچہ اپنے کھیل کر بھول جاتا تھا اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگتا تھا۔ بستی میں اور بھی لوگ موجود تھے مگر وہ انہیں دشمن کی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ ایک میں ہی تھا کہ جب وہ مجھے دیکھتا تو ریشمی کی گھورتی ہوئی آنکھیں مجھے یاد آ جاتی ہیں خود کو سمجھاتا تھا کہ یہ محض میرا وہم ہے ورنہ ایک بچے کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ پھر یہ بات دل میں جگہ بناتی کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میرے لو کی ایک بوند ہے۔ کا دشمن نہیں بن سکتا تھا۔ ایسے وقت ریشمی پھر میرے دماغ میں چیخنے لگتی۔ ”اگر گئی تو میرا بچہ تم سے انتقام لے گا۔۔۔۔۔“

اب میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس بچے کے ذہن میں ریشمی کے انتقام ہوا ہے اور وہ ہاتھ میں مخجر لئے میرا پیچھا کر رہا ہے۔“

”خیر.....؟“ ہاشم نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا وہ خیر سے آپ پر حملہ کرتا ہے؟“  
 ہاں..... پتہ نہیں اس نے خیر زنی کہاں سے سیکھ لی ہے۔ اس کے دونوں  
 میں بڑی پھرتی ہے وہ دو خیروں کو ان کی نوک سے پکڑ کر دائیں اور بائیں دونوں  
 سے چاٹنا لگتا ہے۔“

ب نواز کی باتیں سن کر ہاشم کے دونوں ہاتھ بے اختیار اس کے اوپر کوٹ کی  
 بیوں میں گئے۔ ان دونوں جیبوں کی تہ میں دو چاقو رکھے ہوئے تھے۔  
 شرم علی کی جیبوں میں وہی دو چاقو تھے جن کا ذکر رب نواز کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے  
 بعد نواز کی کہانی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس وقت میں ہاشم علی سوچنے لگا۔  
 یہ خیر زنی کا ماہر ہوں۔ دور دور تک میرا کوئی غائب نہیں۔ دونوں ہاتھوں سے بیک  
 اپ ہی ٹارگٹ پر خیروں کو پوسٹ کر دینے کا کمال صرف مجھے حاصل ہے۔ یہ رب  
 دشمن کا ذکر کر رہا ہے؟ اس کی زندگی کے کچھ واقعات میری زندگی کے کچھ  
 سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے خیر زنی میں جو کمال حاصل ہے وہی اس کے دشمن  
 حاصل ہے۔

مجھے اب ذرا محتاط رہنا چاہئے۔ رب نواز کے علم میں یہ بات نہیں لانی چاہئے کہ  
 اب میں دو عدد چاقو ہیں اور اس کے دشمن کی طرح مجھے بھی خیر پھینکنے میں کمال  
 ہے۔ یہ بات اگر اسے معلوم ہو گئی تو یہ مجھے اپنا دشمن سمجھے گا کیونکہ میری طرح یہ  
 بڑے دشمن کو اس کے چہرے سے نہیں پہچانتا.....

اشم علی کی سوچ ختم گئی۔ اس نے اسٹو کو بھایا اور کیتلی اٹھا کر دو چالیوں میں چائے  
 کے بعد ایک پانی رب نواز کی طرف بڑھا دی۔ پھر اس نے پوچھا۔  
 ”کیا وہ کچھ آپ پر حملہ کرتا ہے؟“

”اب وہ کچھ کہاں رہا۔ وہ تو نوجوان ہو چکا ہے لیکن اس نے کبھی مجھ پر حملہ نہیں  
 کیا کوئی اور ہے جو مجھ پر حملہ کرتا ہے چونکہ ہمیشہ رات کا وقت ہوتا ہے اس لئے اس  
 واضح نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ میرے لئے ایک اجنبی رہا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر کا کچھ  
 بدل کر آتا ہے۔“

”بچائے کی چکی لینے لگا۔ ہاشم نے پوچھا۔

”آپ اس کے حملوں سے کیسے بچتے رہے؟“

”مجھ میں اتنی صلاحیتیں نہیں ہیں کہ میں اس کے حملوں سے بچ سکوں۔ وہ مجھ پر حملہ کرتا ہے اور خود ہی میری جان لینے سے گریز کرتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے جب بھی میرا اور اس کا سامنا ہوتا ہے تو میں مارے دہشت کے ایک بت کی طرح ہوجاتا ہوں۔ وہ میرے مقابل اپنے دونوں ہاتھوں میں خنجر تولتا ہے اور خنجر پھینکے کہتا ہے..... ”خاموش کھڑے رہو۔ ابھی ایک خنجر تمہارے دائیں کان کے قریب گزرے گا اور دوسرا خنجر تمہارے بائیں کان کے قریب سے گزرے گا۔ اگر تم نے بھی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔“

یہ کہہ کر وہ پہلا خنجر پھینکتا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کا نشانہ کتنا میرے کان کے قریب ہوا کا ہلکا سا جھونکا محسوس ہوتا ہے اور خنجر شانیں سے گزرتا ہے۔ بائیں ہاتھ سے پھینکا ہوا خنجر بھی اسی طرح میرے دائیں کان کے قریب سے ہوا نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے۔ ”میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا اتنی جلدی نہیں ماروں گا۔ اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ نوچندی جمہرات تمہاری آخری رات ہے۔ اس وقت تک تم موت کے انتظار میں لمحہ لمحہ جیتے رہو اور رہو۔“

یہ کہہ کر وہ چلا جاتا ہے۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ وہ آتا ہے۔ میرے دائیں بائیں کان کے قریب اپنے نشانے بازی کی دھاگ جھاتا ہے اور موت کی معین رات کی یاد دلاتا جاتا ہے۔ میں اکثر کیلنڈر کو گھور گھور کر دیکھتا رہا، مینے گزرتے گئے، دن گزرتے گئے جمہرات قریب آتی گئی اور ہر دن اور ہر لمحہ میرے دل کی دہشت بڑھتی جاتی اور میں سے کھوکھلا ہوتا گیا۔ جب دشمن کے سامنے ہاتھ پاؤں شل ہو جاتے ہوں، وہاں سے کر سکتا ہوں۔ کیسے اپنی حفاظت کر سکتا ہوں؟ حفاظت کی کوئی تدبیر نہ سوچھی تو میں کر پینکڑوں میل دور یہاں چلا آیا ہوں..... آج نوچندی جمہرات ہے ناں.....

”ہاں.....!“ ہاشم نے سسے ہوئے لہجے میں کہل۔ ”یہ جمہرات کی رات معلوم ہوتا ہے کہ میرا اور آپ کا دشمن ایک ہے۔ میرے دشمن نے بھی میری موت لئے یہی رات مقرر کی ہے۔“

”اچھا..... کیا واقعی.....؟“ رب نواز نے حیرانی اور پریشانی سے اسے دیکھا۔

”لیکن ہم..... ہم محفوظ ہیں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔“ وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔

ہم نے کہا۔ ”ہاں دروازہ اندر سے بند ہے۔ ٹائلٹ کا دروازہ بھی بند ہے۔ یہاں بے میں وہ نہیں آسکے گا۔“

چپ ہو گیا۔ پھر دونوں سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک آدھ جگہ بچ رہی تھیں۔ آواز ایسی تھی جیسے سردی سے کسی کے دانت کٹکٹا رہے ہوں یا ت دانت کچکا رہی ہو۔ وقت اور ماحول کے مطابق آواز کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ بردہ آواز مرگئی۔ ہاشم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”شاید کوئی ملی تھی۔ اب نہیں ہے۔ بھاگ گئی ہے۔“

ہاں۔ ملی ہی تھی۔ ویسے بھی چھت مضبوط ہے۔ شکاف چھوٹا ہے۔ شاید ملی بھی ف سے نہیں گزر سکے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم بہت زیادہ سستے ہوئے ہیں اس مای آہٹ بھی ہمیں زلزلے کی طرح سنائی دیتی ہے۔ ہمیں ذرا ہمت بے کام لینا۔ ہم اسی طرح باتیں کرتے رہیں گے تو یہ رات جلد ہی گزر جائے گی۔ آپ بتائیں ادشمن کون ہے اور آپ کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟“

ہاشم علی جواب دینے سے پہلے چائے کے چند آخری گھونٹ لینے لگا۔ اس کے بعد نے پانی کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”میری اور آپ کی زندگی کے چند واقعات ایک جیسے ہیں اس لئے میں مختصر طور پر برتا ہوں۔ میں نے آپ کی طرح کسی چڑیل سے تعلقات نہیں رکھے۔ وہ خود ہی ہنگے پڑ گئی تھی۔ ہواؤں کہ میری بیوی ساڑھ بے حد خوبصورت تھی مگر ہاتھ تھی۔ کے چھ سال بعد بھی ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ میرے کتنے ہی رشتے داروں نے شور مے دیئے کہ میں دوسری شادی کر لوں۔ اگرچہ مجھے اولاد کی بے حد تمنا تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد میری دولت اور جائیداد رشتے داروں میں تقسیم ہو۔ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی حسین بیوی کے لئے سو کن لاؤں۔ میں ساڑھ سے ہاتھ محبت کرتا تھا اور اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے زانے سے ایک بچے کو گود لے لیا۔ یتیم خانے کے رجسٹر میں اس بچے کا نام واجد علی ہم نے اس نام کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔“

اس کے ایک ہفتے بعد ہم نے واجد کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازمہ رکھی۔ ملازمہ آ رہی تھا اور اس کا رنگ و روپ بھی رائیوں کا سا تھا۔ وہ ہماری حویلی میں آتے ہی

مجھ پر ڈرے ڈالنے لگی۔ کبھی وہ مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی تھی کبھی بڑی مسکرا کر ادا نہیں دکھاتی تھی لیکن میں اس کی طرف مائل نہ ہوا۔ وہ لاکھ حسین میری سارہ کے حسن کے آگے خاک تھی۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ مجھے کمر اور کھرے کی تمیز تھی۔

ایک روز جب کہ سارہ حویلی میں موجود نہیں تھی وہ میرے کمرے میں آئی مجھ سے بے تکلف ہونے لگی۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں صرف سارہ کا دیوانہ ہوں۔ اگر مجھے اس سے شدید محبت نہ ہوتی تو میں اب دودھری شادی کر چکا ہوتا لیکن میں نے دودھری شادی نہیں کی بلکہ دوسرے کا بچہ کوٹ لیا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ”پرائی اولاد پھر پرائی ہوتی ہے۔ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ آپ کی جائیداد کا وارث پیدا کروں گی یہ بچہ جو یتیم خانے سے لایا گیا ہے بچہ نہیں کہہ سکتا ہے جائز ہے یا ناجائز ہے۔ یہ آپ کا وارث تو بن سکتا ہے مگر آپ فخر سے اسے نہیں کہہ سکتے۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اپنا خون جو اپنی عورت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اسے یہ سے لگا کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ پرائی اولاد سے نہیں ملتی۔ اپنی اولاد کی کیلئے ہمیشہ کھلتی رہتی تھی۔ اس کے باوجود میں اپنی سارہ کا مقام کسی دوسری عورت کو نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

”انسان کو اس کے نصیب سے زیادہ نہیں ملے۔ چرے نصیب میں واجد ہے اس واجد مجھے قبول ہے خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز۔“

”ابن کا مطلب یہ ہے کہ آپ جان بوجھ کر ایک ناجائز بچے کو اپنے سے لگا رکھیں گے؟“

”ہاں یہی سمجھ لو اور یہاں سے چلی جاؤ۔“ میں نے اس طرح ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی۔ اسے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ طغنائی ہوئی کمر سے جانے لگی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ پھر پلٹ کر بولی۔

”جب ایک مرجائے گی تب تو آپ دوسری شادی کریں گے۔ کوئی تمام عمر مر دلی کا موگ نہیں سنا۔“



سنتے ہی وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر چلی گئی۔ میں سائرہ کو اتنی شدت سے فٹا کہ اس کی موت کا تصور بھی میرے لئے روح فرسا تھا اور وہ رانی یاد دلا گئی تھی کہ مری بھی کتنی ہے اور اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بہت جلد مرنے والی ہو اور جلد دوسری عورت اس کی جگہ لینے والی ہو۔

اس کے دوسرے دن میں حویلی کے باغیچے میں گیا۔ سائرہ وہاں ایک ایزی چیئر پر اپنے چہرے کے سامنے پکھا جھل رہی تھی۔ وہ ایک چینی پکھا تھا۔ اس سے پہلے میں بارہ کے پاس ایسا پکھا نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کے قریب ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ نے نچے سے اپنے نصف چہرے کو چھپاتے ہوئے ایک ادائے ماز سے کہا۔

”دیکھئے اس نچے پر کتنی خوبصورت تصویر ہے۔“

میں نے دیکھا، نچے پر عمر نیام کی تصویر تھی۔ عمر نیام دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ کے سامنے ایک حسینہ رقص کے انداز میں پشت کی جانب خم کھائے ہوئے تھی۔ اس ہاتھ زمین پر تھا۔ دوسرا ہاتھ عمر نیام کی طرف اٹھا ہوا تھا اور اس ہاتھ کی ہتھیلی پر ب کا جام رکھا ہوا تھا۔

”بہت عمدہ تصویر ہے۔“ میں نے تعریف کی۔

سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لب دیکھئے۔ اس تصویر میں کچھ تبدیلیاں آجائیں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے نچے کو ذرا ہلایا۔ پکھا دائیں سے بائیں گیا تو واقعی تصویر میں دو تبدیلیاں ہوئیں۔ عمر نیام کی جگہ کاٹھ کا پتلا نظر آنے لگا اور حسینہ کی ہتھیلی پر جام ب کی جگہ ایک سروہ انسان کی کھوپڑی دکھائی دینے لگی۔

”آہ.....“ رب نواز نے چونک کر ہاشم علی کو دیکھا۔ ”ہاشم صاحب! آپ تو

مارٹینی کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔“

ہاشم علی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”جی ہاں۔ ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کی گی کے چند داتھات کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اس وقت اس چینی نچے پر انسانی کھوپڑی دیکھ کر چانے کیوں بکھے ایسا لگا جیسے میری سائرہ موت کے بالکل پ ہے۔ میرے دماغ میں رانی کی یہ بات گونجنے لگی کہ اگر ایسا مرجائے تو میں مری شادی ضرور کروں گا۔“

میں چند لمحات تک اس بچے کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ تصویر کا بدل جانا کوئی عجیب بات نہیں تھی، دو مختلف تصویروں کو ایک خاص پینٹس سے کاٹ کر شیشے کے ٹکڑے پر لپکھ کر بچے کی فولڈنگز پر اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ دیکھنے والے ذرا دائیں بائیں ہو کر دیکھیں تو تصویر بدل جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا جب ہندوستان تقسیم ہونے والا تھا تو دونوں قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان کی مشترکہ تصویریں اور گاندھی اور نہرو کی مشترکہ تصویریں اسی انداز میں تراش کر بازاروں میں فروخت کی جاتی تھیں۔

رب نواز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں اس طرح تصویریں بدل جاتی ہیں۔ اور دشمن بھی کچھ اسی انداز میں اپنا روپ بدلتا ہے۔“  
ہاشم علی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”میں نے وہ چینی پنگھا ساڑہ کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو اپنی تصویر ساڑہ کے قریب رہے جو موت کی یاد دلاتی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔ یہ پنگھا تم نے کہاں سے فریدا ہے؟“

”میں نے نہیں خریدا ہے۔“ ساڑہ نے جواب دیا۔ ”رائی کہیں سے لایا ہے۔ کہنے لگی بیگم صاحبہ، پسند ہے تو اے رکھ لیجئے۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ اس کے پیسے دیے جا رہے تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔“

”ساڑہ! میں حیران ہوں کہ تمہیں یہ پنگھا کیسے پسند آگیا؟ کیا یہ مردہ کھوپڑی تمہیں اچھی لگتی ہے؟“

”توبہ ہے۔ مجھے تو یہ کھوپڑی دکھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ میں تو صرف عرصہ دالی تصور دیکھتا ہوں۔ بچے کو بائیں طرف بھٹکتے وقت نظریں ہٹا لیتی ہوں۔ اس لئے کھوپڑی نظر نہیں آتا۔“

”نظر نہ آنے سے کیا ہوتا ہے، کھوپڑی تو اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ دیکھو ساڑا! تم سبانتی ہو کہ ہمارے خاندان ہی میں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں تو میں خاندان کی کسی لڑکی آپا لوں۔ اس کے لئے وہ تم پر جادو ٹوٹنے اور عمل بھی کر سکتے ہیں۔ تمہیں ایسی چیزوں سے محتاط رہنا چاہئے۔“

میری باتیں سن کر وہ خوفزدہ ہو گئی۔ میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا کہ رانی بچہ کی ماں بننا چاہتی ہے۔ ویسے میں نے سوچ لیا تھا کہ جلد ہی رانی کی یہاں سے کروں گا۔ میں نے اسی وقت ماچس نکالی۔ ایک تیلی جلائی اور اس پکھے کو آگ لگا

پکھے سے شعلہ بلند ہونے لگا۔ شعلے کے افق پر میں نے دد رکھڑی رانی کو دیکھا۔ اندے میں تھی اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ پکھے سے لپٹی ہوئی آگ جب اگلیوں تک پہنچنے لگی تو میں نے اسے پرے پھینک دیا۔ وہ غصہ سے طنطناتی ہوئی سے سے نکلی پھر تیزی سے چلتی ہوئی حویلی سے باہر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ملازمہ بیت سے واپس نہیں آئی۔

اس کے دوسرے یا تیسرے دن سائرہ کو حیز بخار چڑھا۔ وہ بستر پر بے چینی سے بی بدلتی تھی اور کہتی تھی کہ اس کے جسم میں سویاں چھپتی رہتی ہیں۔ میں نے ما اور ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرایا۔ روز بروز اس کی تکلیف اور بے چینی جاتی تھی۔ میں نے جھاڑ پھوسک اور تعویذ گندوں کا بھی سہارا لیا۔ اس طرح کو دقتی طور پر سکون مل جاتا تھا لیکن پھر وہی نادیدہ سویاں اس طرح جیسے لگتی جیسے زہریلی چوڑیاں کاٹ رہی ہوں۔ اب میں تفصیل کیا بیان کروں؟ میں اپنی حیات کو موت کے حد سے نہ بچا سکا۔ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اس دنیا سے ت ہو گئی۔

چند روز تک میں اس کی موت کا سوگ مناتا رہا۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا مادہ رہ کر رانی کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ میں تو اس پر تھوکتا بھی پسند نہیں کرتا نا نہ بانے کیسے بھری مرضی کے خلاف وہ میرے خیالوں میں چلی آتی تھی۔ مجھے رانی نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی اپنی سائرہ کو بھول کر کسی دوسری عورت کے تصور دہاؤں مگر یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ مجھے اپنی سوچ پر قابو نہیں تھا۔ میں دل ہی بے جھلا کر بتاتا اسے گالیاں دیتا تھا اتنی ہی بے شری سے وہ میرے تصور میں چلی آتی

آخر میں نے سوچا کہ مجھے ٹھنڈے دماغ سے کام لینا چاہئے۔ اگر وہ تصور میں آتی آتی رہے میرا کیا جاتا ہے۔ البتہ سامنے آئے گی تو میں اسے جوئے مار کر بھگاؤں

گا۔ میں ذرا نرم پڑ گیا تو وہ ذرا اور بے باک اور بے شرم ہو گئی۔ اب میرے خیال میں آکر اپنے لباس کو ادھر ادھر سے سرکانے لگی۔ راتوں کو نیند حرام کر دینے کا کتاب پیش کرنے سے پہلے اس کی چند سنسنی خیز جھلکیاں پیش کرنے لگی۔ میرا خیال کہ آدمی اخلاقی پابندیوں میں رہ کر خواہ کتنا ہی شریف بن جائے لیکن وہ کبھی سکریں پر خیالوں کی بلیو فلمیں ضرور دیکھتا ہے۔

ایک رات میں نے خواب میں اسے دیکھا۔ جس بات کو خیالوں میں چھوٹا وہ خوابوں میں بھی چلی آتی ہے۔ وہ بھی چلی آئی اور مجھے اپنی طرف بلائے لگی۔ یہ قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نیا لوں میں اس سے کتراتا تھا مگر خوابوں میں زود سا ہو کر بڑھتا چلا گیا۔ سچ پوچھئے تو وہ رانی کا مکمل چہرہ نہیں تھا۔ وہ رہ کر اس چہرے پر سارے کا چہرہ نمایاں ہو جاتا تھا۔ چینی چٹھے کی طرح زادیہ بدلتے ہی تصویر بدل جاتی تھی۔ کبھی رانی اور کبھی سارہ۔ اسی طرح جب وہ ایک بار سارہ نظر آئی تو میں نے کہا کہ اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ سارہ تبدیل ہو کر رانی نہ بن جائے۔ ایسے دقت یوں بھی چہرہ کون دیکھتا ہے۔ جذبات کی ہزار آنکھوں کے سامنے بدن کے لاکھوں نظارے اگڑائیاں لیتے ہیں۔ چہرہ دیکھ کر فرصت ہی نہیں چلی۔ وہ سارہ تھی یا رانی تھی کوئی بھی تھی۔ میں اس کے وجود پر ڈوب گیا تھا۔ جب جذبات کا نشہ ہرن ہوا تو میرے سائے میں رانی قہقہے لگاری غم میں پریشان ہو کر اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہاں سے بھاگتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ پھر فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرے بستر پر وہ نہیں تھی۔ کمرے میں بھی نہیں تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند تھے۔ نہ وہ میری خواب گاہ میں آ سکتی تھی نہ میں اس کے گیا تھا۔ وہ محض ایک خواب تھا۔

اس ایک خواب کو میں نے دوسری رات بھی دیکھا، تیسری رات بھی دیکھا اور تقریباً دو ماہ بعد ایک صبح میرے پاس آئی اور فخر سے بولی۔

”میں امید سے ہوں۔ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

میں اس الزام تراشی پر حیران رہ گیا۔ پھر میں نے اسے گالیاں دیں کہ نہ جانے وہ اب تک کس کے ساتھ گناہ کی زندگی گزارتی آئی ہے اور اب اس حرامی نے

ہے باری ہے۔ اس نے جواباً کہا میں تین راتیں اس کے ساتھ گزار چکا ہوں۔ ہر رات کے تفصیلی واقعات بتائے میں نے خواب دیکھا تھا، وہ حقیقت بیان کرنا۔ یہ کیسی عجیب اور انسانی بات تھی کہ خواب اور حقیقت کے ملاپ سے وہ بچے کی ماں بننے والی تھی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے.....؟ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہے۔ وہ میری آڑ لے کر اپنا گناہ چھپانا چاہتی تھی۔ اس طرح اسے وہ ہر فائدہ ہوتا۔ وہ اپنے بچے کو میری جائیداد کا وارث ساکتی تھی۔ اگر میں اسے ہوتا، مجھے فریب نہ دے سکی۔ میں نے ملازموں کو بلا کر اسے دھکے دے کر گھر سے

س رات میں نے پھر اسے نیند کی حالت میں دیکھا۔ اب میں اسے خواب نہیں ناکہ پھر خیال ہے، شاید میں کسی عمل کے زیر اثر نیند کی حالت میں چلتا پھرتا ہے بستر سے اٹھ کر خود ہی خواب گاہ کا وردازہ کھولتا تھا اور باہر جا کر کہیں رانی تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سی جگہ ہوتی تھی۔ وہاں سے واپس آکر پھر خواب گاہ کا اندر سے بند کرتا تھا اور اپنے بستر پر پہنچ کر نیند سے چومک جاتا تھا۔ اس وقت دیر پہلے کی تمام باتیں خوب معلوم ہوتی تھیں۔ بہر حال میں نے رانی کو ایک بار ملا حالت میں دیکھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔

تم اسے ہوا۔ اپنے بچے کو نابھارتہ کہتے ہو اور یتیم خانے سے لائے ہوئے ایک بچے کو اپنا بیٹا بنا کر رکھے ہوئے ہو مگر یہ یاد رکھو تمہارا بیٹا صرف یہی ہے جو میری سے جنم لینے والا ہے۔ یہی تمہاری دولت اور جائیداد کا حقدار ہے۔ اگر کسی نے حق جتایا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

انے اسے جواباً کیا کہا، یہ مجھے یاد نہیں۔ شاید میں کچھ نہ کہہ چکا تھا۔ اس کے اس گزر گئے، وہ خوابوں اور خیالوں میں نہیں آئی۔ تیسرے برس ایک بچے کو کا حویلی میں آئی۔ اس کے دعوے کے مطابق وہ بچہ میرا تھا۔ اس بار میں نے ان کو بلانے کی بجائے خود ہی اسے پکڑ کر اچھی طرح پینا۔ پھر اس کے بالوں سے کھینچتا ہوا حویلی سے باہر لے گیا۔ وہ چیختی رہی، چلاتی رہی۔ پھر اس نے ”میں عورت ہوں کمزور ہوں تم سے ہاتھ پاؤں نہیں کر سکتی۔ مگر یہ بچہ کمزور تو ہیں کا بدلہ لے گا اور اپنا حق تم سے زبردستی چھین لے گا۔ تم اس کی

حق تلفی کرنا چاہو گے تو یہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے بچے کا ہاتھ ہاتھ تھام کر اے میری نگاہوں کے کرتے ہوئے کہا۔

”اس ہاتھ کو اچھی طرح پہچان لو۔ ایک دن یہی ہاتھ تمہاری گردن پر گا۔۔۔۔۔۔“

میں نے اس بچے کے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چوڑی تھیں۔

”چھ انگلیاں؟“ رب نواز نے چونک کر پوچھا۔ پھر کمبل کے اندر اپنے ہاتھ کو اچھی طرح چھپانے لگا۔ اس کا ہاتھ ہاتھ شروع ہی سے کمبل کو اندر سے رکھنے کے لئے کمبل کے اندر ہی تھا۔ بس وہ چھپانے کی ایک اضطراری حرکت تھی۔

”ہاں، چھ انگلیاں!“ ہاشم نے تشریح کی۔ ”بعض لوگوں کی چھ انگلیاں ہوتی ہیں۔ چار انگلیاں تو عام لوگوں کی طرح ہوتی ہیں۔ پانچواں جو اٹھوٹھا ہوتا ہے، اس کو آٹھ

ایک اور چھوٹا اٹھوٹھا ہوتا ہے۔ شاید آپ نے بھی کبھی دیکھا ہو گا۔“

رب نواز بھلا کیا دیکھتا۔۔۔۔۔۔ خود اس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں یعنی ایک اٹھوٹھے پر دو مرا اٹھوٹھا چڑھا ہوا تھا۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا کہ اگر ہاشم کو پتہ چل گیا کہ اس کے سامنے بیٹے ہر شخص کے ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں تو وہ بلاشبہ اسے اپنا دشمن سمجھ لے گا۔ اب اسے محتاط رہنا چاہئے اور اپنے ہاتھ کو کمبل سے باہر نہیں نکالنا چاہئے۔

اس نے کمبل کو اپنے اطراف اچھی طرح لپیٹنے کے بعد کہا۔

”جی ہاں میں نے دیکھا ہے بعض لوگوں کی چھ انگلیاں ہوتی ہیں کیا آپ دشمن کو اس کے ڈبل اٹھوٹھے سے پہچانتے ہیں؟“

”جی ہاں، آپ کی طرح میں نے بھی اپنے دشمن کا چہرہ واضح طور سے نہیں ہے۔ اس کی چھ انگلیاں دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بچہ جو ان ہو چکا ہے اور انہیں

ہدایت کے مطابق مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ میں اس سے کمزور نہیں ہوں گا۔ چاہوں تو ایک ہی دار میں اسے ٹھنڈا کر دوں کیونکہ میری جیب میں ہمیشہ

ہاشم کتے کتے رک گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اس کی

میں دو چاقو ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ایک ہی نارگٹ پر لے سکتا ہے۔ یہ سن کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص بلاشبہ اے اپنا دشمن سمجھ دو تو اپنا خوفزدہ ہے کہ چاقو دیکھتے ہی دہشت سے اس کا دم نکل سکتا تھا۔

مذاہم علی نے فوراً ہی بات بدلتے ہوئے کہا۔  
میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری جیب میں کوئی ہتھیار نہیں ہوتا پھر بھی میں زین باکس ہوں۔ گھونٹے مارنا کر اس کا بھرتہ بنا سکتا ہوں لیکن آپ کی طرح میں دشمن کے سامنے سحرزدہ سا ہو جاتا ہوں۔ اسے مارنے یا اس کا حملہ روک کے اپنے ہاتھوں کو جنبش بھی نہیں دے سکتا۔ اس کا بایاں ہاتھ میری طرف بڑھتا مگر صدم کھڑہ جاتا ہوں اور وہ میری گردن دیوچ لیتا ہے۔

اف! میں جانتا تھا کہ اس کی چھ انگلیوں میں کتنی طاقت ہے۔ مجھے تو یوں کہ میری گردن کسی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے لیکن پھر بھڑکتا ہے۔ مجھے جان سے نہیں مارا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کے اور حالات ایک جیسے ہیں۔ میرے دشمن نے بھی مجھ سے یہی کہا ہے کہ نوچندی میری زندگی کی آخری رات ہے۔“

اب نواز کچھ دہشت سے اور کچھ حیرت سے منہ کھولے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم دیر کے لئے پپ ہو کر اس کا منہ تک رہا تھا۔  
رات دونوں کی زندگی کی آخری رات تھی۔  
دونوں زندگی کے آخری اسٹیشن پر آپہنچے تھے۔

ہنگ دم اندر سے بند تھا۔ اب ایسا کوئی راستہ نہیں تھا کہ ان کا دشمن کسی ہنگ دم کے اندر داخل ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی اپنی موت کو اس کمرے کے دکن دیا تھا۔

دو دونوں ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے کی بے سارے موت کا وقت ڈال رہے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہاشم کی دونوں مادی چاقو تھے اور رب نواز کے ہاتھیں ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔

رب نواز نے ہاشم کی مٹھی میں کبل کو اس طرح جکڑ لیا جیسے اپنے خیالی گلا گھونٹ رہا ہو ہاشم کے دونوں ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں چلے گئے۔ اس

نے بھی دونوں نچا توڑوں کو مٹھیوں میں پیچھ لیا۔ دراصل وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر کو احتیاطاً آزما رہے تھے کہ اگر دشمن آجائے تو کہیں وہ ہمیشہ کی طرح غرور سے ساکت تو نہیں ہو جائیں گے۔

چند لمحات تک بڑی عجیب سی بڑی سبب سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک عادت کے مطابق تھوک نلگتے ہوئے کہا۔

”جو دشمن محض دھمکیاں دیتا ہو، میں اس سے کبھی خوفزدہ نہ ہوتا ہوں۔ رات جبکہ اس نے میری گردن دیوچ کر میری موت کا وقت مقرر کیا تھا۔ دوسری صبح میرا لے پالک جینا داجد اپنے بستر پر مردہ پائیٹا گیا۔ کسی نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ اب آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ گلا گھونٹنے والا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ رب نواز نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے بائیں ہاتھ کو اچھی طرح چھپا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح چھپا ہوا تھا۔ ہاشم علی نے کہا۔

”وہ ذلیل دشمن خود کو میری تمام جائیداد کا حقدار کہتا ہے۔ ہاشم علی نے کہا۔ داجد کو مار ڈالا۔ وہ اپنے راتے کا ایک کاٹھا صاف کر چکا ہے لیکن اس سے کیا فائدہ؟ میں اس کم بخت کو کبھی اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔“

رب نواز نے کہا۔ ”لیکن اس طرح اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اس نے داجد کی موت کا وقت مقرر کیا ہے کہ وہ محض دھمکی نہیں ہے جس طرح اس نے آپ کے لے پالک بیٹے کو ہلاک کیا ہے۔ اسی طرح آپ کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔ پھر یہ کہہ کے لڑے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میری طرح آپ بھی اپنے دشمن کے ماتھے پر دست دبا ہو جاتے ہیں۔“

ہاشم نے سہمے ہوئے انداز میں مگرمی سانس لے کر کہا۔

”ہاں ہم دونوں کے ساتھ یہی مجبوری ہے لیکن یہاں اس کی آمد کا فائدہ ہے۔“

”ہاں۔ وہ یہاں نہیں آسکے گا۔“ دونوں پھر ایک بار محتاط نظروں سے اس طرف دیکھنے لگے۔ پھر ہاشم نے پریشان ہو کر کہا۔

”یہ رات نہیں گزر رہی ہے۔“

”ہاں ہماری باتیں ختم ہو گئیں مگر رات ختم نہیں ہو رہی ہے۔“



نہیں نواز صاحب باتیں ختم ہوں گی تو یہ رات ایک ناقابل برداشت بوجھ بن  
 ۛ ہمیں کچھ نہ کچھ بولتے رہنا چاہئے مثلاً ہمیں اپنی زندگی کے اس پہلو پر بحث  
 ۛ ہے جسے ہم دونوں جانتے ہیں۔ یعنی ہماری داستان حیات کے مطابق ہمارا جو  
 ۛ 'دہ ہمارا بیٹا ہے اور ہم دونوں اسے اپنی اولاد تسلیم نہیں کر رہے ہیں اور نہ  
 ۛ ہیں گے۔"

آپ درخت کہتے ہیں ہاشم صاحب! ہم ذرا غور کریں تو میری زندگی میں آنے  
 ۛ اور آپ کی زندگی میں آنے والی رانی ایک ہی تصویر کے دو رخ نظر آتے  
 ۛ کل چینی بچے کی طرح دائیں سے ہائیں ہوتے ہی تصویر ذرا بدل جاتی ہے لیکن  
 ۛ خاصیت نہیں بدلتی۔ ریشی نے جو میرے ساتھ کیا دہی رانی نے آپ کے

ب آپ ہی سوچئے کہ اگر ریشی کی کوکھ سے جنم لینے والا لڑکا میرا بیٹا ہے تو پھر  
 ۛ میری کوئی خوبی ہونی چاہئے۔ میں خنجر زنی نہیں جانتا۔ پھر یہ خنجر زنی کا کمال اس  
 ۛ پیدا ہو گیا؟"

شم نے دونوں جیبوں کے اندر چاقوؤں کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔  
 ۛ شاید اس نے کہیں سے یہ کمال سیکھ لیا ہے۔ ایسا ممکن ہے لیکن رانی جسے میرا  
 ۛ ہے اے تو میری طرح ہونا چاہئے مگر اس کا پایاں ہاتھ مجھ سے مختلف ہے میری  
 ۛ نہیں ہیں، پھر اس کی چھ انگلیاں کیسے ہو گئیں؟"  
 ۛ ب نواز کی چھ انگلیاں مٹھی کی صورت میں بچنی ہوئی تھیں۔ اس نے ہچکچاتے

ۛ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ باپ صحت مند ہوتا ہے اور بیٹا اپنا بچ پیدا ہوتا  
 ۛ خچ انگلیوں والے باپ کے ہاں چھ انگلیوں والا بیٹا ہو سکتا ہے لیکن ہم کیوں تسلیم  
 ۛ کہ ہماری اولاد ایک خنجریل کی کوکھ سے جنم لے سکتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کس  
 ۛ کا لفظ ہے۔ لعنت ہے اس پر ہزار بار لعنت ہے۔"

ۛ ہاں نواز صاحب! ہم اسی انداز میں کیوں نہ سوچیں کہ وہ دشمن کسی شیطان کی  
 ۛ ہے اور وہ ہمارے دو مختلف دشمن نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک ہی ہے یعنی کسی دشمن  
 ۛ ہاں ہاتھ میں چھ انگلیاں ہیں اور اسی دشمن کو خنجر زنی کا کمال بھی حاصل ہے، اچھا

یہ بتائیے کیا آپ نے اس خنجر چلانے والے دشمن کے ہاتھ کو غور سے دیکھا؟  
کیا اس کی چھ انگلیاں نہیں ہیں؟

”نہیں“ میں نے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں خنجر دیکھ کر  
ایسا دہشت زدہ ہو جاتا تھا کہ خنجر دھکے چمکتے ہوئے پھل کے سوا مجھے کچھ نظر نہ  
تھا۔ دیسے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارا دشمن ایک نہیں دو مختلف ہستیاں ہیں۔  
”وہ کیسے.....؟“

”وہ اس طرح کہ پہلے تو ہم یہ یقین کر لیں کہ دشمن ہماری اولاد نہیں ہے۔  
اس چیل نے اپنی اولاد کو ہماری جائیداد کا وارث بنانے کے لئے چال چلی ہے۔  
”ہاں یہی بات ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں۔“

”اب آپ یہ سوچئے کہ وہ چیل اپنے کالے علم سے ہمیں سحر زدہ کر رہا ہے۔  
آپ نے خرد یہ کہا ہے کہ آپ نیند کی حالت میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر  
کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں سحر زدہ ہو کر قبرستان کے  
جائے کر رہا تھا۔ دیکھئے میں بڑی اہم بات کہہ رہا ہوں۔ آپ توجہ سے سنیں۔ وہ ہمارے  
ایسے آدمیوں کو سحر زدہ کرتی ہے جن میں سے ایک خنجر زنی کا ماہر ہے اور دوسرا  
گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور جس کی چھ انگلیاں ہیں۔ اب اسے  
ہوتا آیا ہے کہ خنجر زن سحر زدہ ہو کر آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور مجھ پر نشانے  
کی دھاک بھاتا ہے اور چھ انگلیوں والا سحر زدہ ہو کر آپ کے پاس جاتا ہے اور ہمارے  
ہاتھ ہاتھ کے آہنی شکنے سے دہشت زدہ کرتا ہے۔“

”آں.....؟“ ہاشم نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے ہوئے کہا  
”آں..... آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے دشمن دو الگ الگ ہستیاں  
اور..... اور.....“

وہ آگے نہ کہہ سکا۔ اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس وقت  
سے یہ خیال اس کے دماغ میں آیا۔ میں..... میں ایک سچا نشانے باز ہوں۔  
سحر زدہ ہو کر کسی انجانے دشمن کو نشانہ بنانے جاتا ہوں۔ کیا..... کیا  
مقررہ نشانے کے مقابل آپ بچا ہوں.....؟“

اسی وقت رب نواز نے بھی یہی سوچا۔ ”میرے ہاتھ ہاتھ میں چھ انگلیاں

ہائیں ہاتھ میں واقعی آہنی شکنے کی سی قوت ہے۔ کیا میں سحر زدہ ہو کر کسی نفس کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ کیس یہ وہی انجانا شخص تو نہیں ہے جو نے بیٹھا ہوا ہے.....“

دندوں ایک دم سے ساکت ہو گئے تھے اور بڑی تیزی سے سوچتے جا رہے

م نے پھر اسی انداز میں سوچا۔ ”میں..... میں واقعی سحر زدہ ہوتا جا رہا ہوں۔ چل مجھے اسی رب نواز کے پاس بھیجتی ہے تاکہ میں اسے اپنی نشانہ بازی سے زندہ کروں اور شاید میں نے ہی سحر زدہ ہو کر اس سے کہا ہے کہ نوچندی اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر میری سوت کا وقت مقرر لا شخص کون ہے؟“

رب نواز نے بھی اسی انداز میں سوچا ”کیا میں اس چڑیل کے کالے علم کے اثر ملی کا گلا گھونٹنے جاتا ہوں؟ کیا میں نے ہی سحر زدہ ہو کر اس کی موت کے لئے ات مقرر کی ہے؟ نن..... نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کیسے بے تکی سوچ رہا ہوں۔ ہاشم میرا دشمن نہیں ہے۔ میں اس کا گلا گھونٹنے کے متعلق نہیں سکتا۔“

انے بھی دل ہی دل میں کہا۔ ”رب نواز میرا دشمن نہیں ہے۔ مجھے فضول سوچنا چاہیے۔ میں نے صرف اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ دندوں ہیں۔ اگر وہ مقابلہ پر آئے گا تو میں اس سے نن..... منت لوں گا۔ خود ہوں؟ نن..... نہیں تو..... میں خوف..... خوف زدہ.....“

انے میں لالین کی روشنی آپ سی آپ مدھم پڑنے لگی۔ رب نواز نے کہا۔  
..... یہ لالین بجھنے والی ہے۔“

ایہ تل ختم ہو چکا ہے۔ اب کیا ہو گا۔ ابھی تو نہ جانے کتنی رات باقی ہے۔“

رب نواز نے کبل کے اندر سے دندوں ہاتھ نکال کر لالین کو اٹھایا اور اسے کے پاس ذرا ہلاتے ہوئے بولا۔

ساجی جیل ختم ہو گیا ہے۔“

اس نے لائین کو میز پر رکھ کر اس کی لوہڑا دھوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑھ گئی۔ تیز روشنی میں میز پر پڑا ہوا ہڈیوں کا ڈھیر اور زیادہ واضح ہو گیا۔ ہماری جہاں سے ایک کپڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ وہاں سے دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سلگتی ہوئی آنکھیں کبھی ہاشم کو دیکھ رہی تھیں، کبھی رب نواز کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی ہڈیوں کے ڈھیر کو گھور رہی تھیں۔

”اس لائین کو نہیں بچھتا چاہئے۔“ ہاشم نے کہا۔ ”اس سے پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر کے پاس سہا کر اس میں تیل بھر دانا چاہئے۔“

”م..... مگر“ رب نواز نے کہا۔ ”باہر سہانے کے لئے دروازہ کھولنا سنا گا۔ اگر وہ..... وہ دروازے کے باہر موجود ہوا تو.....؟“

رب نواز نے مشورہ دیا ہم یہاں سے جیج کر اسٹیشن ماسٹر یا ڈرائیور یا فائرنگ بلا سکتے ہیں۔ جب وہ دروازے پر آجائیں گے تو ہم دروازہ کھول دیں گے۔“

”نہیں۔“ ہاشم نے گہرا کر کہا۔ ”وہ روپ بدلنے والا اسٹیشن ماسٹر کی آواز کر رہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ نہیں ہم آواز کے قریب میں نہیں آئیں گے۔ دروازہ صبح سے پہلے نہیں کھولیں گے۔“

لائین کی لوہڑا گرم ہونے لگی۔ روشنی مٹنے لگی۔ دھواں دھواں سا اندھیرا لگا۔ چھت کے شکاف سے لگی ہوئی آنکھیں اس نیم تاریکی میں ریڈیم ڈاک کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہڈیاں..... ہڈیاں.....

اندھیرا بڑھتا آ رہا تھا۔ لائین کی لوہڑا بجی جا رہی تھی۔ کمرے کے ستارے سب سے ہوئے انسانوں کی آوازیں گم ہو رہی تھیں اور ہولے ہولے گونج رہی تھیں۔ ”وہ چیل کوئی منتر پھونک رہی ہے..... ہے..... ہے.....“ آواز بازگشت کی طرح پھر پھر آ رہی تھی۔

”اب کیا ہو گا؟ یہ بڑھتا ہوا اندھیرا.....“

بازگشت آواز۔ تھر تھراہٹ۔ اندھیرا۔ ڈوبتی ہوئی لو۔ آواز کی تھر تھراہٹ۔ اور دروازہ بند۔ فرار کا کہہ مسدود۔ وہ آخری اسٹیشن تک پہنچ گئے تھے۔ زندگی کی گاڑی اس اسٹیشن سے کبھی نہیں جاتی۔

ایک کمزور سی ہوئی۔ چھت کی کپڑوں زور زور سے ہمیں اور لائین  
بجھنے سے پہلے تیزی سے بھڑکنے لگی۔

نے سے پہلے زندگی تڑپتی ہے۔ بجھنے سے پہلے روشنی بھڑکتی ہے۔ ایک  
آواز کے ساتھ دو کپڑوں فرش پر آگریں اور ایک سیاہ حا وجود چھت کی  
چھانگ لگا کر دم سے میز پر آگیا۔

دونوں کے حلق سے فلک شگاف چیخیں نکلیں۔ دونوں کرسیوں سے اچھل کر  
گئے۔ ایک کے ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں سے نکلے اور کھانکے کی آواز کے  
اس کے پھل باہر آگئے۔ دوسرے کے شانوں پر سے کبل اچھل کر ایک  
اور دونوں ہاتھ اپنے بچاؤ کے لئے فضا میں بلند ہو گئے۔

ان کی لورہ رو کر بھڑک رہی تھی۔ دونوں چاقوؤں کے پھل جگمگا رہے تھے۔  
ہاتھ کی چھ انگلیاں تھرا رہی تھیں۔

ناوا بھڑکتی ہوئی روشنی میں دو چمکتے ہوئے چاقو دیکھتے ہی ساکت ہو گیا تھا۔  
ہو گیا ہوا مارے دہشت کے ہلکی سی جنبش کی بھی سکت نہ رہی ہو۔

علی نے بھڑکتی اور تھمتی ہوئی روشنی میں چھ انگلیاں دیکھیں۔ انگوٹھے پر  
..... اور حسب عادت دو بھی دشمن کو دیکھ کر ساکت ہو گیا۔

دونوں سانس لینا بھول گئے۔ دہشت سے پھیلے ہوئے ذیدے پھیلے رہ گئے۔  
ماتک وہ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ پھر اپنی اپنی کرسیوں پر دم سے گر

کے بعد لائین کی روشنی مر گئی۔

۔ روم گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس خاموشی اور تاریکی میں کڑکڑ کی  
بھڑکی تھی جیسے کوئی ہڈیاں چبا رہا ہو۔

لوگوں کے بعد دروازہ پینے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں کی آخری چیخیں  
من ماسٹر ڈرائیور اور فائر مین وہاں پہنچ گئے تھے اور دروازے پر ہاتھ مار مار  
آوازیں دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اندر کی خاموشی نے انہیں سمجھا دیا  
کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ تینوں باری باری دھکے مار مار کر دروازے کو توڑنے لگے۔  
ضبوط تھا۔ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ البتہ چٹنی جھٹکے کھا کھا کر نیچے آگئی اور

دروازے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کھل گئے۔

اسٹیشن ماسٹر کے ہاتھ میں لائین روشن تھی۔ اس روشنی میں دوسرا آئے۔ وہ دونوں اپنی اپنی کرسی پر زندگی کا سفر ختم کر چکے تھے۔ میز پر ایک اسٹود اور ایک جھمی ہوئی لائین رکھی تھی۔ ہڈیوں کے ڈھیر کے پاس ایک سیاہ بلا بیٹھا ہوا ایک ہڈی چبانے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے اگلے دونوں بچوں سے ایک کو دبوچے ہوئے تھا اور بار بار اس پر منہ مار رہا تھا۔

چاقو کے چمکتے ہوئے پھل کی طرح اس بے کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور کے اگلے پائیں پنپنے کے ایک ناخن پر دوسرا ناخن یوں چڑھا ہوا تھا جیسے انگوٹھا۔

## ردہ خط کی واپسی

اے سرخ رنگ بہت پسند تھا اس کی محبوبہ کو سرخ لہو میں ڈبو دیا گیا تو  
ماتے قسم کھائی کہ خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں سے لے گا..... مگر قاتل نے اسے  
بافریب دیا کہ وہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی اس فریب سے نہ بچ سکا۔

طیاروں نے ایسی زبردست بمباری کی تھی کہ وہ ہستا بولتا شہر ایک دم سے کھنکھانے لگا۔ انسانی بستیاں بار بار اجڑتی ہیں اور بار بار بستی ہیں۔ وہ پھاڑی بستی رہتی رہتی پھر آباد ہونے لگی۔ جنرل پوسٹ آفس کی عمارت کا وہ حصہ جہاں مردہ خطوط کاؤنٹر ہوتا تھا وہاں کی ایک طرف کی دیوار گر پڑی تھی اور تمام خطوط تنکوں کی طرح کھڑکے ہوئے تھے۔ وہ ایسے خطوط تھے جن پر یا تو نامکمل پتے تھے یا وہ ناقابل فہم تھے۔ کوشش کے باوجود پڑھے نہیں جاتے تھے یا پھر اپنے پتے پر جا کر اس لئے واپس آگئے تھے کہ انہیں دھوا کر کے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے خطوط مردہ کہلاتے ہیں اس لئے مردہ خطوط ایک الگ دفتر میں رکھے جاتے ہیں۔ بمباری کے بعد وہ مردہ خط قید خانے سے آزاد ہو گئے۔ یعنی ایک طویل مدت کے بعد اپنی قید سے نکل کر دور تک آزادی سے اڑ رہے تھے۔ انہی میں اب دو سال پرانا بند لٹافہ تھا۔

اس لفافے پر ڈاک خانے کی مہربان رہی تھی کہ اس کی موت کو دو سال گزر گئے ہیں۔ اس پر جو پتہ تھا وہ واضح تحریر میں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس شخص تک نہیں پہنچا تھا جس کا نام اس لفافے کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ پہاڑ کی اس بلندی پر ہوا سائیں سر پہ کرتی ہوئی تیزی سے بہہ رہی تھی اور اس لفافے کو ایک سمت بہا رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ رک جاتا تو درختوں کی شاخیں شور مچا دیتیں اور اپنے پتوں کی ہوا دے کر اسے آگے بڑھا دیتی تھیں۔

بست دور اڑنے کے بعد وہ ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گیا۔ لوگ بہانے کے باعث حواس باختہ تھے۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ کئی ہوئی پتنگ کو دوڑ کر پکڑ لے۔ بچوں کو اس دنیا کا کوئی ایسا متاثر نہیں کرتا۔ ایک بچہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے دھالے گزر رہا تھا اس نے وہ ڈکر اسے پتھر کی آڑ سے اٹھالیا۔ اس کی ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”کیا کر رہے ہو؟ جلدی چلو، کیس پھر دشمن نہ آجائیں۔“ وہ مٹنے لگا۔





وہ اندھے منہ پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے کے نیچے وہ لفافہ موجود تھا۔ ذرا دیر بعد سانسیں درست ہوئیں تو اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ڈاک خانے پر اسے نکالا۔ لفافہ بہت پرانا ہو چکا تھا اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بوڑھے نے اپنے لمبے میں دو مرے کانڈات کے ساتھ رکھ لیا۔ پھر کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کانڈات سے بھرے ہوئے جھوٹے کو اس نے پیٹھ پر رکھا۔ پھر دو مرے کانڈات پٹنے کے لئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

”پتہ نہیں کس کانڈ پر میرے بیٹے نے لکھا ہو گا۔ پیارے ابا جان! میں یہاں خیریت سے ہوں اور خدا کے فضل و کرم سے آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے واپس آیا ہوں۔ ہاں ہاں میرے بیٹے نے ضرور کسی کانڈ پر لکھا ہو گا۔ میں اس بستی کا ایک کانڈ بھی نہیں چھوڑوں گا، بسب تک سانس باقی ہے کانڈ چننا ہوں گا۔“

وہ کاشتے ہوئے بوڑھے ہاتھوں سے جگہ جگہ کانڈ چتا ہوا ایک قبرستان میں پہنچا۔ بستی بھی اجڑ کر قبرستان ہی ہوئی تھی۔ اس بوڑھے کے لئے دونوں ہی جگہیں برابر تھیں۔ وہ قبرستان میں داخل ہو کر سینٹ کے اس چوتھے پر آکر بیٹھ گیا جہاں نماز جاتا پڑھائی جاتی تھی۔ بستی میں بلیک آؤٹ تھا۔ قبرستان میں ہمیشہ بلیک آؤٹ رہتا تھا۔ وہ پاگل اس اندھیرے میں اپنے بیٹے کا خط پڑھنے آیا تھا۔ پتہ نہیں اس اندھیرے میں نظر آتا ہی تھا یا نہیں۔ عمر وہ کانڈ سے بھرے ہوئے تھیلے کو کھولنے کے بعد ایک ایک کانڈ کو اٹھا کر اس تاریکی میں پڑھ رہا تھا۔

کوئی پورا کانڈ تھا، کوئی آدھا تھا، کوئی آدھے کا آدھا، کوئی انبار کا تراشا تھا، مگر ابھی کو خط سمجھ کر پڑھ رہا تھا اور وہی پڑھ رہا تھا جو اس کا پاگل پن اسے سمجھا رہا تھا۔ ہر کانڈ کرکھانے کے بعد وہ پھینک دیتا تھا۔

”نہیں یہ میرے بیٹے کا خط نہیں ہے، شاید یہ میرے بیٹے کا خط ہے۔“ اسی طرح وہ دو مرے کانڈ اٹھا لیتا پھینکتے ہوئے تمام کانڈ ددر ددر تک اڑ رہے تھے۔ اسی دقت تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ جھولے کے دو مرے کانڈات ہوا کے اس جھونکے کی زد میں۔ ددر تک بکھر گئے۔ بوڑھے نے منھیاں بھیج کر مگ۔

”کون ہے یہ..... کون میرے بیٹے کا خط مجھ سے چھین رہا ہے؟ ارے مالو! مرنے کے بعد تو اپنی قبروں میں آرام سے پڑے رہو۔ میں ابی لئے بستی میں خط نہیں

[illegible]

وہ اڑتے ہوئے کانڈات کو پکڑنے کے لئے اُدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مگر کانڈات چاروں  
بکھر گئے تھے۔ وہ انہیں پکڑنے کے لئے کہاں کہاں جاتا۔ مگر وہ جہاں گیا وہاں ایک  
نی قبر میں اس کا پاؤں دھنس گیا۔ وہ گرتے ہی کراہنے لگا اور اس قبر کے مُردے کو  
اپنے لگا۔ وہ لادارثِ لغافہ بوڑھے سے بہت دور پہنچ گیا تھا۔ مگر ایک جگہ ٹھہرنا  
وہرے اُدھر قبروں کی کھنی گلیوں سے گزرنے لگا۔

کھلی فضا میں ہوا کا مزاج بدل جاتا ہے، وہ مستی میں سیٹیاں بھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ وہ سیٹیاں نہیں بھاتی، جن قبروں میں شگاف پڑ جاتے ہیں وہی سیٹیاں بھاتی ہیں۔ ناکی اندھیری گلیوں میں ایک انسان کا آخری مکان ذرا ٹوٹا ہوا تھا۔ قبر کی اس ٹوٹی سے ایک استخوانی ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کے ہتھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ لفافہ نشے رشار جھوٹا اور ڈرگاکا ہوا آیا اور اس ہتھیلی پر آکر ٹھہر گیا۔

شاید وہ اپنے پتے پر پہنچ گیا تھا۔

☆-----☆-----☆

ڈانس کا ایک راؤنڈ ختم ہوتے ہی وہ دونوں ایک میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ڈانس فلور کے باہر میز پر دھیمی دھیمی سی مٹھنی تھی اور میز کے چاروں طرف کرسیوں پر رسمی ٹارکیا تھی۔ نوجوان جوڑوں کے لئے عجیب سا ردِ مانی ماحول تھا میز پر کھلنے کی چیزیں تھیں اور کھلنے والوں کے چہرے واضح طور سے نظر نہیں آتے تھے۔ پرکاش نے بی پریشانی ہوئی رہتا کو دیکھا اور پوچھا۔

”کیا تم تھک گئی ہو؟“

میں تھکا نہیں تھکا جانتی ہوں۔ چلو ڈانس کا درد مرا اڑنڈ بھی ہو جائے۔“

پرنکاش نے ہوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بھرے بھرے بدن کی اس عورت نے جتنی لذت بھرتی تھی کہ واقعی وہ دوسروں کو تھکا ڈالتی ہوگی۔ پرنکاش نے کان پر لٹکتے ہوئے کہہ:

اب ڈانس کرنے جائیں گے تو دل کی بات دل ہی میں رہ جائے

ریتا نے شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہے تمہارے رات بات؟“

”بس تمہاری یہی ادا نہیں مار ڈالتی ہیں۔ سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنی رہتی۔ آخر محسن میں کیا بات ہے کہ تم اس کے پتھرے کی مینا بن گئی ہو؟“

وہ اپنے ہونٹ سکڑ کر ناگواری سے بولی۔ ”اس کا نام نہ لو۔ وہ بار میں بیٹھ کر ہے۔ نام لیتے ہی شیطان کی طرح یہاں پہنچ جائے گا۔“

پرکاش نے پھر ایک بار اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ دھندلی سی روشنی میں تک نظر آ رہی تھی اس کے بعد میز نے اسے چھپا لیا تھا۔ مگر جس حد تک نظر آ رہا تھا اس حد سے بہت آگے لپکا رہی تھی۔ ڈانس کرنے کے بعد اس کا زرخیز سینہ اب سانسوں کی لپچل سے لرز رہا تھا، ہولے ہولے تھر تھرا رہا تھا اور بار بار دیکھنے والی نگاہوں کا ٹکڑا رہا تھا۔ اس کے جسم اور چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ وہ اوچی سوسائٹی میں سر سیکھی ”کھلاتی تھی۔ کتنے ہی مچلے اس کی تمنا کرتے تھے۔“

”تمہاری تمنا کرنے کے لئے اس شیطان کا نام لینا ضروری ہے تم اس سے انکار کیوں ہو۔ کیا اس نے ڈرا دھمکا کر تم سے شادی کی تھی۔“

”نہیں..... اس نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ یہ وقت اس پر میرا دل آ گیا تھا۔ اس وقت میں نے یہ بھی لیس سوچا کہ وہ مسلمان ہے۔ یہ بھی اوچی سوسائٹی میں دھرم ایمان کہاں ہوتا ہے۔ یہاں ڈانس فلور پر کتنے ہی دھرم عورتیں اور مرد رقص کرتے وقت گڈٹ ہو جاتے ہیں۔“

”پھر بھی تمہیں محسن سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔“

”مگر اب تو ہو چکی ہے۔ اگر میں اس سے طلاق لے کر تمہارے پاس آؤں۔ تمہارے کتنے ہی رقیب ہیں جو مجھے بدنام کریں گے کہ میں رقص کے پارٹنر کی طرح زندگی کے پارٹنر بھی بدلتی رہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ خود ہی میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

”مگر وہ تو خود تمہارا دیوانہ ہے تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ میں ہی اسے اپنے دل سے ہٹا دوں گا۔“

”یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ خطرناک مرد پسند ہیں۔ تم زبانی دعوے نہ کرو، خطرناک بن کر دکھاؤ۔“

”تم مجھے پہنچ کر رہی ہو۔ میں آج ہی اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔“  
 ریتانے کھانے کی چیزوں سے شغل کرتے ہوئے کہا۔ ”سانپ کو اس طرح مارو کہ  
 اسے ٹوٹے۔ اس شہر میں اس کا بڑا نام ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اس کی  
 کرتے ہیں۔ وہ بہت پراسرار ہے، میرا اندازہ ہے کہ وہ یہاں کی اٹلی جنس کا بہت  
 ام آدمی ہے۔ اکثر کئی دلوں کے لئے مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پوچھنے پر کہتا ہے کہ  
 بار کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کا کاروبار میری سمجھ میں نہیں آتا۔“  
 ”کیا تم اسے پراسرار بنا کر مجھے خوفزدہ کرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔ میں تو تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ اسے اس شہر سے دور لے جا کر  
 لے گا۔ اس سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمہارے پاس آنے کے  
 تلی بے چین ہوں۔ میں کل محسن کے ساتھ چند رپور کی پہاڑی بستی میں جا رہی  
 تھی۔ پہاڑی علاقے میں اگر اسے کوئی حادثہ پیش آجائے یا وہ ہلاک کر دیا جائے تو ہم  
 ہر کوئی شبہ نہیں کر سکتے۔“

”گڈ آئیڈیا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں  
 گا۔ وہ تمہارے ساتھ جائے گا، پھر واپس نہیں آ سکے گا۔“  
 ریتانے بار کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس، چپ ہو جاؤ۔ وہ آ رہا  
 ہے۔“

پربکاش نے پلٹ کر دیکھا، چھ فٹ کا قد اور جوان نشے کی ترنگ میں ہاتھی کی طرح  
 ابھرا آ رہا تھا۔ پربکاش نے اپنی ٹھیکوں کو بھیج کر اپنی توت کا اندازہ کیا۔ وہ محسن سے  
 دل میں کسی طرح کم نہ تھا۔ اسے ہاتھوں کی قینچی میں پھنسا کر اس کی گردن توڑ سکتا  
 تھا۔ اس وقت محسن کے قریب آتے ہی وہ اخلافا مسکرانے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔  
 نے کسی پر بیٹھے ہوئے ریتانے سے پوچھا۔

”تم ہی یو ایو انجوائے یور ڈانس؟“  
 ”اوہ شیور۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”پربکاش بہت اچھے ڈانس پارٹنر ہیں۔“  
 محسن نے پربکاش کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تھینک یو پربکاش! تم نے  
 تیری کو تمہاری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ڈارلنگ! اب ہمیں چلنا چاہئے، وی آر  
 لیٹ۔“

وہ بل ادا کرنے کے بعد پرکاش سے رخصت ہو کر محسن کے ساتھ جاتے گئے۔  
سے پہلے چور نظروں کا تالہ ہوا کہ جو منصوبہ بنایا گیا ہے اس پر پوری طرح عمل کیا  
گیا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد پرکاش کلب میں واپس چلا گیا تو محسن نے ریتو کو اپنی طرف  
کراس کو دبوچتے ہوئے کہا۔  
”لٹ ہی ہوا اے کس۔“

وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا حرکت ہے، کوئی دیکھ  
کیا کئے گا۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”پارکوں میں، گلیوں میں اور کاروں میں یہی ہوتا ہے  
کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پہلو سے اٹھ کر ہماری طرف دیکھے  
کوئی بات نہیں، گھر پہنچتے ہی قرضہ چکا دیتا۔“

اس نے بڑی درندگی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کار اسٹارٹ کی، پھر تیزی سے اڑا  
کر آگے بڑھ گیا۔ وہ غصے سے کہنے لگی۔

”تم بہت ظالم ہو۔ عورت کو تو پھول کی طرح چھونا چاہئے، یہ نہیں جانتے کہ  
نے نہیں دیکھا کہ لوگ ڈانس فلور پر مجھے پھول کی طرح نازک سمجھ کر ہاتھ لگاتے ہیں؟“  
”وہ مب تمہارے ناکام عاشق ہیں اور میں تمہارا پتی دیو بن گیا ہوں اور ایک  
جانتا ہے کہ عورت کو کس طرح چبانا چاہئے۔“

وہ پھر قہقہے لگاتے لگا۔ قہقہے کے دوران یوں لگتا تھا جیسے کوئی ساز ڈرنے سے  
کھا رہا ہو۔ وہ ڈرتی بھی تھی اور پہاڑ کے واسن میں رہتی بھی تھی۔ اپنی کوٹھن میں  
وہ لباس تبدیل کرنے کے لئے باختر روم میں چلی گئی۔ محسن دہسکی کی کیبنٹ کھول کر  
لئے ایک جام بنانے لگا۔ وہ لباس بدل کر واپس آئی تو جام خالی ہو چکا تھا۔ اس کی ملا  
شراب محسن کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔  
”اُدھر آؤ۔“

”میں نہیں آؤں گی۔“

محسن نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ ”اچھا، تو لوگ نہیں  
پھول کی طرح چھونے ہیں، انہیں کیا معلوم کہ تم کس طرح قابو میں آتی ہو۔“  
اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کراہتی ہوئی اور چیختی ہوئی



بھوت بن کر اس دنیا میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک آدمی تھا، اس کا نام جیون رام تھا۔ اپنی پتی کو بہت ستاتا تھا اور اپنی چھوٹی سی بیٹی کو بہت نارتا تھا۔ اس لئے وہ مرے گا۔ بھوت بن گیا۔

شیلا نے مصومیت سے کہل۔ ”ممی! مجھ کو پاپا بہت نارتے تھے آپ کو بھی لڑاتے تھے۔ کیا وہ مرنے کے بعد بھوت بن گئے ہوں گے۔“

”تم بیچ میں مت بولو۔ چپ چاپ کمائی منتی رہو۔ ہاں تو وہ جیون رام مرنے کے بعد بھوت بن گیا اور اپنی کرنی پر پچھتانے لگا۔ بھگوان نے اس سے کہا اگر تیری بیٹی اور بیٹی تجھے معاف کر دیں گی تو میں تجھے نرک سے نکال کر آدمی کے روپ میں پھر اس دنیا پر بھیج دوں گا۔ تب جیون رام اس دنیا میں آکر اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو تلاش کرنے لگا۔ ماں بیٹی پرانا مکان چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلی گئی تھیں۔ جیون رام بھرت بن کر رہا تھا اور گھر گھر باکران کا پتہ پوچھتا تھا لیکن اسے دیکھتے ہی لوگ ڈر باتے تھے اور بتانے سے پہلے ہی اپنے اپنے گھر کے دروازے بند کر کے چھپ باتے تھے۔“

”ہائے بھارہ۔“ ننھی شیلا نے ہمدردی سے کہل۔ ”وہ بھارہ اپنی بیوی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ لوگ اس کا پتہ کیوں نہیں بتاتے تھے ممی؟“

یہ سوال کرتے ہوئے اس نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ کمائی سناتے سناتے سو رہی تھی۔ اس نے ماں کو آواز دی۔ پھر جواب نہ پا کر اس نے دھوری کمائی کو اپنی پکی عقل سے پوری کرنے لگی۔ مگر وہ جیون رام کا بھوت اپنی بیٹی تک کیسے پہنچے گا، اس کی سمجھ نہیں آیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک سنائی دی۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آدمی رات گزر چکی تھی، باہر برف کا طوفان تو ایسے دقت کون آسکتا تھا۔ کیا پاپا آگئے؟ نہیں..... جیون رام ہو گا۔ وہ ادھوری کمال ہونے کے لئے اس کے دروازے پر آگئی تھی۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی بیٹے سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ دل ڈر رہا تھا مگر خوف سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ تھا کہ جیون رام کو معاف کر دے اور وہ انسان کے روپ میں اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پاپا بھوت بن گئے ہوں اور وہ اس کی ممی سے اور اپنی بیٹی سے معافی مانگنے آئے ہوں۔ وہ معاف کر دے گی اور پھر اس کے پاپا آدمی بن جائیں گے۔ وہ مارتے تھے تو کیا ہوا، نانیں بھی تو لاتے تھے۔ وہ سوچتے سوچتے بیردنی دروازے



جی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی باہر سے آواز

کوئی ہے۔۔۔۔۔ ہے ہے ہے۔۔۔۔۔

پچھنے والے کے منہ کی ہڈیوں سے ہوا پھسل رہی تھی، اسی لئے ”کوئی ہے“ کے  
اف طور سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ”ہے ہے“ کی آواز  
تھر تھرا رہی تھی۔ شیلانے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اوپر چٹنی لگی ہوئی تھی،  
نئے ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے، اس نے پوچھا۔

”تم کون ہو۔۔۔۔۔ کیا تم میرے پاپا ہو؟ دیکھو پاپا! میں بہت چھوٹی ہوں، ابھی ایک  
اکراس پر چڑھوں گی، پھر دروازہ کھولوں گی۔“

ابہرے آواز آئی۔ آواز سرد ہواؤں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ”دروازہ نہ کھولو، تمہیں  
لگ جائے گی۔ میں اس مکان کے مالک سے ملنے آیا ہوں۔ تمہارے پاپا کا نام کیا

”میرے پاپا کا نام مرلی دھر تھا۔۔۔۔۔ تم میرے پاپا نہیں ہو تو پھر جیون رام ہو؟“

”جیون رام نہیں ہوں۔ میں اس مکان کے مالک سے ملنے آیا ہوں۔ وہ میرا  
بہادر اس کا نام محسن ہے۔ میرے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے۔ اس کے اندر جو خط  
میرے پتہ چلا ہے کہ محسن نے مجھے قتل کیا تھا۔ وہ اس مکان کا مالک ہے۔ اس خط  
کا مکان کا پتہ لکھا ہوا ہے۔“

شیلانے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ممی نے مجھے بتایا ہے کہ ممب میں آٹھ برس  
ماتو پائے ایک مسلمان سے یہ مکان خریدا تھا۔ تم نے اس کا نام کیا بتایا ہے؟“  
”محسن۔“ ایک سرد ہوا کے جھونکے نے کہا۔

”ہاں۔ شاید اس مسلمان کا نام محسن ہی تھا۔ ممی کہتی تھیں کہ وہ مکان بیچ کر فیض  
پلا گیا تھا۔“

”فیض آباد۔“ سرو ہوا کے جھونکے بڑبڑانے لگے۔ ”میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔  
ناس لئے آسان ہے کہ اس کے ساتھ ایک حسین عورت ہوگی جو لاکھوں میں پہچانی  
جاسکے۔ میں اپنے قاتل کو پہچان لوں گا۔ تمہارا شکریہ بے بی۔۔۔۔۔ باؤ سو باؤ“ اچھے  
اتنی رات تک نہیں جاگتے۔“

باہر شدید برفباری میں وہ آواز گم ہو گئی۔ شیلہ اسے آوازیں دینے لگی۔ اہلکار اس کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔

”شیلہ! تم وہاں کیا کر رہی ہو، کسے آوازیں دے رہی ہو؟“

وہ دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔ پھر حیرت اور مسرت سے بولی۔ ”مئی! وہ کمال بھوت آیا تھا۔ مگر وہ جیون رام نہیں تھا۔“

”کیواس مت کرو۔ کمائی صرف کمائی ہوتی ہے۔ چلو میاں آکر پپ چاپ سو جاؤ۔“  
ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر اسے اپنی آغوش میں جھپٹنے کے بعد تھپک تھپک کر سلاتے لگی۔

☆-----☆-----☆

محسن نے چندر پور کے ایک ریٹورنٹ کے سامنے کار روکتے ہوئے کہا ”ریتا..... ایک ایک کپ کافی ہو جائے۔ بڑے غضب کی سردی ہے۔ اس برفباری میں تم اپنا مکان فروخت کرنے آئی ہو، کمال ہے۔“

کار کی جھیلی سیٹ پر ریتا کا مکان خریدنے والے وہ گاہک بیٹھے تھے۔ وہ بھی اس کے ساتھ کافی پینے کے لئے ریٹورنٹ میں آگئے۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد مکان خریدنے والے ایک سینھ نے ریتا سے کہا۔ ”شرمیستی جی! میں نے مکان کے کاغذات دیکھے ہیں۔ کاغذات میں کوئی گھپلا نہیں ہے مگر یہ راجندر مہتہ کون ہے، جس نے آپ کے نام مکان لکھا ہے؟“

ریتا نے جواب دینے کے بجائے محسن کی طرف دیکھا، محسن نے جواب دیا۔ ”یہ نام کے ذاتی معاملات ہیں۔ جب کاغذات چکے ہیں تو پھر آپ کو کوئی دو مرا سوال نہیں کرنا چاہئے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے محسن صاحب۔ مگر ہم ڈرتے ہیں کہ بعد میں راجندر مہتہ اپنا مکان کے لئے گھپلا نہ کرے۔“

”وہ کہاں سے آئے گا۔ وہ تو مر چکا ہے۔ آپ میری اسٹیٹ ایجنسی کے ذریعے ریتا کا مکان خرید رہے ہیں۔ لہذا میں آپ کی نسلی کے لئے بتا دیتا ہوں کہ راجندر ریتا کا بیٹا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے ہی اپنا مکان اس کے نام لکھ دیا تھا۔ مگر موت بھی بوجھ نہیں آتی۔ وہ شادی سے پہلے ہی مر گیا۔ یا یوں سمجھئے کہ تقدیر نے ریتا کو میرے نام لکھ دیا۔“

اس لئے یہ میری پتی بن گئی ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ پہلے مگیتری کوئی نکالی میری  
کے پاس رہے، اس لئے ہم اسے فروخت کر رہے ہیں۔“  
”میں خود نہیں چاہتی۔ میرے پتی کے پاس دھن دولت کی کمی نہیں ہے۔ آپ  
اگلی ہیں، بہت سے داسوں میرا مکان خرید رہے ہیں۔“

کافی پنے کے بعد وہ پھر کار میں آکر بیٹھ گئے اور ریتا کے مکان کی طرف جانے لگے۔  
مڑکوں پر سے برف ہٹائی جا رہی تھی۔ وہ دس منٹ کے بعد ہی ایک مکان کے سامنے  
گئے۔ چونکہ ارب جلدی سے نیچے لاکر دروازے کے سامنے سے برف ہٹانے لگا۔ وہ تقریباً  
کھینے تک مکان کو اندر سے دیکھتے رہے اور رقم کی ادائیگی کے بارے میں باتیں کرتے  
ہے۔ یہ طے ہو گیا کہ فیض آباد پہنچ کر مکان خریدار کے نام منتقل کر دیا جائے گا۔ محسن  
داپس میں انہیں بستی کے باہر ٹیکسی کے اڈے پر پہنچا دیا اور ریتا کے ساتھ پھر واپس  
نے لگا۔

اس وقت شام کا دھندلا رات کی تاریکی میں مدغم ہو رہا تھا۔ محسن نے مکان کے  
منے کار روکتے ہوئے کہا۔

”ڈارلنگ! چلو ذرا برف میں پیدل چلیں۔ میدانی علاقوں میں یہ نظارے کہاں ملتے  
’ذرا تفریح رہے گی۔“

وہ کار سے باہر آگئے۔ ریتا نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں دور دور تک کیسی دیرانی ہے۔ مجھے دیران علاقوں میں مت ڈر لگتا ہے۔

ماہر کہ یہ مکان فروخت ہو رہا ہے۔“

محسن نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر کس کا ڈر ہے؟ اس برف باری میں کوئی بھوت

نہی گا تو وہ بھی سرونی سے ٹھٹھہر کر مرجائے گا۔“

”بھوت کا نام نہ لو، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

محسن نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تعب ہے کہ تم بھوت سے ڈرتی ہو۔ کیا

نہیں جانتیں کہ انسان تو انسان، شیطان بھی عورت سے پناہ مانگتا ہے؟“

”جی نہیں، یہ سب مردوں کی باتیں ہیں، درنہ عورت مت ہی معصوم اور

ملوم ہوتی ہے۔“

”رہتا جانی! تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس دو سال کے عرصہ تمہارے دو عاشق پر لوک سدھار گئے ہیں، اب تمہارے کی بھی شامت آگئی ہے۔“  
 رہتا غصہ دکھانے کے لئے اس کا ہاتھ جھٹک کر اس سے الگ ہو گئی۔ ”مگر تیسرا عاشق؟ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ جھگڑا کرنے آیا ہے۔“

”نہیں..... اس برہماری میں لات گھونٹے مار کر گراؤں گا تو تم مری جاؤ گی۔“  
 سے تو سرف بیڈ روم میں ہی جھگڑا کیا جاسکتا ہے۔“

وہ بیٹھی ناراضگی سے اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ محسن کی پچھلی درندگی نے اس ناراضگی میں مٹھاس پیدا کر دی۔ اسے بت کچھ یاد آ رہا تھا۔ محسن اس کے موڑ کو بچھنے قہقہہ لگانے لگا۔ اس کے قہقہے برقیانی علاقے میں چاروں طرف گونجنے لگے۔ ٹھوڑی جا کر اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یاد ہے یہ مکان کبھی میرا تھا میں نے مرلی دھرنائی ایک شخص کے ہاتھ سے۔ جب اتنی دور آگئے ہیں تو چلو مرلی دھر کی خیریت معلوم کر لیں۔“

وہ رہتا کا ہاتھ تھام کر چلا ہوا دروازے پر آگیا اور دستک دینے لگا۔ ٹھوڑی دیر بعد مرلی دھر کی پتی نے دروازہ کھولا۔ محسن نے کہا۔

”میں سٹر مرلی دھر سے ملنے آیا ہوں، کیا وہ موجود ہیں؟“

”جی نہیں، ایک سال پہلے ان کا ریمانٹ ہو گیا ہے، آپ کون ہیں؟“

”میرا نام محسن ہے۔ آپ کے پتی نے مجھ سے یہ مکان خریدا تھا میں بونٹی لے آیا تھا۔“

اسی وقت کمرے کے اندر سے ننھی شیلہ دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ ”بھوت نے یہی نام بتایا تھا، اس کا نام بھی محسن ہے۔“

محسن نے مسکراتے ہوئے ذرا جھک کر شیلہ کو دیکھا۔ پھر اس کا ٹھوڑی کو بچھنے ہوئے پیار سے پوچھا۔ ”اچھا بے بی کیا تم بھوت سے دوستی کرتی ہو؟“

”میں دوستی نہیں کرتی۔ وہ خود ہی کل رات یہاں آپ کو مارنے آیا تھا۔ آپ اس بھوت کو کیوں مار ڈالا تھا؟“

اس کی می نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چپ رہو شیلہ! تم بڑوں کے بیچ میں کیوں ہنک پڑتی ہو؟“



دو اس میں تھا، ہلکی سی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

”ریتا..... تم ڈرائنگ روم میں کیا کر رہی ہو؟ یہاں آجاؤ۔ شروب کی گرنے نہیں ہے۔“

پھر خود ہی اٹھ کر جھومتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں پہنچتے ہی اچانک ایک بجلی کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ وہ بڑی پھرتی سے اچھل کر پیچھے چاکن کی حاضر دہانی نے اسے بچا لیا تھا۔ نقاب پوش حملہ کرنے کی جھونک میں اس کی لڑکھڑائی۔ حسن نے اس کے ہاتھ پر ایک ٹھوکر ماری۔ منجبر اس کے ہاتھ سے نکل جاگرا۔ پھر دونوں ہی حتمی گتھا ہو گئے۔ دونوں ہی قد آور اور قوی ہیکل تھے، باتھیوں کی طرح آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ لڑنے کے دوران حسن نے اس کے چہرے نقاب کھینچ لیا۔

وہ پرکاش تھا۔ اس نے بے نقاب ہوتے ہی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ سنے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کھڑکی سے باہر آکر وہ پھر لڑنے لگا۔ کبھی پرکاش اس پر پڑتا تھا اور کبھی وہ پرکاش کے چھکے چھڑا دیتا تھا۔ وہ اندھیرے میں لڑنے لڑنے کا پیچھے پلے گئے مکان کے پیچھے ایک گہری کھائی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس بات کو سمجھتا تھا کہ اس طرف جانے سے جان کو خطرہ ہے لیکن وہ لڑنے کے سنبھل نہ سکا۔ اس طرف بڑسنے سے خود کو روک نہ سکا۔ جب اس کے اندازہ مطابق وہ گہری کھائی ایک قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ اچانک ہی گر پڑا۔ پرکاش نے اچھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ و ریانے میں گونجتی چلی گئی۔ حسن نے پاؤں پر رکھ کر پیچھے کی طرف اچھال دیا تھا۔ پرکاش اندھیرے میں برف کی دیوار تھ۔ ہو پکا تھا۔ اسی وقت ریتا نے مکان کی پچھلی کھول کر بڑی پریشانی سے پوچھا۔

”حسن! تم اندھیرے میں کس سے جھگڑا کر رہے ہو؟ کون ہے وہ دشمن؟“

حسن نے برف سے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اپنے مائنٹ فرحت سے تیسرے کا نام کاٹ دو۔ اب وہ صرف بھوت بن کر ہی واپس آ سکا ہے۔“

☆=====☆

دوسرے دن وہ دونوں فیض آباد سے واپس آ گئے۔ ریتا پچھلی ساری رات سو رہی تھی کیونکہ اس نے اپنے تیسرے عاشق کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

تھی کہ اب حسن اس پر ظلم کی انتہا کروے گا۔ اسے دوسروں سے عشق کرنے کا مزہ  
نے کالین خلاف توقع اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسے مارنے کے لئے ہاتھ بھی نہیں  
۔ صرف بیڈ روم سے باہر نکال دیا تاکہ وہ کھڑکی کھلی رکھے اور اپنے عاشق کا انتظار  
رہے۔ ڈرائنگ روم میں آئندہ ان نہیں تھا۔ باہر ایسی برہنہ ہو رہی تھی کہ وہاں  
بات اس کی قلفی جستی رہی۔

وہ کچن میں جا کر آگ تپتی رہی اور دل سی دل میں حسن کو گالیاں دے کر سوچتی  
کہ کس طرح اس سے پیچھا چھڑائے۔ اونچی سوسائٹی میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ  
اے کر بدنام ہونا نہیں چاہتی تھی۔ حسن میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوسروں کے سامنے  
ہوئی کی بہت تعریفیں کرتا تھا۔ اس کی عاشق مزاجی پر پروہ ڈال دیتا تھا۔ مگر چپکے ہی چپکے  
کے عاشقوں کو ٹھکانے لگا دیتا تھا۔

وہ حسن کے سامنے ہر طرح سے محفوظ تھی مگر آزاد نہیں تھی۔ جوانی میں پر نکل  
نے ہیں۔ ایسے میں اڑنے کی آزادی نہ ملے تو ریتا جیسی عورتیں چہرہ توڑنے کی کوشش  
لاہیں۔ وہ پھر ایسے ساتھی کی تلاش کرنے لگی جو اسے حسن کے چہرے سے آزاد کرا  
۔ حسن بظاہر اس سے لاپرواہی برہتا تھا۔ ریتا کو کلیوں اور تفریح گاہوں میں جانے کی  
اجازت دے رکھی تھی۔ ساتھ یہ بھی جتا دیتا تھا۔

”ڈرائنگ روم! میری معلومات کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ تم میری دی ہوئی آزادی سے  
نوافذہ لٹھاؤ گی تو ہمارا تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا“ وہ تیسرا آدمی جان سے جائے گا جو  
نے درمیان آئے گا۔“

وہ بہت اسارت اور بہت دلیر تھا مگر ریتا کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ایسے مرد  
نہیں تھے جو بالکل ہی حاکم بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حسن کی دنیا سے باہر کتنے ہی دوستند  
جو پردانوں کی طرح اس کا طواف کرتے رہتے تھے۔ ریتا کو کسی من پسند ساتھی کی  
شائیں بھگنا نہیں پڑا۔ جگدو نامی ایک نوجوان اس کے سامنے کے دربار میں خود ہی ہاتھ  
دھ کر چلا آیا۔ جگدو بھی ایک دیو کی طرح قوی پیکل تھا لیکن ریتا نے اپنے جنات قسم  
سب عاشقوں کو حسن کے ہاتھوں مار کھاتے دیکھا تھا۔ لہذا جب پہلی بار جگدو نے  
میں کھا کر اسے یقین دلایا کہ وہ حسن سے اس کا پیچھا چھڑائے گا تو ریتا نے صاف طور  
نے انکار کر دیا۔

”نہیں، تم محسن کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ وہ طاقت کے فوری طور پر  
میں نہیں آئے گا۔ تم کوئی اچھی سی تدبیر سوچ کر بتاؤ پھر میں تمہاری طرف  
جرات کروں گی۔“

جلد یو کو یہ بات بہت بری لگی کہ ریتا اس کی جسمانی قوت پر بھروسہ نہیں  
ہے۔ وہ ریتا کا مشورہ نہ مان کر اسے ماراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ حسین عورت  
کے بے شمار شیدائی تھے، اب اس کی آغوش میں آنا چاہتی تھی لیکن محسن نے اس  
طرح و بہشت زدہ کر دیا تھا، اس نے کہا۔

”میں اسے چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہوں۔ مگر تم میری طاقت پر بھروسہ نہ  
ہو۔ جب طاقت استعمال نہیں کی جائے گی تو پھر ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے، دبا کر  
کالے جادو سے تارا جائے۔“

ریتا نے کہا۔ ”میں لے کالے جادو کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں  
آنکھوں سے اس جادو کا اثر ہوتے نہیں دیکھا۔ تم کچھ بھی کرو، مگر اس بات کا خیال  
کہ محسن کو ہم پر شبہ نہ ہونے پائے۔“  
”اسے شبہ نہیں ہوگا“ جب تک کالا جادو اپنا کام نہ دکھائے تم مجھ سے وعدہ  
رہنا۔“

”کیا تم جادو جانتے ہو؟“

”میں نہیں جانتا لیکن ایک بہت ہی مشہور جادوگر کو جانتا ہوں۔ اس کا نام  
ہے مگر وہ پروفیسر سامری کے نام سے مشہور ہے۔“

”ہاں، میں لے سامری جادوگر کی کمائیاں پڑھی ہیں۔“

”یہ کمائیوں والا سامری جادوگر نہیں ہے۔ بہت پہلے یہ ہمارے دیس کا ایک  
سائنسدان تھا۔ پھر اس کا دماغ چل گیا۔ اس کی لیبارٹری جاہ ہو گئی۔ لوگ کہنے لگے  
کالے جادو اور سائنس کو گڈنڈ کر کے کالے جادو کو سائنسی علم بنانا چاہتا تھا۔ مگر  
رجہ سے اس کا دماغ خراب ہو گیا۔“

”تم اس پاگل آدمی سے کیا کام لے سکو گے؟“

”اب وہ پاگل نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اپنی  
پوری کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری مراد بھی پوری ہو جائے۔“



”میں پروفیسر سامری سے ملاقات کروں گی پہلے اس کی دماغی حالت سے مطمئن ہوں گی پھر ہم اس سے کوئی کام لیں گے۔“

”اچھی بات ہے، ابھی چلو۔“

”میں ابھی نہیں جاسکتی پتہ نہیں محسن کس طرح میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ کل صبح وہ سے باہر ہوا ہے۔ کل ہم اطمینان سے پروفیسر سامری کے پاس جا کر اس سے اپنے پیکی باتیں کریں گے۔“

دونوں نے دوسرے دن ملنے کا وقت مقرر کر لیا۔ پھر وہ جگدیو سے رخصت ہو کر اپنی کوشی میں واپس آگئی۔ محسن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس چکر میں تھا۔ ریتا اس کی جتنی بننے کے باوجود اس کی مصروفیات کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ اکویرے آیا تو اچھے موڈ میں تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس سے اچھے ہی سوڈ میں ت ہوا۔ وہ بتانے اس کے گلے میں بانٹیں ڈال کر اسے جلدی واپس آنے کی قسمیں بکرا دل میں کہا۔

”جاؤ رخصت ہو جاؤ۔ میں تو ہمیشہ کے لئے تمہیں رخصت کرنے والی ہوں۔“

جب وہ چلا گیا تو اس کے ایک گھنٹے کے بعد ریتا کاو میں بیٹھ کر جگدیو کی کوشی میں لے۔ وہ انتظار کر رہا تھا۔ ریتا کو ساتھ لے کر سیدھا سامری کی کوشی پر پہنچ گیا۔ پروفیسر لاک کی کوشی کسی عجیب گھر کا نمونہ پیش کرتی تھی۔ ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں لے کے طوطے پر بڑے سلیقے سے مردہ کھوپڑیاں اور ڈی کے طور پر خونخوار درندے ہوئے تھے۔ وہاں قدم رکھتے ہی لوگ دہشت زدہ ہو کر پروفیسر سے مرعوب ہو جاتے پروفیسر سیاہ چغہ پہنے ہوئے ڈرائنگ روم کے ایک چوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پریندو سے ایک سو گیارہ کا عدد بنا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے بوڑھے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ بھی کوئی ڈھانچہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ حلقے سے سرخ آنکھوں لے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”کیا چاہتی ہے؟ تیری منو کا منا پوری ہوگی۔“

جگدیو نے ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”مہاراج! اس کا جی بہت ظالم ہے۔ بے گھر کو سوگ بیٹا چاہتی ہے، وہ نرک بنا رہا ہے۔ یہ ایسے ناگم جی ہے، اپنا چچا اچھا جی ہے۔“

پروفیسر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا وہ تیرا بھی پتی ہے؟ اگر نہیں  
مورکھ..... تو بیچ میں نہ بول۔“

جگدیو جھپٹ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ریتا آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

”مہاراج! میں بہت پریشان ہوں۔ اپنی ملاوی سے ایک مسلمان کے  
ہوں۔ دھرم سے بے رحم ہو کر آپ کے پاس سہارے کے لئے آئی ہوں۔“

”تو سہارے کے لئے آئی ہے، مگر یہ کون ہے؟“

”یہ جگدیو ہے۔ میرا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔“

”اپنے ہمدرد سے بول، باہر چلا جائے تیرا کام ہے اس لئے تو یہاں رہے گی۔  
ریتا نے جگدیو کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا کہ وہ چلا جائے  
خاموشی سے سر جھکا کر چلا گیا۔ اس کے جلنے کے بعد پروفیسر سامری نے اپنے ہاتھ  
کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں آکر بیٹھ جا اور مجھے بتا کہ تیرا پتی کون ہے اور کیا ہے؟“

ریتا اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ پروفیسر نے کہا۔

”اوری ڈرتی کیوں ہے، کیا میں تجھے کھا جاؤں گا؟ ذرا اور قریب آ جا۔“

ریتا کھسک کر ذرا اور قریب آ گئی اور محسن کے ہارے میں اسے تانے لگا۔

اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے پتی کے علاوہ وہ سردوں سے بھی عشق کرتی تھی۔  
پروفیسر نے کہا۔

”تو کہتی ہے کہ وہ خطرناک ہے۔ مگر تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ خطرناک ہے۔“

ہمدردی سے... لہذا ان نظر آتا ہے، کیا یہ تیرے پتی کو ٹھکانے نہیں لگا سکتا؟“

”میرا پتی اس سے زیادہ ملوان ہے۔“

”تجھے کیسے معلوم ہوا..... کیا تیرے پتی نے جگدیو کی پٹلی کی ہے؟“

”کچھ چھپائے گی تو میں تیرے کام نہیں آسکوں گا۔“

یہاں کو جبور ہو کر تمام باتیں بتائی پڑیں کہ کس طرح اس کے پسے مانتی

ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اب وہ نہیں چاہتی کہ جگدیو بھی مارا جائے۔ اسی لئے

استعمال کرنے کے بجائے پروفیسر کے کانے علم سے فائدہ اٹھانے آئی ہے۔ پروفیسر

”جہاں آدمی کے شریر کی طاقت کام نہیں آتی، وہاں میرا دماغ کام کرتا ہے۔“

تاجپانچہ کے میں تیرے جگہ پر اور محسن سے زیادہ بلوان ہوں، اس لئے کہ میں ہی

ہم اسکا ہوں۔  
پوچھنے پہلے پہلے دانت نکال کر ہنسنے ہوئے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر  
بھیڑا لپٹ لیا۔ ریتا کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ بوڑھا بھی اس پر مرمئے گلہ  
بھی کرے گا۔ اس کی پتلی ہی کمر پر بوڑھی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ بڑی مشکل سے خود  
کو اس سے دور ہو گئی۔ پھر غصے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”کہا حرکت ہے۔ کیا تم نے مجھے کوئی بازاری عورت سمجھا ہے؟“

روشنی کے لئے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو بازاری نہیں ہے مگر اونچے کی مائیں مزاج ہے۔ جگدو چو تھا ہے پانچویں نمبر پر میرا نام لکھ لے اور یہاں سے ڈے دماغ سے سوچ کہ کون تیرے کام آسکتا ہے۔ تو مجھے بوڑھا نہ سمجھ۔ میرا دل ہے۔ میں ایک پھونک میں حسن کو اڑا دوں گا۔ سبب بھی اس سے پیچھا چھڑانا ہو پس چلی آئی اب بھاگ سہا یہاں سے تیرے جیسی یہاں کتنی ہی آتی رہتی بھاگ رہی ہے۔“

دماغ سے پاؤں تک ہستی ہوئی باہر آگئی۔ جگہ یو کار میں بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔  
 نہ رتا تو کہتے ہی پوچھا۔

”کیا بات ہے، تم غصے میں نظر آ رہی ہو؟“

دو کار میں ہمیشہ کرایک جھٹکے سے ورد اذی کو بند کرتی ہوئی ہو۔

”تم کس کہ ہے کے پاس مجھے نے آئے ہو۔ وہ بوڑھا ہڈی کا ڈھانچہ مجھے اپنی گود بہا تھا، کیسہ۔ بد معاش۔“

جگہوں نے غصے کا پتہ ہوئے کہا۔ ”اگر اس نے ایسی ذلیل حرکت کی ہے تو میں اس کا گھلا دیتا ہوں۔“

۱۸۔ انیسویں جنگ بیت سے باہر جانے لگا۔ رہتائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نقصان پہنچایا تو پھر مجھے تمہارا سہارا بھی نہیں ملے گا۔“

مگر یوں غصے میں بھول گیا تھا کہ وہ ایک نامور جادوگر سے ٹکرائے جا رہا ہے۔ ریتا کے سے مان گیا۔ مگر وہ خود کو بزدل ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کار انشاد کر کے آگے

بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں اس بوڑھے سے سمجھ لیں گا۔ اس کی یہ مجال کہ تمہیں ہاتھ لگائے  
میں یہ بھی پروا نہ تھی کہ تمہارا حسن تمہارے قریب آئے۔ میں ایک ہی گھر  
اے ناک آؤٹ کر سکتا ہوں مگر تم مجھے رد کرتی ہو۔“

”مردہ غصے میں پاگل ہو جاتے ہیں۔ میں نے پرکاش وغیرہ کا انجام دیکھ لیا ہے  
تمہیں حسن کے پاس جانے کی کبھی اجازت نہیں دوں گی۔ غصہ تھوڑا آج  
ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں ہے۔ یہ سنہری موقع غصے میں ضائع نہ کرو۔  
جگدو خوش ہو کر مسکرائے گا۔ وہ ریتا کو لے کر سیدھا اپنی کوٹھی پر آئے گا  
میں پہنچ کر ریتا تھکے ہوئے انداز میں ہائے کہتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ بستر سے اٹھ کر  
”ہائے“ ایک ہلاوہ تھا۔ جگدو نے مسکراتے ہوئے مینٹل پیس پر سے دستکی  
اٹالی۔ پھر ایک پیگ بنا کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”یہ جام تمہاری جوانی کے نام ہے..... پیس.....“

یہ کہنے ہی اس نے شراب حلق سے اتار لی۔ پھر آگے بڑھا کر گلاس اس کے  
سے چھوٹ گیا۔ وہ خود بھی گلاس کی طرح فرش پر آگیا اور تڑپتے ہوئے اپنے بچے  
حلق کو سلانے لگا۔ ریتا گھبرا کر بستر سے اٹھ گئی۔ اس کے پاس فرش پر آکر چل کر  
وقت تک وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

وہ اس صورت حال سے بالکل ہی بوکھلا گئی۔ جگدو کے جسم کی رنگت بد  
تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شراب میں زہر ملا ہوا تھا۔ وہ فوراً ہی  
اٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ کسی نے اسے جگدو کے ہمارا دہاں  
دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لی جاتی تو وہ زہر دینے کے الزام میں پکڑی جاتی۔ اس سے پہلے  
اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی کوٹھی میں آگئی۔

اپنی چھت کے نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ایک بہت ہی  
میں پھنسنے سے بچ گئی تھی۔ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ  
میں زہر کس نے ملایا ہوگا؟ بیڈ روم میں پہنچتے ہی جواب مل گیا۔ حسن بستر پر  
رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے

”کیا جگدو کا کریا کرم ہو چکا ہے؟“

رہتا کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ ایک پل میں ساری باتیں سمجھ میں آگئیں۔ اس کا  
 سامنے آنے لگا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفے پر آکر بیٹھ  
 اس کے کانوں میں محسن کی آواز گونجنے لگی۔

”ترجہ سے کتنی دور جھاگو گی؟ تم جہاں جاؤ گی میرے ہاتھ تمہارے چاہنے والے کی  
 تک پہنچ جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو مگر میں تمہیں  
 رہا سکھا دوں گا یا پھر تم اسی طرح بھاگتی بھاگتی مر جاؤ گی۔ نفرت کے باوجود ایک بات  
 دل میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ تم ازیت پسند ہو اور مجھے ایسی ہی عورتیں پسند  
 تم نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا دھن دیا ہے اور تم یہ دھن نبھاؤ گی۔ اب  
 بن نہ ہو تو کسی پانچویں عاشق کو تلاش کرو۔“

وہ جواب میں کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کے پاس عام عورتوں کی طرح آنسو بہانے کا  
 ہتھیار رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی، دونوں  
 پیلا کر اس پر گر پڑی۔ پھر اس کے سینے پر مر رہ کر رونے لگی۔

محسن اس کے لئے ایسا نوالہ بن گیا تھا جسے وہ نگل سکتی تھی نہ اگل سکتی تھی۔ عاشقوں سے مدد حاصل کرنے کے دوران وہ محسن کو برابر اگلنے کی کوشش کرتی رہی۔ اب اس کے دل میں وہشت بیٹھ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ محسن کی آغوش میں جا کر سوچتی کہ مرہ ہو تو ایسا ہو۔ عورت کو مدہوش بھی کر لے اور مرعوب بھی۔ وہ مرعوب ہو سوجتی تھی۔ مگر جب پردانے اس کے چاروں طرف منڈلانا شروع کر دیتے تو وہ ہلکے ہو کر سوچنے لگتی کہ ایک ہی پنجرے میں قید ہو کر زندگی گزارنا حماقت ہے۔ محسن نے جمل اور بھی ہیں۔

اس کی تکیوں مزاجی پھر اسے بھڑکالے گئی۔ بس ایک کوشش اور کرنی چاہیے ہے کہ اس بار محسن سے پیچھا چھوٹ جائے۔ اس مرتبہ انسانی طاقت سے نہیں بلکہ قوت سے کام لینا ہو گا۔ مگر اس مقصد کے لئے اس بوڑھے خبیث جادوگر کے پاس ہو گا۔ بوڑھے سامری کے تصور سے ہی اسے کراہت سی ہوتی تھی۔ مگر آخری بار کی امید صرف اسی کی ذات سے تھی۔

وہ دد دن تک شدید الجھنوں کا شکار رہی۔ دل کسی طرح بوڑھے کی طرف نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس کا فردر اسے سمجھا رہا تھا کہ بوڑھے سامری کی مدد حاصل نہ کرے۔ محسن ہمیشہ اس کے سر پر سوار رہے گا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ بوڑھا اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا ہے۔ وہ اسے اپنے کاندھے سے اتارنا چاہتی ہے۔ بوڑھا اپنی دونوں ٹانگیں اس کی گردن میں قینچی کی طرح پھنسا دیتا ہے اور وہ شدت سے چیخنے لگتی ہے۔

شاید ریتالے بھی سندباد جہازی کی کمائی پڑھی ہوگی۔ سندباد کے کاندھے پر بوڑھا اپنی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہی بوڑھا جادوگر سامری کے روپ میں اب اس کے کاندھے پر سوار ہو گیا تھا۔ ریتالے اس کے بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی اور

نکال کر کہہ رہا تھا۔  
”جوان عورت کبھی خالی نہیں رہتی۔ اسے ایک کے بعد دوسرے کا بوجھ اٹھانا پڑتا  
اگر تو ایک سے نجات حاصل کر لے گی تو دوسرا کسی بہانے چلا آئے گا۔ میں نے تجھے  
اسے نجات دلائی ہے، اس کا معاوضہ تو وصول کرنے دے۔“

دناتے کاٹھ سے پر اٹھائے ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ صبح سے شام  
شام کے بعد رات آگئی۔ رات کے وقت اس بوڑھے پر غنودگی طاری ہوئی تو ریتا  
س کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اسے ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ اسے یوں لگا جیسے  
یا بوڑھے کے ساتھ خود بھی گہری پستی میں لڑھکتی جا رہی ہو۔ اسی گھبراہٹ میں اس  
کے کھل گئی۔

وہ ہڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھی صبح ہونے والی تھی۔ اس کے پاس ہی بستر پر محسن گہری  
درا تھا۔ اس نے خواب میں اس دیو سے پچھا چھڑا لیا تھا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی وہ سامنے  
دیکھا لیکن وہ خواب میں بھی اس سے پچھا چھڑا کر مطمئن نہیں تھی۔ کیونکہ بوڑھے  
سے قید کر لیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کس کی قید میں رہنا بہتر ہے۔ جوان کی قید  
بوڑھے کی؟

وہ جوان بے حد خطرناک تھا۔ کتنے ہی کزبل جوان عاشق اس کے ہاتھوں مارے گئے  
ریتا کی کوئی چالاکی بھی کام نہ آتی تھی۔ اسی لئے اب وہ بوڑھے کو ترجیح دے رہی  
اس خواب نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ذرا چالاکی سے کام لے تو اس بوڑھے سے  
پچھا چھڑا لے گی۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کا سر پکھل دے گی یا کھانے میں  
اسے کراسے ہلاک کر دے گی۔ بوڑھا کتنا ہی شاطر ہو، جوان عورت کے چھیل فریب  
جائے گا۔

صبح دس بجے جب محسن حسب معمول گھر سے چلا گیا تو وہ گھنٹہ بھر تک سنگھار کرتی  
اس نے بہترین لباس پہنا، بہترین خوشبو لگائی۔ پھر بوڑھے جادوگر پر اپنی جوانی کا جادو  
بکھیرا۔ اسے دیکھتے ہی بوڑھے کا منہ خوشی سے کھل گیا۔

”میں جانتا تھا کہ تو ضرور آئے گی۔ کیونکہ تیرے جیسی عورت جب اپنے پتی سے  
کرتی ہے تو اس بے چارے کو ترک میں پہنچانے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا  
کرتی ہے۔“

بوڑھے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے چومتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ ہاتھ میرا اب تیرا پتی اسے کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔“

ریتا نے بڑی کراہت سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا کیونکہ بوسہ لینے وقت اس کی رال ٹپک گئی تھی۔ مگر اس نے ٹھیک کہا تھا، ایسی عورتیں بڑی سے بڑی قیمت لیا کرتی ہیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لیبارٹری کی طرف لے جانے لگا۔ ریتا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”زردان کے راستے پر..... چپ چاپ چلی آ۔“

”تم..... تم محسن کو کس طرح راستے سے ہٹاؤ گے؟“

”تو نے اپنی جو پتہ سنا لی ہے اور تیرے پچھلے عاشقوں کا جو حال ہوا ہے، اس نے مجھے لیا ہے کہ تیرا پتی کچھ خطرناک ہے۔ میں اس کا سامنا نہیں کروں گا، میرے لیے اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔“

اس نے لیبارٹری کا دروازہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے بونفٹ نکلا۔ اسے دیکھتے ہی ریتا خوف سے چیخ پڑی اور بوڑھے سے لپٹ گئی۔ لیبارٹری کے ایک کمرے میں مرود انسانوں کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ بوڑھا اس کے لپٹنے سے تھوڑی دیر تک محفوظ ہوتا رہا پھر اس نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”اری ڈرتی کیوں ہے۔ ان ڈھانچوں میں جان نہیں ہے۔ ان میں صرف الیکٹرانک جان پڑتی ہے جب میں چاہتا ہوں۔ یہ میری مرضی کے بغیر تیرے قریب نہیں آ سکتے گے۔“

وہ سہم کر بولی۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گی۔“

”اندر نہیں جائے گی۔ ان ڈھانچوں کو نہیں سمجھے گی تو محسن کا زندہ ڈھانچہ نہیں چھوڑے گا۔“

اسے مجبوراً لیبارٹری کے اندر جانا پڑا۔ اندر پہنچ کر بھی وہ بوڑھے سے ٹپک لپٹ کر اس لیبارٹری میں کبھی بہترین سائنسی آلات تھے۔ اب بھی وہ چار مشینیں نظر آ رہی تھیں۔ مگر ان کے ساتھ استخوانی ڈھانچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سامری جادوگر کے ڈھانچے کے پاس لے کیا اور اسے چھونے ہوئے ریتا سے بولا۔



مڑ بھی ہاتھ لگا کر دیکھ میری موجودگی میں یہ تجھے کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“  
ریتا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ لگایا۔ ان ڈھانچوں پر پتلی سی کھال منڈھی ہوئی تھی۔  
وہی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ مگر ہڈیوں کے درمیان کا خلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوڑھے

اس ڈھانچے کے سینے میں اور کھوپڑی میں سائنسی آلات نصب کئے گئے ہیں کالے  
اور دیر پا نہیں ہوتا۔ سائنسی آلات کے ذریعے میں جو کام ان ڈھانچوں سے لے  
نا کوئی جادوگر نہیں لے سکتا۔ ادھر آ۔ میں تجھے بتاتا ہوں کہ یہ میرے تمام چیلے  
مجھ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔“

وہ ایک چھوٹی سی مشین کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس مشین میں بے شمار چھوٹے  
بٹن لگے ہوئے تھے ریتا توجہ سے اسے دیکھنے لگی۔ ہر بٹن کے ساتھ ہدایات کے  
ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ جس بٹن پر آن لکھا ہوا تھا 'بوڑھے' نے اسے ایک انگلی سے

آن ہوتے ہی سامنے کھڑا ہوا ڈھانچہ ہولے ہولے لرزے لگا۔ ریتا نے سہم کر  
اس کے بازو کو تھام لیا۔ بوڑھے نے کہا۔

"ڈرتی کیسا ہے۔ وہ ڈھانچہ اتنا خطرناک نہیں ہے، یہ مشین خطرناک ہے۔ تو اس  
کے چھوٹے سے ٹی وی اسکرین کو دیکھتی رہ جب کبھی یہ ڈھانچہ ہماری نظروں سے  
من کے پاس جائے گا تو ریڈیائی لہروں کے ذریعے یہ ہمیں اسکرین پر نظر آتا رہے گا۔  
ہاتھ کے سامنے جو لوگ ہوں گے وہ بھی اسکرین پر نظر آئیں گے۔ اب دیکھ اس  
کے سامنے "قارورڈ" لکھا ہے، میں اسے دباؤں گا تو یہ ڈھانچہ آگے کی طرف بڑھے  
کہ بٹن کر دباؤں گا تو یہ دائیں طرف بڑھے گا اور اسے دباؤں گا تو یہ بائیں طرف  
گے۔"

وہ بے بعد دیگرے بٹن دبا گیا۔ ان کے مطابق وہ ڈھانچہ آگے پیچھے دائیں بائیں  
کرے لگا۔ بوڑھے نے ریتا سے کہا۔

"یہ تو شرفانہ حرکت ہے۔ اب دیکھ، یہ لڑنا کس طرح ہے۔"  
یہ کہہ کر وہ مختلف بٹنوں کو دبائے لگا۔ ریتا حیرانی سے ڈھانچے کو دیکھنے لگی۔ وہ  
ایک بہترین فائزر کی طرح چپترے بدل رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی پھرتی سے

کرائے کے انداز میں چلا رہا تھا۔ ایک میز پر ایک استخوانی کھوپڑی رکھی ہوئی بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

”اب دیکھو، یہ اپنے دشمن کا گھاس طرح گھونٹ سکتا ہے۔“

بوڑھا پھر مشین آپریٹ کرنے لگا۔ ڈھانچہ آگے بڑھتا ہوا اس کھوپڑی کے پاس اور اسے دونوں ہاتھوں کے استخوانی پنجوں میں دبوچ لیا۔ پھر اسے اتنی قوت سے شروع کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے شکم میں پورے ہو گئی۔ ریتانے بوڑھے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”ڈنڈر فل..... اس سے تو محسن کا باپ بھی نہیں بچ سکے گا تم اسے کس کیسے پہنچاؤ گے؟“

”اے محسن کے پاس پہنچانا میرا کام ہے، ابھی تم میرے پاس پہنچ جاؤ۔“

یہ کہہ کر بوڑھے نے اسے ایک جھکے سے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔

☆=====☆

اپنی کوشش میں پہنچ کر اسے بوڑھا یاد آتا رہا۔ ساتھ ہی ابکیاں بھی آتی رہیں۔ جتنی گالیاں یاد تھیں، اسے دل ہی دل میں دیتی رہی۔ بے چاری مجبور تھی اور کئی سو میں آواز تھلی کی طرح اڑنے کے لئے بوڑھے طوفان کی زو میں آگئی تھی۔ مگر ہزار دینے کے باوجود وہ اس کی احسان مند تھی۔ جب تک وہ بوڑھے کے پاس رہنا چاہتا تھا کام کی باتیں جتنا رہا اور منصوبے جتنا رہا کہ کس طرح محسن کو گھیرا جائے گا۔

ریتانے بوڑھے کو بتایا تھا کہ آج رات وہ محسن کے ساتھ پہاڑ تلی ہائے گہرے کے ریسٹورنٹ میں وہ لوگ کھانا کھائیں گے، وہاں کی میر کریں گے پھر آدھی رات کو واپس ہوگی۔ واپسی میں کسی ویران راستے پر وہ ڈھانچہ اس کا راستہ روک سکتا۔ بوڑھے نے اس سے سوال کیا۔

”کیا محسن بھوتوں کے وجود پر یقین رکھتا ہے؟“

”نہیں۔ وہ ان باتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔“

”میں بڑے بڑے مذاق اڑانے والوں کو قائل کر چکا ہوں کہ مردہ ڈھانچے جیسے انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور بولتے ہیں۔ اب سے پہلے کئی بار میں نے ایسے لوگوں کو دروازوں پر اس ڈھانچے کو بھیجا ہے۔ جب وہ آدھی رات کو اسے دروازے پر آتا ہے

ساری آنکھوں بھول جاتے ہیں۔“

ریتا کو اچانک کچھ یاد آیا، اس نے پوچھا۔

”کیا تم نے چندر پور کی بستی میں بھی کبھی ڈھانچے کو بھیجا تھا؟“

”ہاں۔ ایسے وقت جب وہاں برفباری ہو رہی تھی تو اس ڈھانچے کو میں اپنے ساتھ لیا تھا مگر ان غیر ضروری باتوں سے کیا حاصل ہو گا۔ تجھے کام کی باتیں پوچھنی

پہنچنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ محسن کو ہلاک کرنے کا پروگرام پہلے ہی بن چکا تھا۔ وہ منظر ہو چکی تھی، اسی لئے اس کا ذہن منہی شیلہ کی طرف بھٹک رہا تھا جس نے ڈھانچے کی کہانی سنا لی تھی۔ اب ریتا سوچ رہی تھی کہ واقعی بھوتوں کا کوئی وجود نہیں ہوڑھے سامری جیسے شعبہ کے باز ایچھے خاصے ذہین لوگوں کو بھی خوفزدہ کر دیتے

اس رات وہ پروگرام کے مطابق محسن کے ساتھ پہاڑ تلی گئی۔ وہ بہت خوش نظر آئی اور اپنی اداؤں سے یہ ثابت کر رہی تھی کہ اب وہ محسن کی مناظر ساری دنیا کو بچا ہے۔ محسن نے بھی یہی سمجھا کہ وہ اب راہِ راست پر آگئی ہے۔ اس خوشی میں اس کے چہ یک حلق سے اتار گیا۔ جب وہ بارہ بجے رات کو وہاں سے واپس چلے تو اس کی وجہ سے اس کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک پیگ اور چڑھایا۔ پھر ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کرتا ہوا شر کی طرف چل

ریتا اس کے پاس بیٹھی ہوئی کار کی تیز رفتاری سے گھبرا رہی تھی اور اسے سمجھا رہی کہ ذرا آہستہ ڈرائیو کرے۔ مگر وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اس کا دماغ اور اس کے پاؤں کے قابو میں نہیں تھے بس وہ اتنا سمجھ رہا تھا کہ سامنے ودر تک ایک راستہ چلا گیا ہے اسے تیز رفتاری سے چلتے رہنا ہے۔ مگر آگے جا کر اس کے سامنے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ ایک کار سڑک پر تر چھی کھڑی ہوئی تھی۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ ہیڈ لک کی روشنی میں محسن دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے متواتر بار بار دینے مگر اس کار نے راستہ نہیں چھوڑا۔ مجبوراً اسے اپنی کار روکنی پڑی۔ وہ نشے کی حالت میں تھا اور گالیاں بکتا ہوا کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اسی وقت سامنے کھڑی

ہوئی کار کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک ڈھانچہ باہر اٹکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔  
محسن بوکھلا کر بار بار اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اے دیکھنے لگا۔ اس کی کمر  
آ رہا تھا کہ بھوت کار سے نکل کر کس طرح آسکتا ہے۔ رہتا ہے خوفزدہ ہونے کی  
کی اور اس سے کہہ۔

”محسن! معلوم ہوتا ہے یہ دی بھوت ہے جو شیلہ کے یہاں تمہیں تلاش کر  
تھا۔ یہاں سے بھاگ چلو۔“

محسن نے نشے کی ترنگ میں ایک بڑھک مارنے ہوئے کہہ ”میں بڑول نہیں  
میں اس بھوت کی ہڈی پٹلی ایک کر دوں گا اور اس کے پاس تو صرف ہڈی اور ہڈی  
ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر کار کی سینٹرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا پردیسر سارا  
آپریت کر رہا تھا۔ اس کے مطابق ڈھانچہ بھی آگے بڑھ کر محسن نے منہ چاٹا کہ پانی  
پھٹکا سا ڈھانچہ ہے ایک ٹھوکر میں اڑ جائے گا مگر اس سے پہلے ہی ڈھانچے نے  
اس کے سینے پر ایک لاٹ ماری۔ ڈھانچے کا نشانہ اس لئے خطا نہیں ہو سکتا تھا کہ  
سامری مشین کے چھوٹے سے ٹی دی سکریں پر محسن کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس پہاڑ  
ہے اور اس پر کس طرح حملہ ہوتا چاہئے۔

لاٹ کھا کر گرتے ہی محسن کا آدھا نشہ ہرن ہو گیا۔ اب کی بار وہ جم کر زمین پر  
اور آگے بڑھتے ہی متواتر دو ہاتھ مارے ایک ہاتھ ڈھانچے نے روک لیا مگر وہ  
گیا اور تنکے کی طرح اچھل کر دور جا پڑا۔ وہ جتنی دور جا کر گر اتنا جتنی ہی پھرتی ہے  
کر پھر قریب آگیا۔ محسن نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں مشین  
تیزی سے چل رہے تھے۔ مشین کو حرف آپریٹ کرنے والی کلوں سے ردا آ رہا  
انسانی ہاتھ اس کی زد میں آکر زخمی ہو جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ محسن نے  
زخمی ہو کر گرتے گرتے ڈھانچے کے بازو پر کھڑی ہتھیلی کی ایک ایسی ضرب  
ڈھانچے کا ایک بازو ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ محسن بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہا  
زمین پر گر پڑا۔ اس کی ناک سے اور باپچوں سے لورس رہا تھا۔ ڈھانچے نے  
لگائی تھیں کہ اس کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔

دوسری طرف ڈھانچے کا ایک بازو ٹوٹ کر گرتے ہو رہا تھا اور حامری پر ٹپکتا

سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ محسن مشینی ڈھانچے پر بھی سبقت لے جائے مگر سامری کا ہونے کا تھا کہ ڈھانچہ اپنے دونوں ہاتھوں سے محسن کا گلا دوپچے مگر اب اس کا ایک ہاتھ مٹا تھا۔ اس کے باوجود پردیفسر پھر مشین آپریٹ کر لے لگا۔ اسے امید تھی کہ اب اس دیہ میں محسن اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا کیونکہ وہ بری طرح مار کھانے کے بعد مگر اچھا کہ دوبارہ نہیں اٹھ سکتا تھا۔

ڈھانچہ اچھل کر اس کے قریب آیا تاکہ اسے ٹھوکریں مار مار کر بانٹل ہی زمین کا مرنے دے۔ محسن کے چہرے پر ادر سینے پر درد زبردست ٹھوکریں پڑیں۔ وہ چیختا ہوا بن کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ ڈھانچہ بھی اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ سطح زمین پر پہنچ محسن کا زخم خوردہ جسم ٹھہر گیا۔ ڈھانچے نے پھر ایک لات چلائی محسن نے اپنی آخری اہم قوتوں کو جمع کر کے ڈھانچے کی ٹانگ پکڑ لی۔ پھر اسے پوری قوت سے دوسری طرف بٹک دیا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا پتھر تھا۔ اس پتھر سے ٹکراتے ہی ڈھانچے کی کھوپڑی بے کچھ ٹوٹنے پھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کھوپڑی کے اندر جو آلات تھے انہیں کہیں سے سامان پہنچا تھا۔ اب اس ڈھانچے کی آنکھیں اپنے سامنے کا منظر ٹیلی کاسٹ نہیں کر رہی ہیں۔ مشین کے ٹی دی اسکرین پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

پردیفسر حامری خوفزدہ ہو کر کار سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ڈھانچے کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ محسن زندہ ہے یا سر گیا۔ اس کی خبر نہیں تھی۔ کار سے اتر کر دھر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ڈھانچے کی طرح اس کے بھی ٹکڑے نہ لڑے۔ اس نے آزمائش کے طور پر مشین کو پھر آپریٹ کیا۔ چند لمحوں بعد ڈھانچہ نشیبی سے ابھر کر سڑک کے کنارے آگیا۔ مگر اس کی حالت عجیب تھی۔ ایک بازو پہلے ہی بٹ چکا تھا۔ کھوپڑی ترخ کرد حصوں میں تقسیم ہونے والی تھی اور سامنے کی طرف ہٹ کر سینے پر ٹھہر گئی تھی۔ سینے میں جو آلات نصب تھے وہی اسے کشاں کشاں پردیفسر کے قریب لے گئے۔ پردیفسر نے کار سے نکل کر ڈھانچے کو پچھلی سیٹ میں ٹھونس دیا۔ رہتا دھڑکی ہوئی اس کے پاس آئی۔ پھر خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔

”م..... محسن کہیں زندہ تو نہیں ہے؟“

پردیفسر کی آواز بھی سہمی ہوئی تھی۔ ”حت..... تو جا کے دیکھ میرا خیال ہے کہ وہ کھا ہے۔“

”تم کیسے مرد ہو، خود نہیں جانتے۔ مجھے آگے بڑھا رہے ہو۔“

”اس میں مردانگی کی کیا بات ہے۔ تو اس کی جتنی ہے، تجھے اس کے پاس پہنچنا نہیں کس شیطان سے تو نے شادی کی ہے۔ وہ تو ایسا خطرناک ہے کہ مرے لڑکے یقین نہیں آتا کہ مرچکا ہے۔ میرا یہ ڈھانچہ بہت قیمتی ہے میں اسے لے کر جا رہا ہوں وہ زندہ بچ گیا تو پھر میرے پاس آئے۔ کوئی دوسری تدبیر کی جائے گی۔“

اس نے ریتا کا جواب نہیں سنا۔ کار انٹارٹ کرنے کے بعد ”بوش پوٹ لکڑی“ اسے تھپا چھوڑ کر چلا گیا۔ ریتا تھوڑی دیر تک سہمے ہوئے انداز میں کھڑی رہی۔ پھر ڈرتے قدم بڑھاتی ہوئی سڑک کے کنارے آئی۔ اس کے دماغ نے سمجھا ”ڈرتے“ بات ہے۔ محسن اس بار اس پر شبہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس بار اس کے کسی عاشق نے حملہ نہیں کیا تھا اور حملہ کرنے والا ڈھانچہ اس کا عاشق نہیں ہو سکتا تھا۔ اطمینان ہوا تو اس نے نشیب کی طرف دیکھا۔ محسن بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ پر رہینگا ہوا اور کراہتا ہوا سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ ریتا نے اچانک آنسوؤں کا چہرہ دیکھا۔ وہ روتی ہوئی اور چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

”ہائے ہائے محسن! یہ تمہیں کیا ہو گیا میری جان..... نہ جانے اس بھوت سے کیا دشمنی ہو گئی تھی۔ دیکھو تو اس نے تمہاری کیا حالت کی ہے۔“

وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ محسن نے اس کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے نقاب سے کانپتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

”کہاں ہے وہ بھوت..... میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“

”وہ بھاگ گیا ہے۔ تم بہت دیر ہو محسن! مجھے تم پر ناز ہے۔“

وہ اس کے سہارے لڑکھڑاتا ہوا کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اپنے انگوٹھ بھولنے کے لئے دہسکی یا برائڈ کی ضرورت تھی ریتا نے اسٹیئرنگ سیٹ پر قبضہ کر کے بورڈ سے دہسکی کی چھوٹی سی بوتل نکالی۔ پھر اسے محسن کی طرف بڑھا دیا۔ محسن نے اٹھا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

”تم جانتی ہو کہ میں وہی بوتل استعمال کرتا ہوں جو میرے پاس لاکھڑی ہوتی ہے۔ دیر میں اس ڈھانچے سے لڑتا رہا، اتنی دیر یہ بوتل تمہارے قریب تھی۔ مجھے یاد ہے کہ نے اپنے پہلے عاشق کو شراب میں زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ میں تمہارے ساتھ تھا۔“

ارہتا ہوں عمر تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اس بوتل کو باہر پھینک دو اور کار ڈرائیو کرو  
مزمینی کے لئے فوراً ہی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔“  
”تم خواہ خواہ مجھ پر شبہ کرتے ہو۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھی کہو گے کہ وہ ہڈیوں کا  
نیچہ میرا عاشق تھا۔“

”میں یہ نہیں کہوں گا۔ دیے تمہارے جیسی ناکام عورتیں مجبور ہو کر بھوتوں سے  
عشق کر لیتی ہیں۔ چلو وقت ضائع نہ کرو گاڑی آگے بڑھاؤ۔“  
ریتانے ڈیر لب بڑبڑاتے ہوئے دھسکی کی بوتل کو گاڑی کی کھڑکی سے باہر پھینک  
بھرکار اشارت کر کے آگے بڑھادی۔ ایک ڈھانچے کا سہارا لے کر وہ مصیبت میں پڑ  
ہاتھی۔ گھر پہنچ کر اسے ساری رات محسن کی تیمارداری کے لئے جاگنا پڑا۔ دوسرے دن  
پہلی رات کی نیند پوری کرتی رہی۔ تیسرے دن محسن زخموں کے باوجود چلنے پھرنے کے  
ل ہو گیا۔ وہ گھر سے باہر گیا تو یہ بھی پردیفسر کے پاس پہنچ گئی۔ پردیفسر نے اسے دیکھتے ہی

”نیرا کوئی عاشق مرنے کے بعد واپس نہیں آیا۔ مگر میرے ڈھانچے کی مشین ٹوٹنے  
بعد بھرن گئی ہے۔ اس بار محسن اس سے نہیں بچ سکے گا۔“  
”اور اگر بچ گیا تو تم مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔“ ریتانے طنزیہ انداز میں کہا۔

”بیکار باتیں نہ کریں نے تجھے جیون بھر ساتھ دینے کا دھن نہیں دیا ہے۔ میرا کام  
رک محسن کو مارنا ہے۔ میں اس لئے بھاگتا ہوں کہ مجھے اپنی جان پیاری ہے۔ مگر اب  
اگے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میرے ساتھ آ‘ میں تجھے جاتا ہوں۔“

وہ پھر اسے لیبارٹری میں لے آیا۔ اس بار جو ڈھانچہ مستعد کھڑا داتا تھا اس کے ہاتھ  
ن ایک سائیکس لگا ہوا ریوالبور تھا۔ پردیفسر نے مشین کے پاس پہنچ کر کہا۔

”پہلے والا ڈھانچہ نشتا تھا۔ پچھلے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان ہو یا شیطان  
محسن سے نشتا ہو کر مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب ذرا قریب آکر اس اسکرین پر دیکھ۔ اس  
ڈھانچے کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرے گا۔“

ریتا قریب آئی تو پردیفسر نے مشین کو آن کیا۔ اسکرین پر سامنے کی دیوار پر ایک  
نئی لگی ہوئی تھی۔ اس سختی پر ایک چھوٹا سا نقطہ بنا ہوا تھا۔ پردیفسر مختلف بنوں کو دباتا  
بالتا تھا۔ ڈھانچے کا ریوالبور والا ہاتھ اٹھ رہا تھا۔ اسکرین پر صحیح ٹارگٹ کا ایک دائرہ نظر

آ رہا تھا۔ اس دائرے کی سیدھ پر جب ریو الوور لی ٹال پہنچی تو پروفیسر نے قارون دیا۔ نشان بالکل صحیح تھا۔ ایک کھٹ کی آواز سنائی دی اور تختی پر جو نقطہ بنا ہوا تھا ایک سوراخ نظر آ رہا تھا۔ رہتا ہے اس نشانے سے مطمئن ہو کر اطمینان کی ایک سانس لی۔ اب یقین ہو گیا تھا کہ محسن ریو الوور کی زد میں آ کر نہیں بچ سکے گا۔

”آج آدمی رات کے بعد میں اس ڈھانچے کو لے کر تیری کوٹھی میں آئی گا۔ باہر کار میں بیٹھ کر مشین آپریٹ کرتا رہوں گا۔ ڈھانچہ تیری کوٹھی کے اندر محسن ریو الوور کی موجودگی میں اس کے قریب آ کر اپنے دائرے پہنچے سے اسے توڑنے کی جرات نہیں کرے گا۔ یہ کھیل زیادہ لمبا نہیں ہو گا۔ ڈھانچہ اس پر فائر کرنے ریو الوور میں چھ گولیاں ہوں گی۔ محسن اس کی بچی نشانہ بازی سے بچ نہیں سکے گا۔ ہلاک کرنے کے بعد یہ واپس آ جائے گا۔ اس کے بعد تم اپنے ہاں کھول کر اس کی لاش روٹی رہنا۔ فرمانبردار بیویاں یہی کرتی ہیں۔“

وہ بہت دیر تک محسن کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بناتے رہے۔ پھر رات مطمئن واپس آ گئی۔ اس رات محسن کے باہر جانے کی توقع نہیں تھی کیونکہ پچھلے رات تھے۔ رات آئی تو دس بجے محسن ڈنر کے وقت پینے کے لئے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس رات سیاہ بادل اٹھ کر آ رہے تھے۔ وہ گرج رہے تھے اور برس رہے تھے۔ بجلیاں وہ رہ کر کوند رہی تھیں اور بھینک اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ہوائیں زور زور سے سیٹیاں بجا رہی تھیں اور فضا بہت ہی دہشت ناک تھی۔

ایسے میں پروفیسر سامری کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ شدید بارش کی وجہ سے دھار کے پار کا منظر دھندلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بوڑھے کی آنکھیں تیز تھیں اور احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔ ڈھانچے کے ایک ہی سی مشین رکھی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے سوچ رکھا تھا کہ ریت کی کوٹھی کے پہنچ کر وہ پچھلی سیٹ پر آ جائے گا۔ اس کے بعد مشین آپریٹ کرے گا لیکن مشین کے پاس ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا۔

سڑک بہت ہی خستہ حالت میں تھی۔ جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ اس



دوسرے ادھر ڈنگا جاتی تھی۔ کار کے ساتھ ڈھانچہ بھی ادھر سے ادھر ڈنگا رہا تھا۔ ایسے وقت اس کا ہاتھ مشین کے آن والے بٹن پر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈھانچہ بھی آن بیکل بارش اور طوفان کے شور میں مشین کی دھیمی دھیمی سی آواز دب گئی تھی۔ جانچ کے ڈنگا نے کام عمل جاری تھا۔ کار کے بار بار اچھلنے کے باعث ڈھانچے کا ہاتھ بھی پھل اچھل کر مختلف بٹنوں پر پڑ رہا تھا۔ ریو الور والا ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ پردیسر کی لمبائی کے پیچھے ریو الور شلنے پر پہنچ کر رک گیا۔ سڑک تھوڑی دور تک ذرا اچھی حالت میں تھی۔ تھوڑی دور تک پردیسر کے نصیب بھی اچھے رہے آگے جا کر کار پھر اڑنے لگی۔ بار بار اچھلنے لگی۔ بارش اور طوفان کے شور میں سائیکس رنگے ریو الور نے در نہیں چایا لیکن کار بے قابو ہو گئی اور ایک درعت سے ٹکرا کر رک گئی۔ پردیسر کی لمبائی میں سورج ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی کھٹا کھٹ فارنگ ہو رہی تھی۔ کیونکہ فائر والا بٹن بدستور دبا ہوا تھا۔ ریو الور سالی ہو چکا تھا مگر ڈھانچے کی انگلی ٹرانسپر پر چلتی جا رہی تھی۔ اب نہ تو وہاں مشین کو آف کرنے والا کوئی تھا اور نہ ہی اسے آپریٹ کر کے ڈھانچے کو کوئی باہر نکال سکتا تھا۔ وہ چابی دیے ہوئے کھلونے کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھا ٹرانسپر پر ہمارا۔

ریتا اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ٹل رہی تھی۔ محسن ڈرائنگ روم میں دھسکی سے شغل کر رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی اور ڈھانچہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ریتا کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی وقت زور کی بجلی گزری۔ ایسی دل ہلا دینے والی آواز تھی کہ ریتا جج کر بستر پر گر پڑی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن نے شراب کا جام میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”دروازہ..... زارا..... کھول..... ہو..... در.....“

سرد ہوائیں دروازے کے باہر تھر تھرا رہی تھیں۔ محسن نے آگر بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پھر ٹیک بیک اچھل کر پیچھے چلا گیا۔ باہر وہی ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی محسن کے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ وہ اپنی کمزوری کو سمجھ رہا تھا کہ اس بڑے مقابلہ کے بعد ڈھانچے کے ہاتھوں میں بیج سکے گا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

”کونسا ہو تم؟ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟“

ڈھانچہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کی آواز مرد ہواؤں کی سرسراہٹ تھی۔

”محسن! میرے قاتل..... میں نے تجھے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ آخر یہاں ہی گیا۔“

”میں تمہارا قاتل نہیں ہوں..... تم کون ہو؟“

”میرا نام واجند رہتہ ہے۔ میں ریتا کا منگیترا تھا۔ میں نے شادی سے پہلے چند مکان ریتا کے نام لکھ دیا تھا۔ ایسے ہی وقت تم نے میری منگیترا کو اپنی محبت کے بدلے پھنسا لیا۔ میں تمہاری سازش سے بے خبر تھا لیکن فیض آباد سے میرے ایک وقاردارا نے مجھے ایک خط لکھا کہ تم ریتا کے ساتھ چند رپور آرہے ہو تاکہ مجھے زہر دے کہا کر سکو۔ میرے ملازم نے چند رپور کے اسی مکان کے پتے پر مجھے خط لکھا تھا جسے میں ریتا کے نام کر دیا تھا۔ مگر ان دنوں برفباری ہو رہی تھی، اس لئے وہ مکان منقل میرے ملازم کا وہ خط اس دروازے سے داپس ہو کر مردہ خطوط کے ذخیرے میں چلا گیا۔ اس طرح مجھے تمہاری سازش کا علم نہیں ہو سکا۔ ایک ہفتے بعد میں برفباری کے منظر لطف اندوز ہونے کے لئے اس مکان میں آیا۔ اس مکان کی ایک چابی میرے پاس تھی۔ اس کے دوسرے ہی دن تم ریتا کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور میری غفلت سے اٹھا کر میری دہسکی کی بوتل میں زہر ملا دیا۔ وہاں میرا جو چوکیدار تھا، وہ تم سے ملا ہوا تھا۔ اس نے میری لاش کو چھپانے کے لئے مسلمانوں کے ایک قبرستان میں نے جا کو دفن کیا۔“

اتنا کہہ کر وہ چند لمحات تک ہانپتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

”وہاں خمانوں کی لاشیں نہلا دھلا کر دفنائی جاتی ہیں۔ وہ پاک صاف ہوتے ہیں۔ ان کے قبرستان میں بھی پاکیزگی ہوتی ہے۔ مگر میں ناپاک تھا۔ مرنے کے بعد بھی ناپاک۔ حالت میں قبر کا عذاب سہتا رہا۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے مہینے اور کتنے سال گئے۔ کراہا، رات اس غصے نے میری ہتھیلی پر آکر مجھے وہاں سے دوبارہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اب میں اپنے قاتل کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ میں ابھی تمہیں ہلاک کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد شمشان گھاٹ پہنچ کر اپنے کسی دھرم والے کی جلتی ہوئی چتا پر لٹ کر جہنم ہو جاؤں گا۔“

حسن نے ذرا پیچھے ہٹے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
 ”فہرہ..... آگے نہ بڑھو میں تمہارا قاتل نہیں ہوں۔ تم مجھے مارنے کے بعد  
 یہ تمہیں بچلی باتیں ذرا اچھی طرح یاد کرو۔ جب میں ریتا کے ساتھ تمہاری کونٹھی  
 امان بن کر آیا تھا تو تم نے دہسکی کی بوتل کھول کر دو جام بنائے تھے۔ ایک جام مجھے  
 دیا اور ایک منو اپنے لئے اٹھایا تھا۔ پینے کے دوران ریتا نے بتایا تھا کہ تم بہت بڑے  
 شہ ہو۔ تم اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئے۔ مجھے اپنے فن پارے دکھانے کے لئے  
 اپنے ساتھ اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے۔ اس وقت بھی ہم دونوں کے ہاتھوں میں اپنے  
 جام کے جام تھے۔ اسٹوڈیو سے واپسی پر پھر میں نے دوسرا جام نہیں لیا اور وہاں  
 رہنے کے لئے بھی نہیں فہرہ۔ ریتا کو اپنا مکان دکھانے کے لئے تمہاری کونٹھی سے باہر  
 گیا۔ میرا مکان وہاں سے قریب ہی تھا۔ مگر جب میں ریتا کے ساتھ دوبارہ واپس آیا تو  
 تمہاری لاش پڑی ہوئی تھی۔ تم خود ہی سوچو کہ جب ہم دونوں اسٹوڈیو میں تھے تو  
 تنگ دھڑ میں کھلی ہوئی بوتل کے پاس ریتا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس  
 میں زہر کس نے ملایا ہو گا۔ میں نے یا ریتا نے؟“

اٹھانچہ چند لمحوں کے لئے بالکل ساکت ہو گیا۔ اس پر تمام حقیقتیں روشن ہو رہی  
 تھیں۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ریتا معصوم اور نادان ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے زہر ملایا تھا۔ میں اس  
 پوچھوں گا..... وہ کہاں ہے؟“

حسن نے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ اٹھانچہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنی ہڈیاں  
 کھڑا ہوا بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ ریتا اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر بستر سے  
 اٹھی۔

”نت..... تم یہاں کیوں آئے ہو؟ پروفیسر کہاں ہے؟ اس نے کہا تھا کہ تم حسن  
 لاک کو روکے۔ کیا وہ ڈرائنگ روم میں نہیں ہے؟“

اٹھانچہ نے غٹ لہجے میں پوچھا۔ ”تم حسن کو کیوں ہلاک کرنا چاہتی ہو؟“  
 ”تم یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ پرسوں تو تم باتیں نہیں کر رہے تھے۔ پرسوں تم  
 لاک کی طرح حسن پر حملہ کیا تھا۔“  
 ”اچھا تو تم حسن پر پہلے بھی حملہ کرا چکی ہو؟“



# دل کے لئے

دس لاکھ مالیت کے نایاب ہیروں کی چوری کا انوکھا واقعہ۔ ایک ڈاکٹر  
نے ان ہیروں کو ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں قانون بے بس تھا۔  
ایک ایسی دل کی مریضہ کی کہانی جسے زندہ رکھنے کے لئے دو پانچ ہیرو  
زنی تھے۔

ساگرہ پارٹی ہزاروں کینڈل پاور کی روشنیوں سے جس طرح جگمگا رہی تھی، طرح اچانک ہی گہری تاریکی میں ڈوب گئی۔ شاید مین سوئچ آف کر دیا گیا تھا۔ بالکل باہر بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب سے نیون سائن کی دہم دہم روشنی بالکونی کے راستے اندر آرہی تھی جس میں تمام مہمانوں کے تاکید یوں نظر آرہے تھے جیسے بہت سارے بھوت اور بھتیاں آپس میں ٹکرا کر ادھر سے اگزر رہے ہوں۔

اس اندھیرے میں شہزادی شامینہ گم ہو گئی تھی۔ سرف اس کی صراحتی دادرگہ نوکھا ہار جگمگا رہا تھا۔ گہری تاریکی میں اس کے پانچ عدد پیرے اپنے جھپکتے دیکھ کر کسی دل والے کو لپکارہے تھے کہ آؤ اور ہمیں اس صبح گردن کی نزاکت سے اندر کر جاؤ۔

اچانک تاریکی چھا جانے کے باعث وہ ماحول کچھ رومانٹک اور کچھ پراسرار ساہ تھا۔ چند حسیناؤں کے منہ سے سہمی سہمی سی ہائے نکل رہی تھی۔ پھر یہ ہائے کمی نہ کے بازوؤں میں سمٹ کر گنگنائی ہوئی سسکیوں میں بدل رہی تھی لیکن شہزادی شامینہ ملے وہ اندھیرا عذاب جاں بن گیا تھا۔ اسے کہنے ہی سائے اپنی طرف بڑھتے نظر آ رہے تھے۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان میں سے کون نوکھا ہار کا لالچی ہے اور کون اس کے جسم کے تکیے کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

شہزادی کے مسلح باؤی گارڈز ہال کے اندر آ گئے تھے اور نوکھا ہار کی چک دیکھ کر شہزادی کی سمت بڑھتے ہوئے اور مہمانوں سے ٹکراتے ہوئے، معذرت چاہتے ہوئے تھے۔ ان سے پہلے ہی کسی نے شہزادی کے تکیے جیسے جسم کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ سم کر چیخا چاہتی تھی لیکن اس قدر بھوت نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ چیخنے سے پہلے ہی اس کے رس بھرے لبوں کو اپنے سفاک ہونٹوں کے درمیان قید کر لیا۔

اس نے تھلا کر اپنی گرفت سے نکلتا چاہا مگر دوسرے ہی لمحہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ راکرم آغوش سے نہیں نکل سکے گی۔ اندھیرے میں وہ بھوت ایک آئینہ کی طرح چملا رہا تھا۔ گلابی گلابی کھڑے پر اس کی سانسوں کے پھپکے آرہے تھے۔ وہ مدہوش چاری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہ لمحات طویل ہو جائیں لیکن وہ رنگین سپنا جلد ہی ٹوٹ نہی طرح بوتل سے گلاب اڑنے کی آواز آتی ہے، ویسی ہی آواز سے بوسہ چٹ کر اڑ گیا۔

مراتی دار گردن سے ایک پوجہ ہلکا ہو گیا۔ مسلح محافظ ہال کے وسط میں ہی رگ گئے تھے۔ شہزادی جیسے ہی اس بھوت کی آنکھوں میں مٹی تھی، دیسے ہی اس نوکھا ہار کے پانچ عدد ہیروں کی چمک بھی اس آغوش لم ہو گئی تھی۔ اس لئے محافظ ٹھٹھک کر یہ سوچنے لگے کہ شہزادی شاید پلٹ کر چاری دوسری طرف گھومتے کے باعث ہیروں کی چمک دکھ چھپ گئی ہے۔ وہ اندھیرے آنکھیں چاڑ چاڑ کر دیکھنے لگے۔ یہ انتظار کرنے لگے کہ شہزادی کہیں رک کر پلٹے اور اس کی چمک سمت کا تعین کرے تو وہ اس کی جانب بڑھیں۔

لیکن وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی ہوئی تھی۔ بھوت نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرنا۔ اب اس بھوت کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی گرفت اور بوسہ لذت میں کوئی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کسی کو صورت شکل سے پہچانا نہیں جاتا بلکہ دوسرے کے ہاتھوں اور جسموں کے لمس سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے سانسوں سے نہ لگایا تھا کہ اس بھوت کے سینے میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ اس کا بوسہ اب بھی اسے کی طرح اس کے رُس بھرے لبوں سے چپکا ہوا تھا۔ اب وہ اس آغوش اور اس سے کودنے کے اجالے میں بھی پہچان سکتی تھی (اگر وہ دوبارہ نصیب ہو جاتا)۔

اندھیرے میں کوئی اس سے ٹکرایا تو وہ رنگین خیالات سے چومک گئی۔ چونکتے ہی اسے پہلے اپنے نیکس کا خیال آیا پھر وہ گردن اور سینے پر ہاتھ پھیر کر چیخنے لگی۔ ”سیرا کوئی میرے گلے سے ہار نکال کر لے گیا ہے۔“

اس کی چیخ و پکار سے اندھیرے میں کھلبلی مچ گئی۔ مسلح محافظ تیزی سے بھیڑ کو چیرتے آواز کی سمت جانے لگے۔ اتنی ہی دیر میں کتنے ہی لوگوں نے اپنے اپنے لائسنس اور اس کی تیلیں روشن کرنی تھیں۔ لائسنس اور دیا سلامتی کی سنسنی روشنیاں پہلے بھی ہو سکتی تھیں لیکن لوجوانوں نے اندھیرے سے فائدہ اٹھالے کے لئے یہ زحمت نہیں اٹھائی تھی

لیکن اب بات دوسری تھی۔ ایک بیرونی ملک کی شہزادی جیج رہی تھی اور یہ خبر شادی کے کوئی اس کا نو لکھا ہار چا کر لے گیا ہے۔

اس پیش قیمت ہار کو دولہند عورتوں نے رشک سے دیکھا تھا۔ ہر عورت کی تھی کہ وہ ہار اس کے گلے کی زینت بن جائے۔ اب وہ خوش ہو گئیں کہ ہمیں نہ سہی 'چلو شہزادی بھی محروم ہو گئی۔ اس ہار کو تمام سردوں نے بھی تعریفی نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ سن کر کہ اس حسینہ کے گلے سے ہار خائب ہو گیا ہے، اب ہر مرد کی یہی تمنائیں وہ آگے بڑھ کر اسے تسلی دے اور تسلی دینے کے بہانے ایک شہزادی کے گلے کا ہار بن جائے۔

اس طرح تمام لوگ شہزادی کی طرف بڑھنے لگے اور بڑھنے سے زیادہ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے۔ وہ آپس میں ٹکرا رہے تھے مگر رہے تھے، سنبھل رہے تھے۔ چہ بھی شور مچاتی ہوئی گر رہی تھیں۔ ایک عجب قیامت کا شور برپا ہو گیا تھا۔ اسی وقت ام جاہلوں طرف روشنی پھیل گئی۔

ایک قیمتی ہار کی چوری سے صاف ظاہر تھا کہ کسی نے مین سوچ آف کر دیا۔ سوچ آن ہوتے ہی عمارت کے باہر بھی روشنی پھیل گئی۔ اتنی دیر میں ایک خوش ہونے والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا عمارت کے مین گیٹ سے باہر آچکا تھا اور اب فٹ پاتھ جیزی لے قدم بڑھا رہا تھا۔ وہاں سے پچاس گز آگے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کار کا کارڈر داڑھ کھول کر شیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ خانے سے گزرتے دلی گاڑیوں کی روشنیاں اس کے چہرے پر سے پھسلتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پانچ عدد ہیروں کے متعلق سوچنا چاہئے تھا جو نوکروں میں جڑے ہوئے تھے اور جو اس وقت اس کی بیب میں رکھے ہوئے تھے لیکن عجب بات یہ تھی کہ وہ خلاف عادت اس حسین اور نازک سے بدن کے متعلق سوچ رہا تھا جو ایک تجنیے کی طرح یوں اس کی آغوش میں سا گیا تھا جیسے نو لکھا ہار اس کی جیب میں سلیا ہوا ہے۔ اب تو وہ ماحول نہیں تھا اور وہ اندھیرا بھی نہیں تھا۔ وہ حسینہ بھی آغوش میں نہیں تھی لیکن وہ بار بار خیالوں میں آ رہی تھی اور اس شیرے کے دل و دماغ کو لوٹ کر لے جا رہی تھی۔



وہ ایک بدنام چور تھا۔ معمولی ڈکیتی میں اس کا نام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جہاں ہیرے برات کے چرائے جانے کی بات آتی تو سب سے پہلے اسی کا نام آتا۔ پولیس والے اس کا بھدی شروع کر دیتے اور انٹیلی جنس کے بڑے بڑے افسران اس کے پیچھے ہاتھ کر پڑ جاتے تھے۔ ان خائفوں کے پیش نظر اسے پہلے اپنے بچاؤ کے متعلق سوچنا چاہیے لیکن افسوس کہ دل و دماغ اپنے اختیار میں نہیں تھے۔ وہ رہ کر اسی نازک اندام ٹھکنے طرف ہلک رہے تھے۔ اب داستانِ حیات اس رخ پر چل رہی تھی کہ ایک نے اس مراچی دار گردن سے نوکھا ہار چرایا تھا دوسری اس چور کے سینے سے دل چرا کر لے لی۔

اس نے کئی بار شنراوی شاہینہ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن وہ دل کے چور اسے دماغ میں آتی رہی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے پوری طرح دل کے دروازے لہجے پہلی بار کسی لڑکی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس لئے اس نے کھلی آزادی دے کہ آؤ اور مجھے لوٹ لو۔ خیالوں میں لٹ کر کوئی کنگالہ نہیں ہو جاتا۔

اس کی یہی سوچ غلط تھی کہ خیال ہی خیال میں کوئی کنگالہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ غمی میں آہستہ آہستہ ذہنی طور پر کنگال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ حسینہ بڑی خاموشی سے اس سوچ کے خزانے لوٹ رہی تھی۔ مرد اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ عورت اس میں آکر کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ بگاڑتی اور بتاتی رہتی ہے۔ خیالوں سے حقیقی دنیا آکر شنراوی کے بعد۔

اس نے اپنی کار ایک پولیس اسٹیشن کے قریب روک دی۔ کار کے رکتے ہی ایک سوٹ میں اوپر عمر کا شخص تیزی سے آیا اور دروازہ کھول کر پاس والی سیٹ پر بیٹھنے کے بولا۔ ”کام ہو گیا؟“

”ہاں؟“ اس نے کوٹ اتارتے ہوئے جواب دیا۔ ”مالہ کوٹ کی اندرونی میب میں تم بتاؤ تمہارا کام ہو گیا؟“

”ہاں؟“ اس نے بھی جواب دیا۔ ”میں نے تھانیدار کو دو ہزار روپے دے دیے ہیں۔ پدارت نے یہ رپورٹ لکھ لی ہے کہ تم یعنی شاکر جمالی کے مکان پر اس شبہ کی بناء پر چھاپہ لگایا تھا کہ اس کے ہاں سے کافی مقدار میں چرس برآمد ہو سکے گی لیکن جمال نے شاید یہی چرس کا اشتاک کہیں دوسری جگہ خفیہ کر دیا تھا۔ اس کے ہاں صرف ایش ٹرے

میں پڑے ہوئے ایک ٹوٹے میں چرس کے اجزاء پائے گئے ہیں۔ شام کے چھ بجے جہلی کو حراست میں لے کر مالی پور کے تھانے میں لایا گیا اور اسے حوالات میں رکھا گیا۔ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد اگر جرم ثابت نہ ہوا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ فی الحال حوالات میں رکھنے کے لئے یہی جرم کافی ہے کہ وہ چرس کا سگریٹ استعمال کر رہا ہے اور اس سگریٹ کا ٹوٹا اس کی ایش ٹرے میں پایا گیا ہے۔“

شاہر جہلی لے تھانے کی جانب دیکھا پھر مطمئن ہو کر پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شام کے چھ بجے سے اس تھانے کی حوالات میں بند ہوں۔ قصر سلیمان میں سا لنگرہ پارٹی ہو رہی ہے، وہاں پونے نو بجے جو ہار چرایا گیا ہے، اس چوری سے میرا دل تعلق بھی نہیں ہے۔ مالی پور کے تھانے کی رپورٹ کے مطابق میں شام چھ بجے سے قیدی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے حوالات سے رہائی کب نصیب ہوگی؟“

”کل صبح چھ یا سات بجے تک تمہیں رہا کر دیا جائے گا؟“

”ٹھیک ہے۔“ جہلی نے اپنا کوٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہار پارٹی جو ہری کے پاس لے جاؤ اس سے کہو کہ ہار میں سے پانچ عدد ہیرے علیحدہ رکے اور پلاسٹک کے ڈیڑھ انچ کے کیپول میں رکھ دے۔ اس کے بعد تم وہ کیپول لے کر تھانے کے پاس جانا۔ وہ نیازی ہسپتال کے امپیشل وارڈ کے دو نمبر کمرے میں ہے۔ تین دن بعد اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ یہ ہیرے تین دن تک اس کے پاس محفوظ رہیں گے پولیس والے ہم سب سے پوچھ گچھ کرتے رہیں گے لیکن ان کا دھیان ہسپتال کی طرف نہیں جائے گا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے جہلی! مگر ٹینے آج کل ڈاکٹر خادر سے عشق کر رہی ہے۔ ڈاکٹر ہزار بیان سے اس پر فریفتہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹینے جذبات کی رو میں بہہ کر ان کے سامنے ہیروں کا ذکر کر دے۔ ایسی صورت میں اس کا عشق ہمارے لئے مصیبت بن جائے گا۔“

شاہر جمال آنکھیں میکیٹر کر سوچنے لگا۔ وہ ٹینے کے متعلق غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”وہ ڈاکٹر خادر سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی انحصار ڈاکٹر کی مسلسل توجہ پر ہے۔ وہ ڈاکٹر کی احسان مند ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر اسے سب کچھ بتا دے۔ ہر حال ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ تم یہ سنو“

ہمارے کہ وہ تین دن تک اپنی زبان بند رکھے۔ اگر ڈاکٹر خادر کو ہیروں کا علم ہوا تو جمالی دن کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ کہہ کر وہ اپنی پتلون بھی اتار لے گا۔ اس نے پتلون کے نیچے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ وہ کار سے باہر آیا تو اس کے جسم پر قبض اور پاجامہ تھا اور پاؤں میں چپلیں تھیں۔ اس کا سامنے کار لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ پیدل چلتا ہوا تھلے میں آیا۔ نذر نے اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر مصافحہ کیا پھر اسے پانچ سو پچیس کا سگریٹ نکالتے ہوئے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ شاکر جمالی کے لئے حوالات کا دروازہ کھول دے۔

جمالی نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا پھر دھواں چھوڑا ہوا حوالات کے اندر چلا گیا۔ یہی حوالات کے آہنی دروازے کو بند کر کے کالا لگا لے گا۔

☆-----☆-----☆

سالگرہ پارٹی میں آنے والے تمام مہمانوں کو عمارت سے باہر جانے سے روک دیا گیا۔ ناصر سلیمان کے چاروں طرف پولیس کے جوان سختی برت رہے تھے اور ملازموں کی بھی تلاشی کے بغیر انہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بڑے ہال میں بھی لاش کا سلسلہ جاری تھا۔ مہمانوں میں ملک کے بڑے بڑے رئیس اور حکومت کے اعلیٰ فرائض تھے۔ ان کی جیبوں کی بھی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اگرچہ وہ سب اپنی توہین محسوس کر رہے تھے لیکن ایک پرانے دیس کی شنراوی کو لونا گیا تھا۔ اس طرح اپنے دیس کی لڑنے پر حرف آ رہا تھا۔ لہذا بڑے بڑے لوگوں کو بھی مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی عزت یا اپنی اپنی پوزیشن کا خیال نہ کریں اور تلاشی دینے کے لئے چپ چاپ اپنے کپڑے اتار دیں۔

ایک علیحدہ کمرے میں لیڈی پولیس انسپکٹر اور دو لیڈی کانسٹیبل عورتوں کی باری باری تلاشی لے رہی تھیں لیکن ایک گھنٹے بعد پولیس والوں کو مایوسی ہوئی۔ وہ نوٹ لکھا ہار لے کر باہر نکلے۔ خیر پولیس کا ایک افسر صفدر علی وہاں سادے لباس میں موجود تھا اور ہر شخص کو گہری نظروں سے دیکھتا اور سوچتے پھر رہا تھا۔ شنراوی ایک بیڈ روم میں آ کر ایزی چیر کھٹکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ملک کے سفارت خانے کے دو افسر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور اسے یقین دلارہے تھے کہ وہ قیمتی ہار جلد ہی برآمد کر لیا

جائے گا۔

شنزادی شاہینہ چپ چاپ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اسے ہار کی ضرورت نہیں چرانے والے کی آرزو ہے۔ ہار بلاشبہ قیمتی تھا اور اس میں جڑے ہوئے انجمنیہ مایاب تھے۔ اس ہار کو اپنے گلے کی زینت بنا کر وہ ساری دنیا کو یوں فخر سے دیکھتی تھی کہ وہ تمام انسانوں سے برتری کا تمغہ حاصل کر چکی ہو۔ شنزادی کو اس نو لکھا ہار سے اتنا دل تھی کہ اتنی محبت اسے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں تھی لیکن اس وقت وہ بڑی عجیب سے سوچ رہی تھی کہ اسے کس کی ضرورت ہے۔ ہار کی یا اندھیرے میں آنے اور بھوت کی؟

صنذر علی لے بیڈروم میں آکر اسے خیالات سے چونکا دیا۔ اس نے کلمہ ہم شنزادی صاحبہ! آپ اطمینان رکھیں۔ چور کتنا ہی چالاک ہو پھر بھی وہ ہم سے بچ کر جائے گا۔ ہم بہت جلد اسے ہار سمیت گرفتار کر لیں گے۔

”سچ؟“ شنزادی اسے پر امید نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ صنذر علی نے سمجھا کہ وہ کے لئے بے چین ہے لیکن وہ چور کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ ”کیا وہ گرفتار ہو جائے گا؟“ جی ہاں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ضرور گرفتار کر لیا جائے گا۔ سلسلے میں ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”فرمائیے میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتی ہوں؟“

”میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے خاطر خواہ جواب دیا میں ان جوابات کی روشنی میں اس چور تک پہنچ جاؤں گا۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ چور ابھی اسی عمارت میں موجود ہے؟“

”جی ہاں۔ یہاں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ٹائٹ چوکیدار، دربان اور دو ملازموں سے یہی پوچھا ہے کہ انہوں نے کسی کو عمارت سے باہر جاتے دیکھا ہے یا نہیں؟“ حسب کا بیان یہی ہے کہ مہمانوں میں سے ایک بھی شخص باہر نہیں گیا ہے۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ آپ کے قریب آنے والا کوئی مہمان تھا یا ملازم تھا؟ اور یہ بات آپ بتا سکتی ہیں۔“

”میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ اندھیرے میں وہ نظر نہیں آیا تھا۔“

”اس کا نظر آنا اتنا ضروری نہیں ہے۔ ہم اندھیرے میں کسی کو چھو کر اس کے لئے

معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ مہمانوں کی طرح ڈنر سوٹ میں تھا یا ملازموں کے لباس میں۔  
وہ بھی اندھیرے میں آپ سے ٹکرایا ہو گا۔ کیا آپ کو اتنا موقع ملا تھا کہ آپ اسے چھو کر  
محسوس کر سکیں؟

”ہاں۔ آپ بہت ذہین آفیسر ہیں۔ واقعی میں نے اسے چھو لیا تھا اور یہ یقین سے  
کہتی ہوں کہ وہ ڈنر سوٹ میں تھا۔ اگر کوئی مہمان یا ہیر نہیں گیا ہے تو ابھی وہ ہال میں  
موجود ہو گا لیکن آپ محض ڈنر سوٹ کے ذریعہ اس کے گریبان تک کیسے پہنچیں گے؟“  
صفر علی نے کہا۔ ”ڈنر سوٹ سے اتنا تو ثابت ہو گیا ہے کہ وہ کوئی معزز مہمان  
ہے۔ اب میں آپ سے دوسرا سوال کرتا ہوں۔ نیکلس اتار تے وقت اس کی انگلیاں آپ  
کی گردن یا جسم کے کسی دوسرے حصے سے ضرور مس ہوئی ہوں گی۔ آپ ذرا اچھی طرح  
سوچ کر بتائیں کہ وہ انگلیاں موٹی تھیں یا پتلی، سخت تھیں یا ملائم۔ دیکھئے، اندھیرے میں  
اور گہرا ہٹ میں اکثر عورتیں ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتی ہیں لیکن آپ جیسی کنواری  
یونیورسٹیاں اس عمر میں بڑی حساس ہوتی ہیں اور کسی مرد کے ہاتھوں کے لمس کو بڑی  
نجیدگی سے محسوس کرتی ہیں۔ میرے اس سوال میں ذرا بے تکلفی ہے لیکن میں مجبور ہو  
کر پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ ان اجنبی انگلیوں کو اب بھی محسوس کر سکتی ہیں؟“

شنراوی شامیہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ واقعی طور پر زبان چپ ہو گئی اور تصور  
کے درمیان کھل گئے۔ وہ سخت فولادی انگلیاں اس کی گردن پر صرصرانے لگیں۔ بوسے  
کے دوران ان انگلیوں نے گردن پر پھیلے ہوئے بالوں کو سختی سے جکڑ لیا تھا۔ اسے تکلیف  
ہو رہی تھی لیکن ایسی راحت بھی مل رہی تھی کہ اس راحت کے لئے وہ بار بار ان ظالم  
انگلیوں کی تمنا کر سکتی تھی۔

صفر علی ٹوٹتی ہوئی نگاہوں سے شنراوی کے شگفتہ چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس نتیجے  
پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک چور کی انگلیوں کے ذکر سے اس حسینہ کا چہرہ کیوں تڑپتا  
ہوا ہے اور غزالی آنکھیں یوں لگ رہی ہیں جیسے خواب میں کھو گئی ہوں۔

آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نو لکھا ہار سینے کے اجماروں تک پھیلا ہوا تھا۔ چور کی  
انگلیاں یقیناً خشب و غراز میں بھٹک گئی ہوں گی اور شنراوی جذباتی انداز میں ابھی تک ان  
انگلیوں کو محسوس کر رہی ہے۔ صفر نے کسی حد تک اس کی کمزوریوں کو بھانپتے ہوئے  
نہایت دلی سوال کیا۔ ”کیا آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گی وہ انگلیاں کیسی

تھیں؟

”دو ایک مرد کی انگلیاں تھیں۔ سخت، کھردری۔ ایک چور کی بے رحم انگلیاں۔ ایک محبوب کی طرح مہربان انگلیاں۔۔۔۔۔۔“ وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی بیڑائی رہی۔ ایک بیک اس نے چوک کر پوچھا۔ ”آں۔۔۔۔۔۔ میں نے ابھی کیا کہا ہے؟“

صنذر نے مسکرا کر کہا: ”جس انداز میں آپ نے انگلیوں کی خوبیاں بیان کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں بہت دیر تک پوری توجہ اور دلچسپی سے ملاحظہ کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ مجھے آپ سے کتنا تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ میں یہاں سے ہل جا کر اب صرف ان مہمانوں کو شناختی پریڈ میں رکھوں گا جن کی انگلیاں مضبوط، غٹے کھردری ہوں گی اور جتنے مہمان مردوں کے ہاتھ نلام ہوں گے، میں انہیں ہل رخصت کر دوں گا۔ اس طرح مہمانوں کی بھڑچھٹ جائے گی اور میں رفتہ رفتہ اس مہمان یا چور تک پہنچ جاؤں گا لیکن ابھی چند موالات اور ہیں۔“

”فرمائیے۔ میں بخوشی جواب دوں گی۔“

صنوبر علی نے سوال کیا۔ ”کیا آپ نے تاریکی میں اس کی جسامت کا اندازہ کر لیا؟“  
وہ پھر خیالوں میں کھو گئی۔ خیالوں میں وہی اندھیرا تھا اور وہی بھاری بھر کم اچھی  
وہ اس کی آغوش میں یوں سلائی ہوئی تھی جیسے ہیرے کی کئی انگوٹھی میں سناگئی ہو۔  
تاریکی میں اس نے احساس کی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اجنبی کا سینہ چٹان کی طرح  
’تھا‘ بارود فولادی تھے اور قد اتنا اونچا تھا کہ وہ بوسے کی تکمیل کے لئے آپ ہی آپ  
کے بل اٹھ گئی تھی۔ پھر بھی اس کے قد کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ آخر میں اجنبی نے  
اسے بازوؤں میں اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

صفر علی دوسری بار شہزادی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر تازہ گیا کہ شہزادہ  
بار چوری ہو جانے کے باعث گم صم نہیں ہے بلکہ چور کے رنگین و سگین تصور تھا  
ہوئی ہے۔

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اگر وہ چور گرفتار ہو جائے تو آپ اسے معاف کر دیا سزا دینا پسند کریں گی؟“

شہزادی نے جواب دیا۔ ”اس نے میرا ہار چرایا ہے۔ وہ میرا مجرم ہے۔“

صفر علی نے کہا۔ ”لیکن وہ ہمارے ملک کا مجرم ہے۔ ہمارے ملک میں اس نے جرم کیا ہے۔ اسے سزا بھی یہاں کی عدالت سے ملے گی۔ چونکہ اس کے اس جرم سے اسے ملک کی بدنامی ہوگی اور خارجہ پالیسی پر حرف آئے گا، اس لئے اسے سخت سے سزا دی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے سات سال قید بامشقت ہوگی۔ اس کے علاوہ بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔“

اس نے پریشن ہو کر پوچھا۔ ”کیا اس کی زندگی کے سات سال یونہی ضائع ہو جائیں گے؟“ پھر وہ خود ہی جواب سوچنے لگی کہ نہیں۔ اس نوجوان کی زندگی کے سات سال، سات موسماں اور سات ہزار سال میری زلفوں کے سائے میں گزرنے چاہئیں۔ اسے قید بامشقت نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کی آغوش میں قید بامحبت کی سزا پاؤں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ اسے سزا دی جائے۔ یہ معاملہ ہمیں نم کر دیجئے۔“

صفر علی نے جواب دیا۔ ”معاملہ ختم کرنا یا کسی کے جرم کو چھپانا بھی ایک جرم ہے۔“

شہزادی نے کہا۔ ”اگر ایک جرم کو چھپا کر آپ اپنے ملک کو بدنامی سے بچا سکتے ہیں تو اسے ضرور چھپانا چاہئے“ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہمارے سفارت خانے میں یہ معاملہ ختم کر دیا جائے گا، بات آگے نہیں بڑھے گی۔ ہمارے اخبارات نیکلس کی چوری کی خبریں شائع نہیں کریں گے۔“

صفر علی موج میں گم ہو گیا۔ اب مصلحت یہی تھی کہ وہ اپنے ملک کو بدنامی سے بچالے۔ شہزادی عذبت کی رد میں نو لکھا ہار کی چوری کو نظر انداز کر رہی تھی۔ صفر نے اس کے مشورے کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ملک کی خاطر آپ کے اس مشورے کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کچھ ذاتی قسم کی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس گفتگو کا تعلق اس چور سے بھی ہے۔“

شہزادی نے اثبات میں سر ہلا کر اپنے سفارت خانے کے دونوں افسروں سے کہا کہ وہ بدروم سے جائیں اور اپنے سفارت خانے سے نیکلس چوری کی خبر شائع نہ کریں اور اس کے آئندہ احکامات کا انتظار کریں۔

دونوں آفیسر اس کے حکم کے مطابق وہاں سے چلے گئے۔ شہزادی نے صفر سے

پوچھا۔ ”ہاں۔ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس چور کو سزا سے کیوں بچا رہی ہیں۔ درست ہے کہ آپ کی نظروں میں نو دس لاکھ روپے کے ہار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ نو لکھا ہار کو یوں بھول گئی ہیں جیسے دو چار پیسے گم ہو گئے ہوں لیکن اس چور کو سزا کر کے آپ کو کیا حاصل ہو گا جبکہ آپ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ ایک اندازہ یہ بچان ہے جو اجالے میں گم ہو جاتی ہے۔ آپ اس پر مہربان ہونے کے بارے میں اسے اس میں نہیں بچان سکتیں، کیا آپ بچان سکتی ہیں؟“

”نہیں۔ آپ درست کہتے ہیں۔ میں اسے روشنی میں نہیں بچان سکتی۔“

”کیا آپ نہیں چاہتیں کہ وہ روشنی میں آپ کے سامنے آ جائے؟“

”ہاں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے سامنے آ جائے لیکن قانون کے ماتھے آئے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ وہ دونوں کے سامنے آئے مگر آپ کی خاطر اسے سزا ملے۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ شہزادی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”اگر آپ نے اسے ہرا

بچا لیا اور میرے سامنے لے آئے تو میں آپ کو منہ مانگا انعام دے سکتی ہوں۔“

”میں انعام نہیں چاہتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ ہار ایک مجرم کے پاس نہ

آپ کو واپس مل جائے اور آپ اسے پہن کر اپنے ملک واپس چلی جائیں۔ ہم انعام والے ہر حال میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔“

”آپ ایک فرض شناس آفیسر ہیں لیکن اس چور کا کیا بنے گا؟“

صنوبر نے جواب دیا۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ ہم اس کے پاس سے ہار برآمد

کئے، لیکن ہار کی چوری کا ذکر کسی کی زبان پر نہیں آئے گا۔ اس چور پر کوئی دوسرا

عائد کر کے اسے ملک بدر کرایا جاسکتا ہے۔ آپ چاہیں گی تو اسے آپ کے ملک کی شہر

حاصل ہو جائے گی۔“

”یہ اچھا آئیڈیا ہے، اگر وہ اس ملک سے نکالا گیا تو میں اسے اپنے ہاں لے

گی۔“

”اچھا تو پھر اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کیجئے۔ یہ بتائیے

اندھیرے میں کتنی دیر تک آپ کے قریب رہا تھا؟“



اس نے جواب دیا۔ ”اس وقت مجھے دقت کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑے رہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ازل سے اس کی آغوش میں تھی اور اب تک رہوں گی، لیکن جب وہ چلا گیا تو یوں لگا جیسے وہ ایک چٹکی دقت لے کر آیا تھا اور اب تک جھپٹے ہی واپس چلا گیا لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ وہ کتنی دیر تک میرے قریب رہا۔“

”ہاں یہ جانتی ہوں کہ وہ آپ جیسا قد آور تھا، لیکن آپ جیسا دبلا پتلا نہیں تھا۔ اس کا سینہ بٹن کی طرح چوڑا تھا اور بازو فولاد کی طرح سخت تھے۔ اگر ایک بار اندھیرا ہو جائے، اگر ایک بار وہ اندھیرے میں آجائے تو میں اسے پہچان لوں گی۔“

”آپ کیسے پہچان لیں گی؟“

وہ اس سوال کا جواب کسی سرو کو نہیں دے سکتی تھی، یہ نہیں جانتی تھی کہ عورت اندھیرے میں سرو کو اس کے چہرے سے نہیں بلکہ اس کے جذبات سے اسے پہچانتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ”اندھیرے میں آنکھیں میں دیکھتیں مگر دماغ دیکھتا اور سمجھتا رہتا ہے اور تاریکی میں عورتوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی، بس میں اسے پہچان لوں گی۔“

”اچھی بات ہے۔ اگر آپ اسے پہچان لیں گی تو پھر میں ایک کام کرتا ہوں۔ میں سال بال میں جا کر صرف ان مہمانوں کو شناختی پریڈ کے لئے روکتا ہوں جو قد آور ہیں، سینہ بٹن کی طرح چوڑا ہے، بازو فولاد ہیں اور انگلیاں سوئی، مضبوط اور کھردری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے مہمان تعداد میں دو چار ہی ہوں گے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک وقت میں ایک مہمان کو اس بیڈروم میں بھیجوں گا۔ آپ یہاں کی تمام لائسنس بھجادیں، تاریکی میں خوف محسوس ہو تو ایک زیر و پاؤں کا بلب روشن کر لیں پھر اس نیم تاریکی میں اس آنے والے شخص کو پہچاننے کی کوشش کریں، کیا آپ اس طرح اسے شناخت کر لیں گی؟“

”بال۔ یہ اچھی تدبیر ہے۔“ وہ راضی ہو گئی۔ صفدر علی بیڈروم سے باہر چلا گیا۔ شہزادی شامینہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تمام بتیاں بھجادیں اور ایک زیر و پاؤں کا بلب روشن کر کے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی۔ نیم تاریکی میں پھر وہی اجنبی اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ وہ غامض نہیں ہوئی ایک بو سے کی سفائی کو اور حانسون کی آنچ کو اپنے لبوں اور چہرے پر محسوس کرتی رہی۔ آدھ گھنٹے کے بعد صفدر نے آکر کہا۔ ”صرف تین ہی مہمان ایسے ہیں

جو آپ کے بیان کے مطابق قد آور ہیں، سینہ چٹان ہے، بازو فولاد کے ہیں اور موٹی، مضبوط، سخت کھردری ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پہلے ایک مسمان کو یہاں بھیج دیجئے۔ شہزادی نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ صفدر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد فیکہ نے صحت مند نوجوان دستک دے کر بیدروم میں آیا۔ شہزادی اپنی جگہ سے اٹھ کر کون گئی۔ نوجوان نے کہا۔ ”مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کی خواب گاہ میں حاضر ہوں۔ آپ مجرم کو پہچانا جاتی ہیں۔ یہ بڑی بد نصیبی ہے کہ مجھ جیسا رئیس اعظم بھی ایک ایسے طرح حاضر ہو رہا ہے۔ نوکھا ہار کی اہمیت ہی کیا ہے، میں ابھی کھڑے کھڑے اس روپے کا چیک لکھ سکتا ہوں۔“

شہزادی نے کہا۔ ”آپ میں لاکھ بھی ادا کر سکتے ہیں لیکن اس ہار کی اہمیت یہ کہ اس کے ہیرے نایاب ہیں۔ آپ لاکھوں ڈالر دے کر بھی وہ ہیرے کہیں سے نہیں سکتے، ہر حال میں نے یہاں آپ کو صرف پہچاننے کے لئے طلب کیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اس کے بالکل قریب آگئی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیئے جیسے اس کے گلے میں بانٹیں ڈالنا چاہتی ہو۔ نوجوان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ شہزادی اس طرح اچانک بے تکلفی سے اس کے گلے کا ہار بن جائے گی۔ وہ چند تک حیرت زدہ رہا پھر مادے خوشی کے اس کی بیٹی لکل آئی۔ یہ بڑے فخر کی بات تھی، ایک شہزادی اس پر مر مٹی تھی، اس نے فوراً ہی اسے اپنے فولادی بازوؤں کے حصار لے لیا اور اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے لگا۔

شہزادی اچانک ہی برپ کر اس کی آغوش سے لکل گئی۔ پھر ڈانٹ کر بولی۔ ”بیہوشی ہے، چلے جاؤ یہاں سے، گیٹ آؤٹ.....“

نوجوان بوہلا کر اس کا منہ تکتے لگا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی صاحبہ پہل آپ کی تھی، لیکن دوسری بار اس کے منہ سے ”گیٹ آؤٹ“ کے الفاظ سنے تو وہاں فحش جرات نہ ہو سکی۔ وہ حمزہ سے چلتا ہوا بیدروم سے باہر چلا گیا۔

اے بعد بد اور مسمان یکے بعد دیگرے آئے۔ شہزادی نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ کسی کے بھی پیار میں اسے اجنبی کے پیار کی جھلک نظر نہیں آئی، اور اجنبی کے درمیان یہ فرق تھا کہ ان تینوں نے شہزادی کو بڑے احترام سے آغوش سمیٹ کر پیار کیا تھا لیکن اجنبی نے اسے ایک عام سی لڑکی سمجھ کر بھیج لیا تھا۔

شادی سمجھ کر تو سب ہی پیار کی بھیک مانگتے تھے، مگر پیار چھین لینے والا وہی ایک چور تھا۔  
 صفر علی کو شہزادی کی مایوسی کا علم ہوا تو اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ان مہمانوں میں  
 وہی چور نہیں ہے۔ چور باہر سے آیا تھا، اندھیرے میں آیا تھا اور اندھیرے میں کام بنا کر

ایسے وقت صفر کے ذہن میں سب سے پہلے شاکر جمالی کا نام آیا کیونکہ وہ بھی  
 اور تھا۔ شہزادی نے اس اجنبی کی جتنی خصوصیات بیان کی تھیں، وہ سب جمالی میں  
 وجہ اہم موجود تھیں۔ پھر یہ کہ پیرے جواہرات کی چوریوں میں ناسا بدنام تھا۔

صفر نے فوراً ہی فون کا ریسیور اٹھا کر مالی پور کے تھانے سے رابطہ قائم کیا۔ شاکر  
 مالی مالی پور کے علاقہ میں رہتا تھا، اس لئے وہاں کے تھانے والے فوراً اس کی ناکہ بندی  
 کر سکتے تھے۔ تھانیدار سے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا: ”میں صفر علی بول رہا  
 رہا۔ آپ فوراً شاکر جمالی کو تلاش کریں، وہ جہاں بھی ہو اسے حراست میں لے کر مجھے  
 لائے دیں۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

دوسری طرف سے تھانیدار نے کہا: ”آپ یہاں تھانے تشریف لے آئیں۔ شاکر  
 مالی شام چھ بجے سے حوالات میں بند ہے۔“

صفر یہ سن کر مایوس ہو گیا کہ جمالی شام چھ بجے سے حوالات میں ہے۔ اس سے  
 مالک ظاہر تھا کہ اس نے نیپلس نہیں چرایا ہے۔ تھانیدار بتا رہا تھا کہ اسے کس سلسلے میں  
 گرفتار کیا گیا ہے، صفر بے دلی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے چور تک پہنچنے کے  
 لئے کس طرف قدم اٹھانا چاہئے۔

پھر اسے دانیال جوہری کا خیال آیا۔ وہ چوری کا مال خریدنے کے سلسلے میں بدنام تھا۔  
 اس نے تھانیدار سے رابطہ قائم کر کے اس علاقہ کے تھانے سے رابطہ قائم کیا، جہاں  
 دانیال جوہری رہتا تھا۔ اس نے تھانے کے اچارج سے کہا: ”میں صفر علی بول رہا  
 ہوں۔ آپ فوراً دانیال جوہری کو چیک کریں۔ یہ معلوم کریں کہ آج رات ساڑھے آٹھ  
 بجے سے اب تک کون کون اس سے ملنے آیا تھا۔ میں بھی کچھ دیر بعد وہاں پہنچ رہا ہوں۔“  
 یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پلٹ کر شہزادی شاہینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ ایزی  
 چوڑی ٹیگس مائوسی کو ایک تک دیکھ کر جا رہی تھی۔ صفر نے سمجھ لیا کہ وہ خیالوں کے

اندھیرے میں اس چور کے۔ لڑ لگ رہی ہے جو اس کے گلے کا ہار لے گیا۔

☆-----☆-----☆

شبنہ اسپیشل وارڈ کے۔ کمرے میں آرام وہ بستر پر دائیں کروٹ لیٹی ہوئی تھی وہ ہائیں کھینچ کر اس لئے نہایت سکتی تھی کہ وہ دل کی مریضہ تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ڈاکٹر خاور کے اعتبار میں تھیں کیونکہ اس کے سینے میں جو بیمار دل تھا وہاں رفتار بھول گیا تھا۔ ڈاکٹر بیٹری کے ذریعے اس کے دل کی دھڑکنوں کو برقرار رکھا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی ٹائم پیس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رات کے دو بجے ٹائم پیس سے ابھرنے والی ٹک ٹک کی آواز سن کر وہ سوچ رہی تھی کہ ایک گھنٹی کی گزری اس کے دل کی دھڑکنیں بھی انسانی دماغ اور ہاتھوں کی محتاج ہیں، جب تک چلتی رہے گھڑی نہیں چلتی، جب تک بیٹری نہ لگاؤ، اس مریضہ کا دل حرکت نہیں کرے گا۔ اگر کم ایک بیٹری کی قوت کمزور پڑنے لگتی تو ڈاکٹر اس کی جگہ دوسری نئی بیٹری لگا دیتا تھا۔

وہ جست ہی محتاط زندگی گزار رہی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ تیزی سے نہیں چلتی تھی، تیزی سے نہیں بولتی تھی۔ اچھلتا کودتا تو برسوں سے بھول چکی تھی۔ غرضیکہ کوئی ایسا کام نہیں کرتی تھی جس سے بیٹری کو جھٹکا پہنچے، اگر بیٹری لڑ جائے تو دل کی دھڑکنوں کا تسلسل اڑ جائے گا اور پت سے اس کا دم نکل جائے گا اس مصنوعی دل ہر مصنوعی چیز کی روح کمزور تھا۔

اس وقت پانچ عدد ہیرے اس کے تنکے کے لیے چھپے ہوئے تھے۔ وہ بار بار تنکے کے لیے ہاتھ ڈال کر پلاسٹک کے اس کیسپول کو چھو رہی تھی جس میں وہ ٹایاب ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پا کر اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا اور وہ دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ حد سے زیادہ خوشی ملے تب بھی بے تھک دھڑکنے کے باعث دل کی حالت بگڑ جائے گی اور بیٹری کی کارکردگی میں بھی فرق آجائے گا۔

لیکن وہ خوش ہونے پر مجبور تھی۔ سوٹا چاندی، ہیرے، جواہرات ہر عورت کی کمزوری ہوتے ہیں۔ شبنہ کچھ زیادہ ہی ہیروں کی خواہش مند تھی۔ ایسے ہی چمکنے والے پتھروں کے لالچ میں اس نے شاکر جمالی سے دوستی کی تھی پھر چوری کا مال چھپانے کے سلسلے میں اس کی قابل اعتماد دوست، بن گئی تھی لیکن ایسے ہیروے موتی اس کے پاس

نبی رہتے تھے۔ چوری کا کیس ٹھنڈا پڑتے ہی جمالی تمام چوری کا مال اس سے واپس لے کر چلا جاتا تھا اور اس خدمت کے عوض اسے دو چار ہزار روپے دے دیا کرتا تھا۔ لیکن آج شینہ کی نیت بدل گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پانچ عدد ہیرے اگر جمالی واپس نہ کئے جائیں تو وہ کیا بگاڑ لے گا۔ ڈاکٹر خاور اگلے ہفتے اسے سوسٹر لینڈ لے کر بارہا تھا۔ یہ ملک چھوڑتے ہی شا کر جمالی سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا اور تنہا ان ہیروں کی آمد نہ جاتی۔ وہ ہیرے ملک سے باہر لے جانے کے لئے اس نے ڈاکٹر خاور کو اپنا رازدار بنا لیا تھا۔

پہلے تو ڈاکٹر نے سمجھایا تھا کہ اسے اپنے پاس چوری کا مال نہیں رکھنا چاہئے، لیکن اس کے انکار پر وہ رونے لگی۔ اسے روتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کیونکہ حد سے زیادہ رونا ہو تو دل ڈوبنے لگتا ہے اور اس طرح بھی بیٹری کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کے آنسو پونچھے، اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے کہ وہ اس کا ایک ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس کا حاشق بھی تھا۔ اس نے ایک حاشق کی طرح قسم کھائی اور بعد کیا کہ وہ ہر حال میں ان ہیروں کی حفاظت کرے گا اور انہیں چھپا کر اس ملک سے اترنے جائے گا۔

ٹہنہ کی زندگی چند روزہ تھی۔ اگر ایک پل کی بھی زندگی ہوتی تو وہ ان ہیروں کو کیجے سے لگائی اور عرجاتی۔ ڈاکٹر اس کی زندگی کو طویل تر کرنے میں مصروف تھا۔ وہ اس لئے ان ہیروں کا لالچ کر رہی تھی کہ ڈاکٹر اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اسے زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ہیروں کی خواہش اس کی آخری خواہش ہو، اسی لئے ڈاکٹر نے اسے خوش رکھنے کے لئے یہ بات بھی مان لی تھی جو سراسر خلاف قانون تھی۔

وہ ٹکٹ کے نیچے سے کیپول نکال کر دیکھنے لگی۔ وہ ایک بار کیپول کھول کر پانچ عدد ہیرے اپنی مٹھی میں لے کر دیکھ چکی تھی۔ وہ ہیرے ساز میں چنے کے دانے کے برابر تھے۔ ان میں ایسی ہلکی ہلکی سی میٹھی میٹھی سی پسک تھی کہ بار بار انہیں دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن ہسپتال میں انہیں بار بار کھولنا حتمی نہ تھا۔ ہیرے کیپول کے باہر ہوں یا اندر نہیں آتی اصل اس کی ملکیت تھی۔ اس لئے وہ کیپول کو مٹھی میں لے لے کر خود کو ٹھیک پتھر رہی تھی۔

دردازے پر آہٹ سن کر اس نے جلدی سے کیپول کو نکلنے کے لئے دیکھا۔ ایک نرس دردازہ کھول کر اندر آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹیلی فون اور دوسرے ہاتھ میں ریسیور تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ڈاکٹر خادر آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون سرہانے کی میز پر رکھ دیا اور ریسیور ٹینے کے ہاتھ دے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ٹینے نے ماکتھ ٹیس پر بڑی محبت سے پکارا۔ ”ہیلو! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔“

”ہاں باگ رہا ہوں اور تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ میں نے نرس سے کہہ دیا تھا۔ تمہیں نیند سے بیدار نہ کرے، کیا تم سو رہی تھیں؟“

”نہیں۔ میں بھی جاگ رہی تھی اور آپ کو یاد کر رہی تھی۔“

”پھر تو میں خوش نصیب ہوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ، وہ ہیرے مل گئے؟“

”ہاں۔ ابھی جمالی کا ایک آدمی یہاں پہنچا کر گیا ہے۔ میں نے کہا تھا ماکہ ہلاک دھن کا پکا ہے۔ وہ شراہی کے بار سے ان ہیروں کو اڑا لائے۔ گل اس وقت وہ سرہانے رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ اتنے خوبصورت ہیں کہ ان پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کشم دالوں سے انہیں چھپا کر ملک سے باہر لے جائیں گے۔ آپ اچھا وعدہ پورا کریں گے نا؟“

”ہاں، میں تمہاری خاطر یہ وعدہ منور پورا کروں گا۔ ہم اگلے ہفتے سوئٹزرا جائیں گے۔ میں نے ابھی فیصلہ کیا ہے کہ کل صبح تمہاری بیٹری چھین کر دی جائے گا۔ طویل سفر کے لئے مکمل طور سے صحت یاب رہو۔ ابھی میرا مشورہ ہے کہ تم اطمینان سو جاؤ۔ میں نے نرس سے کہہ دیا ہے کہ وہ انجکشن لگائے گی تو تمہیں نیند آ جائے گی۔“

”خادر! مجھے نیند تو آ جائے گی مگر ڈرتی ہوں کہ یہ ہیرے کہاں پھپھکائیں۔ کوئی لے گیا تو میرا دم نکل جائے گا۔“

”مرنے کی باتیں نہ کرو، ہمیشہ زندہ رہنے کی لگن میں رہو۔ کیا وہ ہیرے کماؤ میں ہیں؟“

”نہیں۔ ایک پلاسٹک کے کیپول میں ہیں۔“

”کیپول کا ساز کیا ہوگا؟“

”یہ لمبائی تقریباً سوا یا ڈیڑھ انچ ہے۔“

”ٹھیک ہے، بہت ہی ننھا سا کیپول ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی چیریں تو عورتیں اپنی  
 دل میں چھپاتی ہیں۔“  
 شینہ ہنسنے لگی۔ ”آپ ایسی باتیں نہ کریں، مجھے شرم آتی ہے۔ دیسے میں جولی کے  
 ور نہیں رکھوں گی۔ اگر نرس دوا پلانے آئے گی تو اسے وہ کیپول نظر آ جائے گا۔ اچھا  
 آپ مشورہ نہ دیں، میں اسے ایک جگہ چھپالوں گی۔“  
 ”ایسی اور کون سی جگہ ہے جہاں ڈیڑھ انچ کا کیپول چھپایا جاسکتا ہے؟“  
 ”ایسی ایک جگہ ہے، آپ نہ پوچھیں۔“  
 ”بھئی بتا دو، ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔“  
 ”تو یہ ہے، آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ بھئی اور کہاں چھپاؤں گی، شلووار کے نیچے  
 رکھوں گی۔ صبح آکر آپ لے لیجئے گا۔“  
 ”ہائے۔ جانے صبح کب ہوگی، اب میں ای انتظار میں سو رہا ہوں۔ تم بھی سو باؤ،“  
 ”حافظ!“  
 فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شینہ نے ریسیور رکھ کر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور مٹھی  
 کیپول کو لے کر شلووار کا ازار بند کھولنے لگی۔

☆=====☆=====☆

صبح ہوتے ہی صفدر علی کو جمائیاں آتے لگیں۔ وہ اپنے دفتر میں تمام رات بچھا تھا اور فون پر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا رہا تھا کہ انہیں شہر کے کتنے چوروں کا ہمارا چاہئے۔ اس کے ایک ماتحت نے رات کے گیارہ بجے دانیال جوہری کا مخابرہ کیا تھا۔ اس کی کوششی کے احاطے میں اس نے وہ کار بھی دیکھی جس میں شاکر جمالی بیٹھ کر سلیمان سے مالی پور تھانے تک گیا تھا۔ پھر اس کا ایک ساتھی راجر اس کار کو قتلے دانیال جوہری کی رہائش گاہ تک لے آیا تھا۔

صفدر کا ماتحت یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کار کہاں کہاں استعمال کی گئی ہے لیکن اس دانیال کے ڈرائنگ روم میں راجر کو دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ شاکر جمالی کا دوست رہا ہے۔ بڑی بڑی چوریوں کے کیسز میں جمالی کے ساتھ جو لوگ ملوث ہوئے تھے ان راجر اور جولی خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ کئی بار ضمنی طور پر شینہ کا نام بھی آیا تھا۔ ثابت نہ ہو سکا کہ ایک دل کی مریضہ جمالی کا ساتھ دیا کرتی ہے۔ پھر وہ بہت بڑے سرمن ڈاکٹر خاور کے زیر علاج آگئی اور رفتہ رفتہ اس کی محبوبہ بن گئی۔ اس کے بعد کی مہنگیتر بن گئی تو سوسائٹی میں اس کی عزت ہونے لگی اور قانون کے محافظ بھی اس مطمئن ہو گئے۔

بہر حال رات کے سوا گیارہ بجے صفدر نے اپنے ماتحت کا فون ریسیو کیا اور اس بھید کھلا کہ شاکر جمالی تو حالات میں ہے لیکن اس کا ساتھی دانیال کے پاس گیا ہوا ہے تو صفدر نے جمالی کے تمام ساتھیوں کے پیچھے خفیہ پولیس کے آدمی لگا دیئے۔ اس کا دانیال کی کوششی سے واپس چلا گیا تھا۔ راجر نے سمجھا کہ اس پر شبہ نہیں کیا گیا۔ لے وہ پانچ عدد ہیرے کیپول میں رکھ کر ہسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے سے وہ ہار بھی لے لیا تھا جن سے وہ ہیرے نکال کر کیپول میں رکھے گئے تھے۔ سے خالی ہونے کے باوجود اب بھی اس ہار کی قیمت تقریباً تیس ہزار سے زیادہ ہو سکتی



یونکہ سونے کے اس ہار میں جگہ جگہ سچے موتی جڑے ہوئے تھے۔ راجر نے سوچا کہ بڑے ٹینے کے حوالے کرنے کے بعد وہ اپنے کانچ میں جائے گا اور اپنی بیوی جولی کو وہ اپنی ہار خفے کے طور پر پیش کرے گا۔

”اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا“ اسے شبہ تک نہ ہو سکا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے ٹینے سے ملاقات کی، جمالی کا پیغام پہنچایا اور کیڈپول اس کے والے کر کے ہسپتال سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے ہولے ہولے سٹی بجاتے ہوئے اردن طرف دیکھا۔ ہسپتال کے کمپائونڈ میں ایک ایسپرینس اور ایک جیب کھڑی ہوئی تھی۔ ”دونوں گاڑیاں خالی تھیں۔ لہذا وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ پولیس والوں کی جیب ہے۔ وہ لمبیان سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا ہسپتال کے کمپائونڈ سے باہر آیا اور اپنے کانچ کی طرف جانے لگا۔“

کانچ شہر کے آخری سرے پر تھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ یک جیب مسلسل اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ فوراً ہی کار کی رفتار بڑھا کر راستے بدلنے لگا کہ تعاقب کرنے والوں کو ڈانچ دے سکے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگلی رات تھی، تمام راستے روشن تھے۔ بار بار فریب کھانے کے بعد بھی جیب اسی راستے پر چلی آتی تھی جس راستے سے گزر کر اسے کانچ تک پہنچنا تھا۔ اس تعاقب سے ناگزیر سمجھ گیا کہ وہ پولیس والے ہیں اور شاگرد جمالی کے تمام ساتھیوں کے نام پتے اور مکانے جانتے ہیں۔

اب ان سے بچنے کی یہی صورت نظر آئی کہ کار میں رکھا ہوا ہار چلتی کار سے کہیں جھٹک دے تاکہ اس پر اتنی بڑی چوری کا الزام حائد نہ ہو لیکن وہ ہار ہیروں سے خالی ہونے کے باوجود بہت قیمتی تھا۔ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہ ہار پولیس والے کب سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسے ہسپتال کے نور بھی جاتے دیکھا ہو گا، تب اسے ہسپتال کے کمپائونڈ میں کھڑی ہوئی جیب یاد آ گئی۔ یہ اتنی اس کی سمجھ میں آ گئی کہ پولیس والوں نے دور تک بال پھیلا رکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ جولی تک بھی پہنچ گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ جیب بھی جیڑی سے آ رہی تھی لیکن کار کی رفتار کا پیچھا نہیں کر سکتی تھی، اس لئے پیچھے رہ جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ کانچ

قریب آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے کار کا بارن بجلیا تاکہ جولی سوری ہو تو اندر دروازہ کھول دے۔

اکثر عورتیں گہری نیند میں بھی اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ سن لیتی ہیں۔ طرح جولی نے بھی راجر کی گاڑی کے بارن کو سن لیا۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر کھڑکی پر وہ راستہ سیدھا کھڑکی کی طرف آتا تھا، پھر دروازے کی طرف مڑ جاتا تھا۔ اس نے پورے میں راجر کی گاڑی پہچان لی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

راجر کی کار دروازے کے سامنے آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس نے گاڑی اترتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”جولی! گن نکالو۔ پولیس والوں سے مقابلہ ہے۔“

جولی دروازے سے بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ راجر کار سے اتر کر دوڑتا ہوا آیا اور دروازے کو اندر سے بند کرنے لگا۔ لکڑیوں سے بنا ہوا وہ پرانا کالج تھا۔ زور سے بند کرنے یا کھولنے سے کڑی کی دیواریں لرزنے لگتی تھیں۔ جولی فوراً ہی اسٹین گن لے آئی۔ راجر نے ایک گن اپنے ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں پر جا رہا ہوں۔ تم یہاں کھڑکی پر مورچہ سنبھالو۔“

”آخر ہم پولیس کی نظروں میں کیسے آ گئے؟“

راجر نے پچھلے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بعد میں بتاؤ۔ فی الحال اتنا سمجھ لو کہ شہزادی شاہینہ کا نوکھار اس وقت میری جیب میں ہے۔“ مارے خوشی کے جولی کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ راجر کی آواز دور دوری جاری تھی۔ ”جولی! ہماری سلاحتی ای میں ہے کہ یہ پولیس کے دو چار آدمی سچ کر نہ جانے بائیں۔ یہ سچ گئے تو اپنے افسروں کے پاس پہنچ کر ہماری نشاندہی کریں گے۔“

یہ کہنے کے دوران وہ چھت پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک سے جنت دیواریں یوں کراہتی ہوئی بل رہی تھیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ جولی مورچہ سنبھال کر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت دور سے کسی گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نظریں دور راستے کے موڑ پر جم گئیں۔ جیب اپنی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ پولیس راجر کے ٹھکانے سے واقف تھے، اس لئے اطمینان سے پہلے آ رہے تھے۔

پھر وہ جیب عین کھڑکی کے سامنے پچاس گز کی دوری پر نظر آ گئی۔ اسے پہچان جولی نے فائرنگ شروع کر دی۔ جیب والے بھی محتاط تھے۔ وہ جب جیب کے

جھانک لگا کر راستے کے کنارے جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے۔ ایسی صورت میں گاڑی کو رک جتا چاہئے تھا لیکن وہ آپ ہی آپ کالچ کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ جولی نے بوکھلا کر فائرنگ کی تاکہ گاڑی رک جائے۔ مگر کالچ نشیب میں تھا اور گاڑی راستے کی اونچائی سے نشیب کی طرف تیزی سے آ رہی تھی اور اسے روکنے کے لئے آگے بڑھنے کی ضرورت تھی لیکن وہ اور راجر آگے بڑھ کر پولیس والوں کی فائرنگ کی زد میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ راجر نے چھت پر سے چیخ کر کہا۔ ”جولی! بچھلے دروازے سے فوراً نکل جاؤ۔ گاڑی کالچ سے ٹکرانے والی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ خود وہاں سے پلٹ کر بھاگنے لگا۔ اسی وقت ایک گولی اس کی پشت پر آ کر لگی اور وہ لوکھڑا کر چھت پر گر پڑا۔ جولی کھڑکی سے پلٹ کر بھاگ رہی تھی۔ راجر کی چیخ سن کر ٹھٹھک گئی اور سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھنے لگی۔ اوپر سے اس کے گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔ وہ راجر کا نام لے کر چیختی ہوئی آگے بڑھی تو بدحواسی میں ایک کرسی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی وقت جیب ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دیوار سے لکڑا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے زلزلہ سا آگیا۔ جس دیوار سے جیب کرائی تھی وہ دیوار جولی کی طرف تیزی سے جھٹکتی چلی گئی۔ چھت چڑچڑاہٹ کی آواز کے ساتھ جھٹکے لگی۔ باہر جھاڑیوں کے پیچھے سے فائرنگ کرنے والوں کو جولی کی دلخراش چیخ سنائی دلا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے کالچ کی طرف جانے لگے۔ اس وقت تک چھت اور دیواریں زخمیں بوس ہو گئی تھیں۔ دیمک خوردہ لکڑیوں کا وہ کالچ جولی کا تابوت بن گیا تھا۔ اب اس کے اندر سے اس کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ پولیس کے دو جوان راجر کو چھت پر سے کھینچ کر سڑک پر لے آئے۔ وہ پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔ انہوں نے تلاشی لینے کے بعد اس کی جیب سے وہ نوکھا ہار نکال لیا جو اب پانچ عدد بیروں سے محروم ہو چکا تھا۔

مظہر علی کو ساڑھے تین بجے اس واقعے کی اطلاع ملی۔ اس نے موقع پر پہنچ کر اس بار کو دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ راجر نے اس کے پانچ عدد بیروں شاید جولی کو رکھنے کے لئے ایسے دیئے۔ اگر وہ جولی کے پاس نہ پائے گئے تو صبح ہونے سے پہلے وہ نیازی ہسپتال کے ایمرل وارڈ کے کمرہ نمبر دو میں جائے گا اور شیشہ کا محاسبہ کرے گا۔

تو شدہ کالچ کی چھت اور دیواریں ہٹا کر جولی کی لاش نکالنے میں کافی وقت صرف

ہو گیا۔ پھر جولی اور اس کے دوسرے سالان کی تلاش لی گئی لیکن وہ ہیرے دستیار ہو سکے۔ صفدر وہاں سے مایوس ہو کر پانچ بجے ہسپتال پہنچا۔ ٹیمینہ کو انجکشن دے کر علیا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس لئے صفدر کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس نے ڈاکٹر خادر کو فون کیا اور اس سے درخواست کی کہ اسے ٹیمینہ سے ملنے کی ضرورت اجازت دی جائے لیکن ڈاکٹر نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

”مسٹر صفدر مجھے افسوس ہے کہ میں اس مریضہ کی نیند خراب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر وہ بیدار ہو جائے تو تب بھی آپ اس سے ملاقات نہ کریں۔ صبح اٹھ کر اس کے سیل بدلے جائیں گے۔ اس کے دل کی حالت بہت تیز ہے۔ اسے نیند نہیں چاہتا کہ سیل بدلنے سے پہلے اسے ذہنی طور پر پریشان کیا جائے یا معمولی سی خفگی کے لئے اسے ڈسٹرب کیا جائے۔“

”یہ معمولی سی تحقیقات نہیں ہے۔ شنزادی شاہینہ کا ایک نہایت ہی قیمتی بارچہ ہے۔ اس سلسلے میں جولی اور راجر نامی دو افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ راجر کی جب سے بار دستیاب ہوا ہے لیکن اس کے ہیرے کمرہ نمبر دو کی مریضہ ٹیمینہ کے پاس ہو سکے۔ کیونکہ راجر رات کے دو بجے اس سے ملنے آیا تھا۔“

”اگر وہ ہیرے کمرہ نمبر دو میں ہیں تو آپ اطمینان رکھیں۔ وہ آپ کو مل جائے گی۔ دیکھئے آپ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں دو افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے بازی سے کام لیا تو تیسری ہلاک ہونے والی ٹیمینہ ہوگی۔ میں بیٹرنی کے ذریعے انسان کو رکھنے کے تجرباتی دور سے گزر رہا ہوں۔ لہذا میں آپ کو اجازت نہیں دوں گا کہ آ میرے تجربے کو ناکام بنائیں۔ اگر شام تک ٹیمینہ مارل سالت میں رہی تو میں سب پہلے آپ کو اس سے ملنے کی اجازت دوں گا۔ دس آں۔“

اتنا کہہ کر دوسری طرف سے ڈاکٹر نے ریسپور بکھ دیا۔ صفدر سر تھام کر سوچنے لگا کہ اسے کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر طبی نقطہ نظر سے درست کہہ رہا تھا۔ وہ ٹیمینہ سے اس وقت تک نہیں مل سکتا تھا جب تک کہ ڈاکٹر اس سے ملاقات کو ضروری نہ سمجھتا۔ تاہم نظر میں ایک شنزادی کے ہیرے اہم تھے لیکن ڈاکٹر کے لئے ایک عام سی عورت کی اہمیت نہیں تھی۔ ڈاکٹروں کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ پہلے وہ مریض کی زندگی بچائیں۔ وہاں سے مایوس ہو کر اپنے دفتر واپس آ گیا لیکن ہسپتال میں اپنے خاص آدمیوں کو ڈاکٹر

نہ اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کمرہ نمبر دو سے آپریشن تھینر تک ہر شخص پر کڑی رہے گی۔ ڈاکٹر اور نرس کے سوا کوئی رشتہ دار، دوست یا اجنبی ٹیمینہ سے ملاقات نہ کرے۔ کمرہ نمبر دو سے کوئی بھی چیز باہر لے جائی جائے تو اسے اچھی طرح چیک کریں۔

ڈاکٹر خادہ کی خواہش کے مطابق ٹیمینہ کو ڈسٹرب کئے بغیر ایسی پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ وہ پانچ عدد میرے کہیں ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتے تھے۔

صدر نے اس پہلو سے بھی غور کیا تھا کہ ڈاکٹر خادہ ٹیمینہ کا صرف معالج نہیں ہے۔ ناش بھی ہے۔ وہ ٹیمینہ کی دلجوئی کے لئے ان ہیروئن کو چھپا کر لے جاسکتا تھا یا کسی کو یا کسی دارو بوائے کو اس کام کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر خادہ غیر معمولی رت کا حامل تھا۔ اعلیٰ حکام تک اس کی رسائی تھی۔ صدر علی کو اتنے اختیارات حاصل ہیں تھے کہ وہ ڈاکٹر خادہ کی تلاشی لے سکتا لہذا وہ اس کا ردائی کے لئے ریپور اٹھا کر اپنے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرنے لگا۔

☆-----☆-----☆

شاہر جمالی حوالات میں تمام رات خرابے لیتا رہا۔ صبح سات بجے آہنی دروازہ کھلنے لگا آواز سن کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ تھانیدار نے اسے کچھ سوچیں کا سگریٹ پیش کیا اور اس سے کہا۔ ”میں نے رپورٹ مکمل کر لی ہے۔ رپورٹ کے مطابق تمہارے مکان سے چرس برآمد نہ ہو سکی۔ تم صرف چرس کا ایک ٹریٹ پیسے کے مجرم ہو لہذا تم سے پچاس روپے جرمانہ لے کر اور تمہیں وارنٹک دے کر صبح سات بجے حوالات سے رخصت کر دیا گیا ہے۔ اس وقت سات بجے ہیں۔ اب تم باہر جاؤ۔“

دو مگرٹ کے کش لیتا ہوا حوالات سے باہر آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حوالات کے باہر اس کے دو ساتھی مارے گئے ہیں اور ٹیمینہ پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس وقت لا سوچ رہا تھا کہ اسے سب سے پہلے کس ساتھی سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔

اس وقت صدر علی ناگمانی مصیبت کی طرح وہاں آ گیا اور اس نے شاہر جمالی کو بکھیر کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہیں وہاں نصیب ہو گئی ہے۔ میں عین وقت پر آ گیا ورنہ اسے ملاقات نہ ہوتی۔“

تھانیدار اسے چرس کے متعلق رپورٹ سنانے لگا۔ صدر علی نے ہاتھ اٹھا کر قطع

کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ جمالی کو کس لئے کر دیا گیا تھا اور اب کس لئے رہا کیا جا رہا ہے۔ میں جمالی سے اپنے طور پر کچھ باتیں کر رہا ہوں۔ کیوں جمالی، میرے ساتھ چلو گے؟“

جمالی نے دونوں شانوں کو اچکا کر کہا۔ ”میں آپ کے ساتھ نہ جانا چاہوں گا۔ آپ مجھے لے جائیں گے کیونکہ قانون آپ کے ساتھ ہے۔ چلئے آپ کہاں سے جا رہے ہیں۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے تھالے سے باہر آ گئے۔ باہر صدر حلی کی کار کھڑی تھی۔ پچھلی سیٹ پر اس کے دو ماتحت بیٹھے ہوئے تھے۔ صدر نے جمالی کو اگلی سیٹ بیٹھنے کے لئے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے دروازے کو بند کر دیا اور جمالی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔ ”جمالی کی تحفہ دکھا دو۔“

پچھلی سیٹ سے ایک ماتحت ہار نکال کر جمالی کی نگاہوں کے سامنے لے آیا۔ وہ دیکھتے ہی جمالی کا رنگ زرد پڑ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر بولا۔ ”یہ کس کی ہے؟ مجھے کیوں دکھایا جا رہا ہے؟“

صدر اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو تاڑ گیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”ہاں تمہارے ایک ساتھی راجر کے پاس تھا۔ اب ہم اس کے پانچ عدد ہیرے شینے سے حاملہ کرنے جا رہے ہیں۔“

صدر کی ان معلومات پر وہ حیران رہ گیا۔ ہار کو دیکھ کر اتنا یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہیرے سے ہیرے بھی حاصل کر لے گا۔ جمالی کو اس بات کا صدمہ تھا کہ تقریباً دس لاکھ روپے مال اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے لیکن وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ قانون کے تحت اس کے ہاتھوں میں ہتھیاریاں نہیں ڈال سکیں گے کیونکہ جس وقت ہار چرایا گیا اس وقت وہ تھانے والوں کی گواہی کے مطابق حوالات میں بند تھا۔ لہذا کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا۔ ہار کی چوری میں شاگرد جمالی کا بھی ہاتھ تھا۔

اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”راجر اور شینہ کا شمار میرے ساتھیوں میں ہوتا ہے اس لئے آپ مجھ سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں لیکن ان باتوں کا کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ اس ہار کی چوری میں شریک نہیں تھا پھر آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

صنذر نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اس کیس کو بنا دو یعنی چوری کا اعتراف کر لو۔“

اس نے مقدمہ لگا کر کہا۔ ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کل تمام رات حوالات ادا اور آپ کہتے ہیں کہ میں خواہ مخواہ اس چوری کا اعتراف کر لوں۔“

”جہاں! تم بڑے شاطر ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھی پکڑے جاتے ہیں تم صاف بچ کر نکل جاتے ہو۔ اس بار بھی تم نے اچھی چال چلی ہے۔ تمہیں حوالات بند نہیں کیا گیا بلکہ تم نے خود کو بند کروا دیا ہے۔ مالی پور کا تھانے دار لالچی ہے۔ قانون و فطرت بن کر وہ تمہارے جیسے چور بد معاشوں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ کل رات تم سب مل کر کیا ڈرامہ کھیلا ہے اس کا ایک ہلکا سا خاکہ میرے دماغ میں ہے۔ محض دے کے لئے تم پر جس پینے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔“

صنذر صاحب! آپ اپنے طور پر جو چاہے سمجھ لیں۔ میں نے تمام رات قانون و فطرت کی گمرانی میں گزار دی ہے۔ تھانے کا ریکارڈ میری بے گناہی ثابت کرتا ہے اس نے آپ مجھے مجرم ثابت کرنے کی فضول سی کوشش نہ کریں۔“

صنذر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ اگر جہاں بھی موج میں گم ہو گیا۔ اس کے ساتھی پولیس والوں کی نظروں میں آپکے تھے۔ مالے وہ اندر ہی اندر مضطرب اور پریشان تھا۔ پچھلی رات وہ ہر فکر سے آزاد تھا۔ اس نے حوالات کی سخت کھردری زمین پر لیٹ کر شزاوی شامینہ کے خواب دیکھے تھے۔ تمام ات اس حبیبہ کے بدن کی نرمی و گرمی کو اپنی خیالی آغوش میں محسوس کرتا رہا تھا۔ اس نے بھول جیسے ملائم ہونٹ ہوسے کی حرارت سے کس طرح اس کے ہونٹوں کے درمیان مل رہے تھے اس کیفیت کو یاد کر کے وہ شزاوی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

حوالات کی وہ رات کتنی رنگینیوں اور خوشبودوں سے بھئی ہوئی تھی اور وہ دوسرا لڑکے کے لئے عذاب بن گیا تھا۔ اسے اپنے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا اور انہیں بچانا اس کا فرض تھا اور اسے اس فرض کی ادائیگی کا کوئی راستہ نظر نہ آ رہا تھا۔

ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر صنذر نے گاڑی روک دی۔ اپنے ماتحتوں سے کہا کہ لہ ہسپتال کے اندر جائیں۔ جب وہ چلے گئے تو اس نے کہا۔ ”جہاں! میں تمہیں ایک مجرم

مجھ کر یہاں نہیں لایا ہوں۔ آج تک یہی ہوتا آیا ہے کہ چوری کے بعد چور کو پکڑا ہے لیکن یقین کرو اس ہار کی چوری میں ہمیں چور کی تلاش نہیں ہے۔ ہمیں یہ ہار مل ہے۔ صرف ہیروں کی تلاش ہے۔ وہ بھی مل جائیں گے تو ہم اس ہار کو مکمل کر کے شہزادی کے حوالے کر دیں گے۔“

”اور چور کو معاف کر دیں گے؟“ جمالی ہنسنے لگا۔ ”صفر صاحب، آپ بچوں کی باتیں کرتے ہیں۔“

”تم کیس کی نوعیت نہیں سمجھ رہے ہو۔ اس لئے یہ ہنگامہ باتیں معلوم ہوتی ہیں دیکھو اگر ہار کی چوری کے متعلق اخبارات میں خبریں شائع ہو جائیں تو ملک کی کئی بات ہوگی۔ جاری دنیا کے اخبارات اس خبر کو اچھالیں گے کہ شہزادی جیسی معزز مسلمان ہمارے ملک میں لوٹ لیا گیا۔“

”ہاں یہ بدنامی کی بات ہے۔“ جمالی نے قائل ہو کر کہا۔

”اسی لئے ہم نے چوری کی اس خبر کو پریس تک جانے سے روک دیا ہے۔ شہزاد شاہینہ بھی ہم سے تعاون کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کا احسان ماننا چاہئے اور احسان مندی طور پر کم از کم یہ تو کوشش کرنی چاہئے کہ ان کا ہار انہیں واپس مل جائے۔ تم لاکھ سہ لکھ لیکن ملک کی عزت اور وقار کے لئے تمہیں بھی یہی کوشش کرنی چاہئے۔ کیا سلسلے میں تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟“

”مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ چوری میرا پیشہ ہے اور حب الوطنی میرا فرض ہے۔ بتائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“

”تم چاہو تو شہینہ سے وہ ہیرے بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہو۔ وہ تمہاری کار ہے۔ تمہارے حکم سے انکار نہیں کرے گی۔“

”اچھی بات ہے۔ وہ ہیرے آپ کو مل جائیں گے لیکن یہ بات اچھی طرح نشین کر لیجئے کہ چوری کا مال برآمد کرنے کے بعد بھی آپ مجھے چور ثابت نہیں کرے گے۔ اگر آپ نے مجھے دھوکہ دیا تو آئندہ کوئی چور یا بد معاش اپنے وطن کی خاطر مجھ سے کبھی تعاون نہیں کرے گا۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا کی چوری میں تمہارا نام تک نہیں آئے دوں گا۔“



وہ دونوں کار سے باہر آ گئے۔ جمالی نے ہسپتال کے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے  
 کہا: ”اس سٹیج میں ٹیمینہ اور راجو کا نام بھی نہیں آنا چاہئے۔“  
 ”ٹیمینہ کا نام نہیں آئے گا۔ راجو کا نام آنے والا ہے۔ اس لئے کہ کل رات وہ اور جولی  
 پولیس سٹاچے میں مارے گئے ہیں۔ ان کے خلاف تو کوئی کیس بنانا ہی پڑے گا۔“  
 جمالی نے اپنے حاتھیوں کی موت کی خبر سن کر سر جھکا لیا۔ صدر اسے بتا رہا تھا کہ  
 راجو نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کی بجائے کس طرح پولیس سے مقابلہ کرنے کی  
 ہمت کی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے کرد نمبرود کے دروازے پر آئے۔ وہاں اس کے  
 من نے بتایا کہ کمرہ خالی ہے اور ٹیمینہ اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے۔  
 صدر اور جمالی کمرے کے اندر آ گئے۔ صدر نے پوچھا: ”کیا وہ میرے کسی چیز میں  
 بک گئے ہیں؟“  
 ”جی ہاں وہ پانچ عدد ہیرے ڈیڑھ انچ کے پلاسٹک کے ایک کیپول میں رکھے گئے  
 ہیں۔“

وہ دونوں کمرے کی ایک ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر اس ڈیڑھ انچ کے کیپول کو تلاش  
 کرنے لگے۔ آخر یاس ہو کر صدر نے کہا: ”کیپول جہاں نہیں ہے۔ وہ ٹیمینہ کے پاس  
 لٹا ہوا ہے۔“  
 ”ہوں۔“ جمالی نے تاکید کی۔ ”وہ اسے اپنے ساتھ آپریشن تھیٹر میں لے گئی ہے۔  
 سے واپس آنے دیجئے۔ میں اس سے وصول کر لوں گا۔“  
 ”کیسے وصول کرو گے؟ جب تک ڈاکٹر اجازت نہیں دے گا، ہم اس کے قریب بھی  
 نہیں جا سکیں گے۔“

”آج یا کل ڈاکٹر ضرور اجازت دے دے گا۔ اگر اس کیپول کو ٹیمینہ نے چھپایا  
 ہوگا تو میں اس سے حاصل کر لوں گا۔ اگر ڈاکٹر کی نیت خراب ہو گئی یا وہ کیپول کسی  
 ”کرسٹ کے ہاتھ لگ گیا تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ڈاکٹر اس کے  
 اسٹینڈائرس وغیرہ اسے آپریشن تھیٹر میں بھی چھپا سکتے ہیں۔“  
 صدر نے کہا: ”میں انہیں اس کا موقع نہیں دوں گا۔ جب ٹیمینہ باہر آئے گی تو  
 تمہارا آپریشن تھیٹر کی بھی تلاشی لوں گا۔ میں نے خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا ہے جس کی  
 اسے میں ڈاکٹر خاور جیسی معزز ہستی کو بھی تلاشی دینے پر مجبور کر سکا ہوں۔“

وہ دونوں کمرے سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی جانب چلے گئے۔ وہاں انہیں ایک نرس تک انتظار کرنا پڑا۔ جب ٹیم نے کو داپس دو نمبر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تو صفدر ہاتھوں نے آپریشن تھیٹر کی تلاشی شروع کر دی۔ اس نے خصوصی اجازت پر ڈاکٹر خاور کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تلاشی دینے سے انکار نہ کرے۔ کئی گھنٹے بعد کے آدمیوں نے پوری توجہ اور تندی سے ہر اس جگہ کی تلاشی لی جہاں ایک کیسپول ہو جاسکتا تھا اور ہر اس شخص کو سر سے پاؤں تک ٹولا جو مشکوک نظر آیا۔ ہسپتال کے ڈسٹ بن میں ڈیڑھ انچ کا کیسپول پایا گیا لیکن وہ خالی تھا۔ اسے دیکھ کر یہ یقین سے کہہ جاسکتا تھا کہ اس میں پانچ عدد ہیرے چھپا کر رکھے گئے تھے۔ شاکر جمال بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ راجر دی کیسپول دانیال جو ہری سے لے کر آیا تھا۔ دانیال کو بار بار پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے نہ تو نو لکھا ہار کو دیکھا ہے نہ اس میں سے ہیرے نکال کر کسی کیسپول میں رکھے ہیں۔ صفدر اور جمالی نے اسے لاکھ یقین دلایا کہ اس خلاف کیس نہیں بنے گا لیکن وہ اپنے بیان پر قائم رہا۔ مختصر یہ کہ تمام ہسپتال کو کال ڈالنے کے باوجود وہ ہیرے نہیں ملے۔ ڈاکٹر خاور کی تلاشی لے کر بھی شرمندہ ہونا پڑا اب صرف ٹیم ہی ایسی تھی جس کے پاس لازمی وہ ہیرے ہو سکتے تھے۔

ٹیم نے اپنے کمرے میں محو خواب تھی۔ وہ خواب میں پانچ عدد ہیرے دیکھ رہی تھی ان ہیروں کی چمک سے اس کا چہرہ بھی جگمگا رہا تھا۔ ڈاکٹر خاور بار بار اس کے کمرے آتا تھا اور گراف کی صورت دل کی حرکات کو نوٹ کرتا رہتا تھا۔ کئی بار ٹیم نے کہا تو اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک سے ڈاکٹر نے بھی یہی محسوس کیا کہ اس چہرے پر ہیرے کی سی آب و تاب ہے اور اس کا دل حیرت انگیز طور پر ایک صحت مند اور نارمل انداز کے دل کی طرح کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کو اتنی جلدی اتنی زیادہ کامیابی توقع نہیں تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”ٹیم! تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور سب سے دولت مند عورت ہوں۔“

”پنے دل کے متعلق کچھ بتاؤ؟“

”میرا دل بالکل صحیح حالت میں وھڑک رہا ہے۔ مجھے کسی طرح کی گھبراہٹ ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ کوئی چور وہ ہیرے نہیں چھپا

پولیس والے ہزار تلاشیوں کے باوجود اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے جہاں وہ نایاب ہیرے محفوظ ہیں۔ اس اطمینان کے بعد نہ کسی طرح کی گھبراہٹ ہوتی ہے نہ پریشانی۔ دیکھئے نا، ہم اپنی پونجی ایسے لاکر میں چھپالیں جہاں تک کسی کا خیال بھی نہ جاسکے تو پھر ہماری طرح مطمئن اور آسودہ اور کون ہو گا۔ اسی لئے میں خود کہ جب سے زیادہ دولت مند سمجھتی ہوں تب تک میرا وجود ان پانچ عدد نایاب ہیروں کی تجوری ہے۔“

ڈاکٹر نے سربلا کر کہا۔ ”واقعی دماغ پر سکون ہو، کسی قسم کی فکر اور پریشانی نہ ہو تو دل باطل حالت میں کام کرتا ہے۔ تمہارا دل بھی میری توقع سے زیادہ اچھی حالت میں ہے۔“

”خاور۔ ابھی میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ہم سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ پر کسٹم دالوں نے ہمیں روک لیا ہے۔ وہ ہمارے ایک ایک سامان کی تلاشی لے رہے ہیں۔ ایک لیڈی انسپکٹر مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئی ہے اور میرا لباس اتار کر ہرے تلاش کر رہی ہے لیکن وہ ہیرے انہیں نہیں ملتے ہیں اور ہمیں سوئٹزر لینڈ جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ نادر یہ کتنا سچا خواب تھا۔ کسٹم والے تو کیا آسمان کے فرشتے بھی ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

ڈاکٹر اس اعتماد سے اسے دیکھنے لگا کہ اس کا تجربہ اب بلاشبہ کامیاب ہو رہا تھا۔ انسان خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ شینہ بھی اپنی خواہش کے تابع فرمان تھی۔ دل اسی خواہش کے مطابق دھڑک رہا تھا۔ اب اس کی دھڑکنوں میں بے اعتدالی نہیں آسکتی تھی۔ بیڑی اپنا کام کر رہی تھی۔ خواہش اپنا رنگ دکھا رہی تھی اور اس کی دونوں آنکھیں ہیرے کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

اس نے پوچھا۔ ”خاور! میں شاکر جمالی اور پولیس دالوں کی پروا نہیں کرتی۔ وہ کبھی ان ہیروں تک نہیں پہنچ سکیں گے لیکن میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔ وہ لوگ خواہ خواہ الٹے سیدھے سوالات کریں گے۔ میری تلاشی کے لئے کسی عورت کو لے کر آئیں گے اور میں وہی طور پر پریشان ہوتی رہوں گی۔“

ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”تم ان کی فکر نہ کرو۔ میں انہیں اتنا سوجھ سمجھ کر دلاؤں گا کہ وہ تم سے ملاقات کریں اور تمہیں پریشان کریں۔ تم بھی کوئی ایسی بات نہ کہو جس کا غلط اثر تمہارے دماغ اور پھر دل پر پڑے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ وہ تمہاری

حلاشی نہ لیں تو پھر اطمینان رکھو۔ میں کسی کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا۔ اہلکار میں چلتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گا۔“

اس نے جھک کر شینہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کمرے سے باہر آگیا۔ باہر سے آدھی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ شینہ کے کمرے میں ڈاکٹر کی کسی کو نہ جھلنے دیں۔ ڈاکٹر بھی شینہ کی حفاظت کرنا خوب جانتا تھا۔ اس نے پہلے دروازے کو لاک کر دیا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کی مریضہ کو پریشان نہ کر سکے۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ رفتہ رفتہ رات کا اندھیرا مسلط ہو رہا تھا۔ صفدر علی کی کار قصر سلیمان کے احاطے میں داخل ہونے لگی تو شاکر جمالی نے پوچھا: آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟“

”یہ وہی جگہ ہے جہاں سے تم نے ہار اڑایا تھا۔ تمہیں تو اب کسی سے نہیں چاہئے کیونکہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ ادھورا ٹیکس شہزادی شاہینہ کو واپس کر دوں۔“

قصر سلیمان کے احاطے میں داخل ہوتے ہی جمالی کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ شاہینہ کا نام سن کر تو دل اور بے چین ہو گیا۔ اندھیرے کی آغوش میں سمٹ آئے۔ پھول بدن کی نزاکت یاد آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کیا شہزادی اسے پہچان لے گی؟

وہ دونوں کار سے اتر کر قصر سلیمان کے برآمدے میں آئے۔ شہزادی کے بیڑے نے صفدر علی کو پہچان کر خوش آمدید کہا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ قہر لگا۔ بعد شہزادی نے صفدر علی کو طلب کیا۔ وہ جمالی کو ڈرائنگ روم میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ تنہائی میں سوچنے لگا کہ صفدر اسے یہاں کیوں لایا ہے؟ کوئی گہری چال تو نہیں ہے؟

”نہیں۔“ اس نے پھر سوچا۔ ”صفدر وعدہ سے نہیں پھر سکتا۔ وہ دھوکہ نہیں گا۔ شاید یہاں شہزادی سے سمجھوتے کے لئے آیا ہے کہ ہار کی چوری کو مسترد کیا جائے۔ صبح صفدر نے بتایا تھا کہ شہزادی نے بھی مکمل تعاون کا وعدہ کیا ہے۔“

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا۔ سیکرٹری نے آکر کہا کہ اسے صفدر نے بلایا ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر سیکرٹری کے ساتھ چلتا ہوا اسی بال میں آگیا جہاں سالگرہ کے مہمان جمع ہوئے تھے اور جہاں بالکونی کے قریب تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس نے شہزادی

دہا تھا اور خود بھی لٹ گیا تھا۔ اس وقت بھی ہال میں نیم تاریکی تھی اور اس آدھی تاریکی اور آدھی میل میلی روشنی میں بالکونی کے قریب وہ نظر آ رہی تھی۔ جمال کے دل کی دھک دھک اور تیز ہو گئی۔ اس نے اس پاس دیکھا۔ اس کے ساتھ آنے والا سیکرٹری نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سدر بھی نہیں تھا۔ سرف وہ تھا اور اندھیرے کی شہزادی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ بھی اس کی طرف آنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھینچے آ رہے تھے۔ بالکل قریب پہنچتے ہی ہال میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اگر روشنی ہوتی تو شاید تکلف ہوتا، اگر ایک دوسرے کی صورت نظر آتی تو جھجک لگتی لیکن وہاں چہرے مٹ گئے تھے۔ ماحول ادب گیا تھا، پتکچاٹ ختم ہو گئی تھی اور اندھیرے کا چور پھر بڈر اور بے باک ہو گیا تھا۔

شہزادی شاہینہ کی آنکھیں اس تاریکی میں نہیں دیکھ سکتی تھیں مگر احساسات بتا رہے تھے کہ وہ قد آور ہے۔ اس لئے وہ بچوں کے بل اٹھ گئی ہے۔ بازو فلواد ہیں اور سینہ چٹان ہے اور اس آغوش میں اس کی سانسیں رکی رکی بار رہی ہیں پھر ہونٹوں کے سنگم پر وہ لہلہ گئی۔ ایک بونے کی تکمیل پر اس نے کہا۔ ”تم دسی ہو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ میں نے صفدر صاحب سے کہا تھا کہ میں تمہیں اندھیرے میں پہچان سکتی ہوں۔“  
نہیں نے آزمائش کے طور پر تمہیں اجنبیوں کو تاریکی میں میرے پاس بھیجا تھا۔ ان کے انہول کے لمس سے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ تینوں وہ نہیں ہیں جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ صرف تم ہو تمہاری آغوش میں آتے ہی میں یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ایک ہار چرانے کے بدلے میرے دل کو چرانے والے وہ اندھیرے کے چور تم ہی ہو۔“

”شہزادی صاحبہ آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ ایک معمولی انسان ہوں اور آپ شہزادی ہر گز مجھ سے دل کی باتیں کرتی ہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، شہزادی کے جیسے میں دل نہیں ہوتا۔ مہب سے تم ہار لے کر گئے ہو تمہاری وابستگی کا انتظار کر رہی ہوں۔ جس کا مال چوری ہوتا ہے اسے اپنے مال کی فکر ہوتی ہے لیکن اب تک میں ہار کے لئے نہیں تمہارے پیار کے لئے سوچ رہی تھی۔“  
بیاتہ صفدر صاحب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ میں تمہیں اتنا چاہتی ہوں اتنا چاہتی ہوں کہ تمہیں دیکھے بغیر تاریکی میں پہچان لیتی ہوں۔ ایسی پہچان اسی کو

ہوتی ہے جو دل سے کسی کو چاہتی ہو۔“

شاگر جمالی نے اسے اپنے بازوؤں میں بلند کر لیا اور اپنے چہرے کے قریب لایا۔  
”آپ بھی نکل سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں لیکن آپ کے بلند مرتبہ کا  
تھا اس لئے زبان چپ تھی۔ میں ایک چور ہو کر آپ کی تمنا نہیں کر سکتا تھا مگر اب وہ  
بڑھا رہی ہیں۔ اس لئے اب میں بھی آپ کی تمنا کرتا ہوں۔“

تاریکی میں کئی چراغ روشن ہو گئے۔ ان جذباتی چراغوں کی روشنی میں  
دوسرے کو دیکھ سکتے تھے لیکن کوئی تیسرا انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ہسپتال سے صدر کے ماتحت کافون آیا۔ اس نے صدر کو  
ڈاکٹر خاور اس سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ڈرا دیر بعد فون کے دوسری طرف  
ڈاکٹر خاور کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مسٹر صدر اگر آپ ٹینے سے ملاقات کرنا  
ہیں تو شاگر جمالی کے ساتھ آجائیے۔“

”اچھی بات ہے۔ میں جمالی کے ساتھ ابھی آتا ہوں۔“

”ایک منٹ۔“ ڈاکٹر خاور کی آواز آئی۔ ”کیا آپ شنراولی شاہینہ کو اپنے پاس  
سکتے ہیں؟“

”شنراولی صاحبہ کو ان ہیروں کی ڈرا بھی پروا نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہسپتال تک  
پہنچ نہیں کریں گی۔“

”کیا فون پر شنراولی سے گفتگو کر دیا سکتے ہیں؟“

”ہولڈ آن کیجئے میں کوشش کرتا ہوں۔“

صدر نے یہ بات سیکرٹری سے کہی۔ سیکرٹری نے شنراولی کے پاس جا کر کہا کہ  
سرجری کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر خاور آپ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں  
شنراولی اتنی بڑی ہستی سے گفتگو کرنے کے لئے بخوشی تیار ہو گئی۔ چند منٹ بعد دونوں  
درمیان رابطہ قائم ہو گیا۔ ڈاکٹر خاور نے کہا۔ ”شنراولی شاہینہ صاحبہ! آپ ہمارے  
میں تشریف لائی ہیں۔ آپ نے یہاں عجائب گھر اور تاریخی عمارتیں دیکھی ہوں گی؟  
آپ نے اس ملک کی ایک ایسی عورت کو نہیں دیکھا جو بیڑی سسٹم کے ذریعے زندہ  
یہ عورت صرے زیر علاج ہے اور ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں ہے۔ کیا آپ اسے  
پہنچ کر سکیں گی؟“

شزاوی نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”آہا! میں اسے ضرور دیکھوں گی۔ میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ میڈیکل سائنس میں اس قسم کے تجربات کے جارہے ہیں۔ یہ میری خوش فہمی ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے ایک ایسی عورت کو دیکھوں گی جس پر یہ تجربہ کیا جا رہا ہے۔ آپ بتائیں مجھے کس وقت ہسپتال آنا چاہئے اور وہ ہسپتال کہاں ہے؟“

”آپ ابھی آ سکتی ہیں۔ مسٹر صفدر اور شاکر جمالی ابھی یہاں آ رہے ہیں۔ کیا آپ ان کے ساتھ تشریف لائیں گی؟“

”جی ہاں۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

فون پر گفتگو ہونے کے ایک گھنٹہ بعد شزاوی ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کے ساتھ کار کی چھیلی سیٹ پر جمالی بیٹھا ہوا تھا۔ صفدر علی اپنی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب وہ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر خاور ان کا منتظر تھا۔ اس نے شزاوی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ فی الحال آپ اسے دور سے دیکھیں۔ پہلے میں آپ لوگوں سے ضروری باتیں کروں گا۔ اس کے بعد آپ مناسب سمجھیں تو اس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے کمرہ نمبر دو کے پاس آئے۔ ڈاکٹر نے ایک کھڑکی کے پاس انہیں کھڑا کر دیا۔ وہاں سے ٹینے کمرے کے اندر نظر آ رہی تھی۔ اس وقت وہ بستر پر لیٹی ہوئی دھچکے سے سوپ پی رہی تھی۔ شزاوی نے دیکھا اس مریضہ کی پشت ننھے سے کوہان کی طرح ابھری ہوئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”کیا یہ عورت کبڑی ہے؟“

”نہیں!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”یہ جسمانی اعتبار سے بے عیب ہے۔ سر سے پاؤں تک اس کے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ یہ بظاہر کبڑی نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی پشت سے پلاسٹک کا ایک کیس منسلک ہے جس میں بیٹریاں نصب ہیں۔ ان بیٹریوں کے ذریعے اس کے دل تک قوت اور حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ آئیے میں آپ کو اس کا ایکسرے دکھاتا ہوں۔“

ادان کے ساتھ اپنے دفتر والے کمرے کی طرف جانے لگا۔ شزاوی بڑی دلچسپی سے اس کی بیٹری کے کنکشن کے متعلق سوالات کر رہی تھی اور ڈاکٹر اسے تمام باتیں تفصیل سے سمجھا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے ایک ایکسرے اٹھا کر دکھایا۔ ”دیکھئے انسان کا دل بائیں طرف ہوتا ہے۔ یہ بائیں طرف کی پشت کا ایکسرے

ہے۔ میں نے اس پر قلم سے یہ چوکور حاشیہ دیا ہے۔ یہ حاشیہ پلاسٹک کا کیس ہے۔ دیکھئے یہ وہ عدد منہی سی بیٹریوں میں اتنی قوت ہے کہ یہ چھ ماہ تک دل کے قلم کو اعتدال پر رکھ سکتی ہیں۔

”اتنی قوت کی بیٹریاں ہونے کے باوجود ان میں ایک چیز کی کمی تھی۔ میں نے ایک ماہ کے دوران ٹینے کے دل کی حرکتوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس مادی تجربے میں وہ حانیت کی اہم ضرورت ہے۔ ٹینے کو جب تک روحانی نوٹی ہم نہیں ہوگی، اس وقت تک تشابہات اسے صحیح حالت میں زندہ نہیں رکھ سکیں گی۔“

”روحانی خوشی سے میری مراد یہ ہے کہ ایسی سرسٹیں جنہیں ہم دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں۔ جو اعلیٰ ظرف کے لوگ ہوتے ہیں، وہ رب العزت کے سامنے سر کر کے یا کسی کے ساتھ نیکی کر کے روحانی خوشی حاصل کرتے ہیں اور جو کم ظرف ہوں، ہیں وہ چوری کا مال حاصل کر کے دل کی گہرائیوں سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

”میں نے ٹینے کو خوشیاں دینے کے لئے اس سے محبت کی اور اس سے ٹلا دعدہ کیا۔ حالانکہ میں بہت مصروف ڈاکٹر ہوں۔ مجھے اتنی فرصت نہیں ہے کہ میں اس سے محبت کروں لیکن میں جس تجربے سے گزر رہا ہوں، اس کے لئے ٹینے کی زندگی اہم ہے۔ اس لئے میں اپنے تجربے کو کامیاب بنانے کے لئے اس سے محبت کا ناک کیا لگا۔

”کچھ عرصہ تک وہ خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی سمجھتی رہا کیونکہ جیسا شہرت یافتہ ڈاکٹر اس سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس میں زندہ رہنے کی لگن پیدا ہو گئی۔ لگن اور خوشی کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ لہذا ٹینے کا دل ایک طرف دماغ سے ہم آہنگ ہو گیا اور دوسری طرف بیٹریوں کی زیر اثر نادر مل حالت میں کام کرنے لگا۔

”اس دوران ٹینے نے بتایا کہ اسے اپنے جسم پر بہرے جو اہرات سجانے کا ہوا ہے۔ اسی لالچ میں وہ شاکر جمالی کی آلہ کار بن گئی۔ ایک روز اس کی زبانی معلوم ہوا کہ جمالی پانچ عدد بہرے بطور امانت اس کے پاس پہنچانے والا ہے۔ میں اگلے ہفتے ٹینے کو تجربات کے لئے سوئٹزر لینڈ لے کر جا رہا ہوں۔ ٹینے بہرے پیچھے پڑ گئی کہ میں وہ کسی طرح چھپا کر ملک سے باہر لے جاؤں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ غیر قانونی کام ہے۔“



رے جیسا معزز ڈاکٹر ایسا کام نہیں کر سکتا۔ ہمیں اپنی عزت اور شہرت عزیز ہوتی ہے۔  
رہا بات سن کر وہ ردنے لگی۔ مر جانے کی دھمکیاں دینے لگی۔ میں یہ کیسے گوارا کر لیتا  
میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں وہ  
رے چھپا کر ملک سے باہر لے جاؤں گا۔

”میرے سامنے بڑی الجھنیں تھیں۔ میں قانون کے خلاف کوئی کام بھی نہیں کرنا  
چاہتا تھا اور شینہ کو اپنے تجربہ سے زندگی بھی دینا چاہتا تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ  
میں نے کو ہر حال میں خوش رکھوں گا کیونکہ میرے تجربہ کی کامیابی سے اس دنیا کے  
لوگوں کو روڈوں انسانوں کو فائدہ پہنچنے والا ہے۔“

اس نے دوسرا ایکسرے اٹھا کر کہا۔ ”یہ دیکھئے۔ آج دوپہر کو شینہ کی پائیس پشت کا  
ایکسرے لیا گیا ہے۔ پلاسٹک کے کیس میں یہ وہ عدد بیٹریاں نظر آ رہی ہیں اور یہ جو  
نچے عدد چھوٹے چھوٹے دھبے نظر آ رہے ہیں۔ یہ وہی پانچ عدد بیہرے ہیں جو شہزادی  
ماہ کے نیکلس سے نکالے گئے ہیں۔“

اس کی بات جتنے ہی سب چوک کر ایکسرے فوٹو کو دیکھنے لگے۔ وہاں پانچ عدد ننھے  
ننھے دھبے ایک دوسرے میں کٹے ہوئے تھے۔

”کیا یہ واقعی میرے نیکلس کے بیہرے ہیں؟“ شہزادی نے حیرانی سے پوچھا۔  
”جی ہاں!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”یہ وہی بیہرے ہیں جن کے لئے کل سے مسٹر  
صفر پریشان ہیں۔“

صفر نے کہا۔ ”ڈاکٹر اگر یہ بیہرے ہیں تو آپ نے انہیں ایک عورت کے اندر چھپا  
کر رکھا ہے۔ آپ چوری کا مال اسمگل کر کے سوئٹزر لینڈ لے جانا چاہتے ہیں۔“  
ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر میں اسمگل کرنا چاہتا تو آپ کے فرشتے بھی کبھی ان  
بھولانے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیا آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بیٹریوں اور تاروں کے  
درمیان کس طرح پانچ عدد بیہرے کے لئے گنجائش نکالی گئی ہے۔ کسٹم کا کوئی بھی چیکر اتنی  
دھتک نہیں سوچ سکتا۔ اگر اسے شبہ ہو بھی جائے تو بھی وہ یہ احمقانہ مطالبہ نہیں کر سکتا  
کہ وہ بیہرے شینہ کے اندر سے نکال کر اسے سوت کے منہ میں پھنپایا جائے۔“

صفر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ یہ جرم ہے۔ آپ شہزادی صاحبہ کی  
ہفاظت کے بغیر ان بیہرے کو اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔“

”مجھے شنزادی صاحبہ سے اجازت لینے کا موقع نہیں ملا۔ ٹھینہ نے مجھے یہ فرمایا کہ وہ ہیرے کہاں سے چرا کر لائے جائیں گے۔ اس نے صرف شاکر بھائی کا نام لیا اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ہیرے کس کی ملکیت ہیں تو میں ان گے مالک سے ضرور انہیں لیتا۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنے نایاب ہیرے یونہی آپ کو دے دیئے جائیں؟“

”ہاں، کوئی اپنی قیمتی چیز یونہی نہیں دے دیتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی جان بچانے کے لئے اس قیمتی شے کو عطیہ کے طور پر دے دیتے ہیں۔ شنزادی صاحبہ کو یہاں تک آنے کی زحمت اسی لئے دی ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے مریضہ کو اور میرے تجربے کو دیکھیں اور وہ پانچ عدد ہیرے اس وقت تک عطیہ کے طور پر دے دیں جب تک ٹھینہ زندہ ہے۔ جب اس کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں گے تو وہ ہیرے شنزادی صاحبہ کی خدمت میں لوٹا دیئے جائیں گے۔“

”میں بخوشی یہ پانچ ہیرے عطیہ کے طور پر دیتی ہوں۔ میرے لئے یہ فرمایا ہوگی کہ آپ کے تجربے کو آگے بڑھانے میں میری دولت کا کچھ حصہ کام آ رہا ہے۔ ہیرے ہمارے ہمارے بن کر رہیں گے تو مھض چکتے ہوئے پتھر کہلائیں گے۔ اگر ٹھینہ دھڑکتے ہوئے دل کے قریب رہیں گے تو تمام انسانی برادری کے لئے روشنی کا کارخانہ بن جائیں گے۔“

”مجھے آپ جیسی رحم دل شنزادی سے ایسی ہی سخاوت کی توقع تھی۔“

صفر نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر، کیا یہ ضروری تھا کہ ٹھینہ کو خوش رکھنے کی خاطر آپ سچے وہ ہیرے بیٹریوں کے ساتھ رکھ دیتے۔ اس سے جھوٹ بھی کہا جاسکتا تھا کہ اس کے اندر چھپا دیئے گئے ہیں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ٹھینہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔“

موسٹر لینڈ پتھنے کے بعد جب بھی بیٹری بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو میں ”تھو“

فائل کر اس کے حوالے کر دوں۔

”ٹھینہ کے اس مطالبے کے پیش نظر میں یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دقت کسی بیٹری میں کوئی نقص پیدا ہو جائے گا اور اس کی جگہ دوسری بیٹری کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسی صورت میں آپ خود سوچئے کہ بیٹری بدلنے کے

بیروں کا مطالبہ کرے اور ہیرے موجود نہ ہوں تو اے کتنا صدمہ پہنچے گا اور ساتھ ہی ہیرے تجربے کو بھی کتنا نقصان پہنچے گا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اسے خوش اور مطمئن رکھنے کے لئے ان بیروں کی موجودگی ضروری ہے۔

”اس کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ گھڑی کی ٹک ٹک جو ٹیکل گے بغیر قائم نہیں رہتی۔ جو ٹیکل ہیرے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہیرے کے بغیر ٹیمینہ کے دل کی دھک دھک برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس وقت ٹیمینہ پانچ جو ٹیکل کی عورت ہے۔“  
”عورت کو اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کے زیورات چھین لئے جائیں گے تو وہ نہیں لاکرز میں چھپا کر رکھ دیتی ہے۔ ٹیمینہ بھی عام عورتوں کی طرح ہے۔ وہ ہیرے اس کے بدن پر بچے رہیں یا نہ رہیں۔ اس کے بدن کے اندر تو محفوظ ہیں۔ اسی لئے وہ مطمئن ہے اور زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا حوصلہ کرتی رہتی ہے۔“

”سٹر صفدر! آپ فرض شناس آفیسر ہیں۔ آپ قانون شکنی پسند نہیں کرتے ہیں لیکن افسوس کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو قانون کے خلاف ہوتے ہوئے بھی قانون میں ہلکا پھلکا ہے کہ مجھے مجرم نہ سمجھا جائے کیونکہ میں تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے یکہ اہم تجربہ سے گزر رہا ہوں۔“

”دیکھئے۔ چوری کا مال جہاں بھی ہو، آپ وہاں سے نکال کر لے آتے ہیں۔ جو مال بدلے چھپا رکھا ہے اسے آپ نکال کر نہیں لاسکتے۔ یہاں قانون آپ کو اجازت نہیں دے گا کہ آپ ایک مریضہ کی جان لے کر وہ ہیرے برآمد کریں۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے آپ کو اور آپ کے قانون کو ٹیمینہ کی طبعی موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

صفدر مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ شہزادی شاہینہ اور شاکر جمالی بھی کمرے سے باہر آگئے۔ ڈاکٹر خاور ان کے پیچھے تھا۔ وہ سب پھر اسی کھڑکی کے پاس آگئے جہاں سے بیڑہ ٹھہرا آ رہی تھی۔ وہ بستر پر پپ چاپ دائیں کروٹ لئے ہوئے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

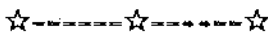
شہزادی شاہینہ نے اسے دیکھ کر سوچا۔ ”یہ عورت ہیرے پانچ جو ٹیکل کی بدولت زندہ ہے۔ اس کے مرنے کے بعد وہ ہیرے مجھے داہیں مل جائیں گے اور میری شہرت بڑھ جائے گی کہ ڈاکٹر کے تجربے کو کامیاب بنانے میں میری سخاوت اور رحمی نے زیادہ کام کیا ہے۔“

شاگرد جمالی نے غمینہ کو حسرت سے دیکھ کر سوچا۔ ”میں نے اس کم بخت کو لائق طور پر رکھنے کو ویسے تھے۔ وہ پانچوں ہیروے نگل گئی۔ اب میں اس کے اندر سے لائق کیسے نکالوں۔ اس کے اطراف میں سخت پیرہ ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں۔ شہزادی مجھے اپنے ملک لے جا رہی ہے۔ شاید وہاں ان سے بھی قیمتی ہیروے نکالیں جائیں۔“

صنذر علی نے بے بسی سے سوچا۔ ”ڈاکٹر ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے اور غمینہ نے چوری کا مال اپنے بدن کے مکان میں چھپا رکھا ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ میں اس مکان سے مال برآمد کروں۔ ڈاکٹر نے جرم کیا ہے کہ قانون اس کے سامنے بے بس ہو گیا ہے۔“

اس وقت تک ڈاکٹر خاور کمرے کے اندر پہنچ گیا تھا اور اشیاء کو سب سے بڑے دل کی دھڑکنوں کو سمجھ رہا تھا۔

دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں۔ ”دھک دھک۔ دھک دھک پانچ دھک عورت“ اور اس عورت کی آنکھیں مسرتوں کے جھوم میں ہیروے کی طرح چمک رہی تھیں۔



# خواب مسلسل

ان بے وسیلہ لوگوں کی حسرت ناک کہانی جو اس دنیا کی کوئی نعمت اپنی مرضی سے حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ صرف خوابوں کے ذریعے اپنی مرضی، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو پورا کر لیتے ہیں..... اگر وہ ایسے خواب بھی نہ دیکھیں تو پھر بھڑا کر مرجائیں۔

ماہر نفسیات ڈاکٹر زہیری جس قدر حیران تھا اسی قدر دوسرے ڈاکٹروں کو حیران اور پریشان کر رہا تھا۔ دوسرے ڈاکٹر یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اس دنیا کوئی بھی انسان قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں سے ہٹ کر ایک نئے انداز سے خواب دیکھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر قرمان علی نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

”یہ ناممکن ہے۔ خواب تو ہم سب دیکھتے ہیں۔ ہمارے باپ دادا اور دادا کے دادا بھی خواب دیکھتے آئے ہیں لیکن ایسا خواب کسی نے نہیں دیکھا جیسا کہ تمہارا مریض دیکھتا ہے۔“

ڈاکٹر زہیری نے جواباً میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

”اب وہ مریض نہیں ہے۔ بالکل ایک نارمل انسان ہے اس کا نام قیس محمد ہے۔ وہ علی بھائی ولی بھائی کمپنی کے برانچ آفس میں ایک کلرک ہے۔“

”کلرک.....؟“ کتنے ہی ڈاکٹروں نے ناگواری سے منہ بتایا۔ کیونکہ وہ اونچے ڈاکٹر تھے اور اپنے ملک کے صرف لکھ پتی اور کروڑ پتی وماغی سرایوں کا علاج کرتے تھے۔ وہ ایک معمولی کلرک کے لئے اپنا قیمتی وقت کبھی ضائع نہ کرتے لیکن مجبوری ہے کہ وہ کلرک ان دنوں ایک نئے اور انوکھے انداز میں خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب کا علم انسان کی روزمرہ زندگی سے اس کی سوچ سے اور اس کے دماغ سے ہوتا ہے اور وہ دماغی امراض کے ڈاکٹر تھے۔ لہذا ایک معمولی کلرک سے دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے ناگواری سے کہا۔

”انسان سب اچھے ہوئے حالات کا شکار ہوتا ہے تو اس کا دماغ اچھ کریتا ہے۔ ہے۔ غریبوں کی زندگی میں نہ زیادہ مسائل ہوتے ہیں نہ زیادہ الجھنیں ہوتی ہیں۔ صرف دال روٹی کی فکر ہوتی ہے۔ اور روٹی تو کتنے کو بھی مل جاتی ہے۔“

”دوسرے ڈاکٹر نے تائید کی۔  
 ”بے شک“ دراصل یہ بے چارے دولت مند‘ مظلوم اور توجہ کے مستحق ہوتے  
 ہیں۔ اعم غریب کا محکمہ انہیں سب سے زیادہ بیمار بناتا ہے وہ کسی طرح اس بیماری سے کترا  
 کر نکلتے ہیں تو سرکار سے چھپائی ہوئی کالی دولت کو خرچ کرنے کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ یہ  
 غریب لوگ نہیں جانتے کہ وہ دولت کمانے اور اسے چھپا کر خرچ کرنے کے دوران کتنے  
 ہتھی مذاہنوں سے گزرتے ہیں اور دماغی مریض بن کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ ٹان سنس یہ  
 دیکھنے کا کلرک خواب دیکھنے والی عجیب سی الجھن کہاں سے لے آیا ہے؟ وہ کب تک  
 بیل آئے گا؟“

ڈاکٹر زبیری نے کہہ۔ ”بس اب آتا ہی ہوگا۔“  
 وہ سب دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے کے دونوں پٹ ان کی منتظر  
 آنکھوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ انتظار کی سزا اکثر طویل ہوتی ہے اور وہ تمام دولت مند  
 ڈاکٹر زندگی میں پہلی بار ایک غریب کلرک کے ہاتھوں سزا پارہے تھے۔  
 ایک بوڑھا ڈاکٹر جو اونچا سنتا تھا۔ وہ اپنی کرسی ذرا کھسکا کر ڈاکٹر زبیری کے پاس  
 آیا۔ پھر اپنے ایک کان میں سننے والے آلے کو لگا کر پوچھا۔  
 ”ڈاکٹر! آپ نے کیا کہا تھا۔ میں اچھی طرح سن نہ سکا۔“  
 ”میں نے کہا ہے کہ قیس نامی ایک شخص بالکل انوکھے انداز میں خواب دیکھتا  
 ہے۔“  
 بوڑھا ڈاکٹر ہاں کے انداز میں گروں نہ ہلاتا تب بھی اس کی بوڑھی گروں ہلتی رہتی۔  
 اس نے پوچھا۔

”وہ کس قسم کے خواب دیکھتا ہے؟“  
 ”رومانی خواب! ہر رات اس کے سنے میں ایک حسینہ آتی ہے۔“  
 ”ہوں۔۔۔۔۔۔“ اس کی گروں اثبات میں ہلتی رہی۔ ”کیا وہ خواب میں آنے والی  
 حسینہ کا نام بھی جانتا ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ اس کا نام لیلیٰ ہے۔“  
 ”لیلیٰ ہی ہے۔۔۔۔۔۔“ بوڑھے ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔  
 ”عجب ہے۔ تم سب ماہر نفسیات ہو کر قلیل کی دماغی الجھن کو نہ سمجھ سکے۔“

ایک ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔

”کیا آپ سمجھ گئے ہیں؟“

”بالکل۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ پہلے آپ بتائیں کہ کیا قیس نوجوان ہے؟“

”ہاں۔ وہ نوجوان ہے اور کنوارہ بھی ہے۔ اور غریب بھی ہے۔“

”پھر تو بالکل ہی سیدھی سی بات ہے۔ غریب نوجوان ایک بیوی کے اغوا پر پورے نہیں کر سکتے اور آج کل کی لڑکیاں محبوب بننے کے لئے ایسے نوجوان کو لٹھ مار دیتیں۔ اس لئے وہ اپنی محرمیوں کو یا اپنی نوجوانی کی اس خوبصورت سی کمی کو خوابوں میں پورا کرتے ہیں۔ اس نے یقیناً لیلیٰ مجوں کی داستان پڑھی یا سنی ہو گی۔ مجنوں کا اصل نام قیس تھا اور اس نوجوان کا نام بھی قیس ہے اور اسی کی مناسبت سے وہ خواب میں لیلیٰ کی محبوبہ کو دیکھتا ہے۔“

تمام ڈاکٹر طنز پر انداز میں مسکرانے لگے۔ ایک ڈاکٹر نے بوڑھے سے کہا۔

”محترم بزرگ! ہم گھاس کاٹ کر ماہر نفسیات نہیں کہلاتے ہیں۔ جو بات آپ نے سمجھائی، وہ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر زبیری نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ قیس کے خواب دیکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ بالکل انوکھے انداز میں دیکھا ہے۔“

”وہ انوکھا انداز کیا ہے؟“ بوڑھے نے کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

ڈاکٹر زبیری نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

”وہ ایک خواب ہر رات قسط دار دیکھتا ہے۔“

”کیا؟“ بوڑھے ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا کہا؟ قسط دار خواب؟ یعنی قسطوں ابھی تھوڑا بعد میں؟“

”جی ہاں۔ قیس نے پہلی رات ایک خواب دیکھا۔ صبح آنکھ کھلی تو وہ نواب احمد رہ گیا۔ دوسری رات جب اس کی آنکھ لگی تو پچھلی رات جہاں سے خواب کا سلسلہ شروع ہوا، ٹھیک اسی جگہ سے دوسری رات اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ دوسری رات اس خواب نے دوسری قسط جہاں ختم ہوئی، تیسری رات اس خواب کی تیسری قسط پھر اپنے تسلسل سے شروع ہو گئی۔“

”شہر و شہرہ.....“ بوڑھے ڈاکٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کہا۔

”تم تو کہتے ہی چلے جا رہے ہو کچھ سمجھنے کا موقع تو دو.....“



پھر وہ دھیرے دھیرے بڑوانے لگا۔ "مگر اہواذقت اور دکھا ہوا خواب، یہ دونوں بھی داہیں نہیں آتیں اور قیاس اپنے زمانی خواب کی ایک قط کے بعد دوسری اور تیسری قطیں دکھانا چلا جاتا ہے۔ نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے۔"

"واقعی یہ ممکن نہیں ہے....." ایک ڈاکٹر نے تاہید کی۔

ڈاکٹر زبیری نے پھر ایک بار میز پر گھونٹا ہاتھ ہوئے کہا۔

"وہ مجھے اپنے خواب کی چار قطیں سناچکا ہے اور آج وہ بانچویں قط سنائے آئے۔"

”مگر وہ کہاں ہے؟“

”پس اب آئی ہو گی۔“

تمام ڈاکٹر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

آہٹ پہ کان، در پہ نظر تھی کہ ناگہاں

آئی خبر کہ پاؤں میں مہندی لگی وہاں

دہلی سے بہت دور ایک فٹ پاتھ پر قیس کا پاؤں مندی کی لالی کی طرح سرخ تھلا ہوا ہوتا تھا۔ وہ اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنے اپنے کام کرتے تھے۔ ایک لانی سی کیل پرانے جوتے کو چمید کر ایزی میں گھس گئی تھی۔ ہم کو کراچی کی بسوں میں اتنی بھیر ہوتی ہے کہ لوگ بسوں کے باہر لٹک کر جھانک لٹک کر دیکھتے ہوئے اپنے گھر دوں تک پہنچتے ہیں۔

پلاؤں زخمی ہونے کے بعد وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ کسی بس میں سوار ہو کر کرتب کھائے۔ ہانڈل منٹ کے مطابق ڈاکٹر زہیری کے پاس پہنچنا بھی ضروری تھا اور جیب میں رکشہ ٹیکسی کے پیسے بھی نہیں تھے۔ اس لئے وہ کسی ایسی بس کا انتظار کرنے لگا جس میں سناٹا کم ہو۔

انکار کرنے کے لئے وہ فٹ پاتھ کی ایک ریڈنگ سے نیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اسان کو  
 زمت نہیں ملتی کیونکہ فرصت کے وقت سوچیں فرصت نہیں دیتیں، اس لئے وہ پانچ  
 مل پہلے کی زندگی کے اوراق گھولنے لگا۔

☆ → → → → → ☆ → → → → → ☆

پانچ برس پہلے گوجرانوالہ میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر زبیری سے محبت کہا تھا کہ وہ کنوارہ ہے۔ اس ایک جھوٹ کے پیچھے بہت سی تلخ یادیں تھیں۔

جنہیں وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ جو آدمی کا وماغ ہے، یہ آدمی کی مرضی کے خلاف بھولا ہوا سبق لگا ہے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ تین ماہ کے بعد قیس کے ماں باپ نے کہا ”اب تم ایک سے دو ہو گئے ہو۔ کہیں ملازمت کرو اور اپنی بیوی کا کام برداشت کرو۔“

بوڑھے ماں باپ نے یہ سوچ کر بیٹے کی شادی کی تھی کہ بیٹا وس جماعت پانے کرنے کے بعد بھی کہیں ملازمت حاصل نہ کر سکا۔ شاید بہو کی قسمت سے اسے نوکری مل جائے۔ ہمارے ملک کے اکثر گھرانوں میں ایسے ہی عقیدوں کے تحت بیٹوں کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ قیس اپنی تین ماہ کی نئی ولسن کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ وہاں پہ ماہ تک سڑکوں کی دھول اڑاتا رہا، لیکن کسی نے اس کی بیوی کا خرچ پورا کرنے پر ملازمت نہیں دی۔ حارثی کام و ہندوں سے اتنے ہی پیسے ملے کہ وہ تین وقت کھا کر اور ہفتہ میں دو بار گو جو انوالہ جا کر اپنی بیوی سے مل سکے۔ ایک دن باپ نے بگڑ کر کہا ”تم گو جرانوالہ کے رہے نہ لاہور کئے۔ نہ بیوی کے رہے نہ ملازمت کے۔ ایسے تو تمہیں کہیں بھی کئی ملازمت نہیں ملے گی۔ تم کہیں ایک جگہ ٹھکانے سے نہ رہ سکتے ہو، مہم بیوی ساتھ رہے۔ تو بر خوردار اپنا بوریا بستر باندھو اور بیوی کو لے کر یہاں سے جاؤ۔“

قیس کی ماں نے چاہا کہ بیٹے پر بہو کا بوجھ نہ پڑے مگر باپ نے کہا۔ ”میں نے ونیا دیکھی ہے۔ جب مرد کے کاندھوں پر بوجھ پڑتا ہے تو اسے مردانہ داز اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ وہ پیٹ کی فکر اسے کمانے پر مجبور کر دے گی۔ اسے بہو ساتھ جانے دو۔“

مختصہ بیوی کو ملے کر کراچی آ گیا۔ بیوی کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر ایک نئے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ بشری صرف حسین ہی نہیں تھی بلکہ بڑے ہی ”بیب“ نظر چیتے ہوئے بدن کی مالک تھی۔ چادر لپیٹنے کے باوجود اسے دیکھنے والے ہلکے جھپکنا بھول جاتے تھے۔ قیس کراچی پہنچ کر ملازمت حاصل کرنے سے زیادہ اپنی بشری کو چھپا کر کی قبر میں جٹلا ہو گیا۔

اتنے بڑے شر میں کہیں مر چھپانے کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر وہ بشری کی قد آور چوڑی کو کہاں چھپاتا؟ پہلی رات ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانہ میں اس طرح گزری کہ

مڑتے ہوئے مسافر اسے نظر لگاتے رہے۔ چوروں نے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا کہ باپوں نے لگتا ہے۔ ایک سپاہی جو حوالدار کہنے سے خوش ہو جاتا تھا وہ ڈیوٹی دینے کے بہانے بشری کے اطراف چکر لگاتا تھا اور بار بار مونچھوں پر تاؤ دیتا تھا۔ قیس کو بڑا ہوا آگیا مگر قانون کے محافظ سے الجھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس نے بشری کی چوکیداری کرتے ہوئے صبح کر دی۔ اس کی بیب میں سو روپے تھے اور بشری کے جسم پر شادی کے زیورات تھے۔ حسین عورت اگر سونے کے زیورات سے لدی ہو تو پھر عیاش طبع حضرات کے علاوہ دو ٹکے کے چور بھی پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ تمام دن کتنے ہی اجنبی چروں کو اپنے تعاقب میں دیکھتا رہا۔ دوسری رات انہوں نے منگھو پیر کی ایک جھگی میں گزاری۔ جھگی میں ایک میاں بیوی اور دو چھوٹے بچے تھے۔ قیس نے ایک گوشے میں بشری کا بستر لگا دیا مگر خود نہ سو سکا کیونکہ جھگی والا تمام رات ایک آنکھ سے ایک کردٹ سوتا رہا اور اس کردٹ کا رخ بشری کی طرف تھا۔ دوسری صبح بشری نے پریشان ہو کر کہا۔

”قیس! تم دو راتوں سے جاگ رہے ہو۔ اس طرح بیمار ہو جاؤ گے۔“

قیس نے کہا۔ ”میں جب تک تمہیں ایک مضبوط دروازے کے پکے مکان میں نہیں رکھوں گا۔ اسی طرح جاگتا رہوں گا اور جاگتے جاگتے مری جاؤں گا۔“

”میں تمہارے دشمن۔ یہ میرے گھنے لہو اور انہیں بچ کر کرایہ کا مکان تلاش کرو۔“

قیس نے اس کے زیورات بیچنے سے انکار کیا۔ وہ اصرار کرتی رہی۔ آخر ان کی بحث اس نتیجے پر پہنچی کہ زیورات نہ بیچے گئے تو چھیننے اور جھٹنے والے قدم قدم پر آئیں۔ ہو سکتا ہے کہ زیورات والی کو بھی چھین کر لے جائیں، لہذا اسی دن وہ گھنے لہو سے کر دیے گئے۔ اس طرح قیس کی بیب میں تین ہزار روپے آ گئے۔

جیب میں پیسے ہوں تو انسان کیا نہیں خرید سکتا۔ شام تک ہمار کالونی میں ایک کمرے کا مکان کرایہ پر مل گیا۔ کھانے پکانے کا مزدوری سامان بھی خرید لیا گیا۔ بشری کو کھانے پینے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اپنے زیورات دیتے وقت یہ شرط بھی لگائی تھی کہ ایک چھوٹا سا ریڈیو اور سنگار کا سامان بھی آنا چاہئے۔ اس نے اپنی حسین بیوی کو شوق میں پورا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تاکید بھی کی۔

”وکیہ بشری! یہ نیا شر ہے۔ یہ نہیں اس محلے کے لوگ کیسے ہیں۔ تو سٹھار کرے دروازے پر کبھی نہ جانا“ نہیں تو چھو کرے اس گلی میں صبح و شام بیٹیاں بجائے گزرتے۔ میں کتنوں کے منہ پر ہاتھ رکھوں گا۔“

وہ دو راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ شام ہی کو اس نے گھر کے دروازے پر اندر سے تھکا ہوا پھر فرش پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر چاروں شانے چت سو گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک وہ کبھی نہ رہا کبھی جاگتا رہا۔ ابھی جیب میں آٹھ سو روپے تھے۔ کھانے پینے کی فکر نہیں تھی۔ ام زندگی کی زلفیں سلجھی ہوئی تھیں اس لئے وہ بشری کی زلفوں میں الجھتا رہا۔ ایک ہندو بشری نے کہا۔

”اس طرح بیٹھ کر کھانے سے تو تاروں کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ تمہیں کوئی اور دھندا کرنا چاہیے۔ ایک ہفتہ سے تم باہر نہیں نکلے۔ کبھی سو دالانے پانی بھرنے یا سکرے لانے جاتے ہو۔ پھر آکر دروازہ اندر سے بند کر لیتے ہو۔“

وہ دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں باہر جا کر کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر باہر جاتے ہی تیری فکر شروع ہو جاتی ہے ایں! اکیسی رہ جاتی ہے۔“

”تم میری فکر کیوں کرتے ہو“ میں کوئی بچی تو نہیں ہوں۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ تو بچی نہیں ہے۔“

وہ گہری سانس لے کر بڑی اداسی سے بولی۔

”میں تمہارے لئے مصیبت نہیں بننا چاہتی۔ تم میرا گلا گھونٹ دو۔“

”ایسی باتیں نہ کر۔ تو گلا گھونٹنے کے لئے نہیں گلے لگانے کے لئے ہے۔ تجھے

قدر حسین بنانے سے پہلے اللہ میاں کو سوچنا چاہئے تھا کہ یہ دولت غریب کے کمرے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔“

”کیوں نہیں؟“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ کل سے میں کام کی تلاش میں جاؤں گا۔ مگر دروازے پر تھکا

جاؤں گا۔“

”بشری یوں چونک گئی جیسے اعتماد کے منہ پر زور کا طمانچہ پڑا ہو۔“

”نہیں قیس! اس طرح محلے کی عورتیں مجھ پر نہیں گی۔ محلے کے نوجوان

کہ میں تمہارے بس کی نہیں ہوں اس لئے تالا ڈال کر مگے ہو۔ تم لوگوں کو وہ بڑھا سمجھانا چاہتے ہو جو وہ سمجھتے نہیں ہیں۔“

اس بحث میں ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران قیس کام کی تلاش میں کئی بار گھر سے لیکن اس طرح کہ محلے کے ہی چکر لگاتا رہا۔ دور سے اپنے گھر کو دیکھتا رہا کہ بشری رواڑہ کھول کر تاک جھانک کرتی ہے یا نہیں؟ محلے کی ہر عورت کسی نہ کسی کام سے ہر گھنٹی تھی اس مشینی شہر میں مروا تے مصروف ہوتے ہیں کہ گھر کے چھوٹے بڑے اسوں کے لئے عورتوں کو باہر نکلنا پڑتا ہے۔ صرف ایک بشری ایسی تھی جو شوہر کی عدم موجودگی میں کبھی گھر کے دروازے پر بھی نہیں آئی۔

قیس کو جب کچھ اطمینان ہوا تو وہ محلے سے باہر جا کر کام تلاش کرنے لگا۔ وہ صبح باہر نکلا۔ پھر دو چار گھنٹے میں واپس آ جاتا تھا۔ بشری سب کچھ سمجھتی تھی۔ مگر چپ رہتی تھی۔ ایک ماہ بعد اس نے کہا۔

”سب پیسے ختم ہو گئے۔ آخری سوکانوٹ رکھا تھا۔ وہ اگلے ماہ کا کرایہ دے دیا۔ اب کیے گزارہ ہو گا؟“

”کیسے گزارہ ہو گا؟“ اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے دو دن اور گزر گئے۔ جو راتیں ٹھاوہ بھی ختم ہو گیا۔ آخر مجبور ہو کر اسے صبح سے شام تک کے لئے گھر سے باہر بلا پڑا۔ شام کو بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو کر واپس آیا تو بشری نے اس کے آگے گرما گرم سالن اور روٹیاں رکھ دیں۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے پاس پیسے نہیں تھے پھر یہ کھانا کیسے پک گیا؟“

”میں نے پڑوسن سے پچیس روپے ادھار لئے ہیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی کہ بوسے پائے آؤ گے۔“

وہ نہیں چاہتا تھا کہ بشری محلے کی عورتوں سے میل ملاپ رکھے۔ اس طرح بے پروگی کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن مفلسی اور تنگدستی نے بشری کے لئے پڑوسن کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم نے مجبوراً قرض لیا لیکن بازار سے سودا کیسے آیا؟“

”پڑوسن کے لڑکے نے لاکر دیا۔“

”آلہ مگر وہ تو لوجوان ہے؟“

”ہے تو سہی مگر وہ ہمارے دروازے پر نہیں آیا۔ اس نے سودا لاکر لٹا دیا۔ اس کی ماں نے یہاں پہنچا دیا۔“

قیس نے مروہ ہی آواز میں کہا۔ ”اچھا۔“ پھر بھوک سے مجبور ہو کر کھانا کھا۔ انسان رفتہ رفتہ حالات کے مطابق زندگی گزارنا سیکھ لیتا ہے۔ اس کی کجی اچھیا کہ وہ اپنی حسین بیوی کا پیریدار بن کر کبھی ملازمت حاصل نہیں کر سکے گا۔ ملازمت ملے گی تو صبح سے شام تک بشری کو صرف اعتماد کے سارے چھوڑ کر جاہلوں اس دنیا میں جہاں جہاں کراچی جیسے شہر ہیں، وہاں کے مرد اپنی عورتوں کے سلسلے پر دے سے زیادہ اعتماد کو اہمیت دیتے ہیں۔

لاہور کی طرح اس شہر میں بھی اسے مستقل ملازمت نہ ملی۔ عارضی طور پر یہاں، کبھی وہاں کام کرتا رہا۔ وہ کبھی دو دقت اور کبھی ایک دقت کا کھانا کھا کر گزار کر رہے تھے۔ اتنی تنگدستی میں بشری کا شوق نہیں بدلاتھا۔ وہ فلمی گانے سننے پر دوپہر کو قیس کمانے کے لئے نہیں آتا تھا اس لئے وہ بھی بھوک رہ کر پیسے بچاتی تھی۔ جب دس روپے تک جمع ہو جاتے تو وہ فلم دیکھنے کی ضد کرنے لگتی تھی۔

قیس کو اس کی یہ عادتیں پسند نہیں تھیں۔ پھر وہ سمجھوتے کے انداز میں سوچا اتنی خشک زندگی گزارنے کے دوران کبھی کبھی تفریح کا بھی موقع نکالنا چاہئے۔ نہ نت نئے ڈیزائن کے کپڑے نہیں پہن سکتی تھی لیکن فلم کی ہیروئن کو رنگارنگ لباس میں ناچتے گاتے دیکھ کر وہ خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتی تھی۔ وہ قیس کو دکھانے کے سنگھار کرتی تھی مگر اسے داؤ نہیں ملتی تھی کیونکہ گھر کی مرغی وال برابر ہوتی ہے۔ کی ہیروئن سنگھار کرتی ہے تو ساری دنیا داؤ داہ اور ہائے ہائے کرتی ہے۔ اپنے دقت وہ فلم دیکھتے دیکھتے ہیروئن کی جگہ پہنچ جاتی تھی۔ وہاں کم از کم اس کے سنگھار خوفزدہ ہونے والا شوہر نہیں ہوتا تھا۔

ہم اپنی زندگی میں جو کچھ نہیں پاسکتے، انہیں جاگتی آنکھوں کے خوابوں میں مان کر لیتے ہیں۔ انسان احمق ہے کہ دوسرے انسان سے اس کے حصے کی روٹی چھین اسے مارنا چاہتا ہے۔ اسے دو تو روٹی کے بغیر بھی کچھ روز جی لیتا ہے۔ اسے مارنا اس کے خوابوں کو اس سے چھین لو۔ عجیب ہے کہ انسانی معیشت میں خوابوں کا کیوں نہیں آتا۔“

قیس ایک برس تک محنت مزدوری کرتا رہا۔ اپنی عمر کو گنوا تا رہا۔ بشری کی جوانی تو خوابوں سے بھلا تا رہا۔ ایک روز وہ سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک نئے ماڈل کی کار سے ٹکرا گیا۔ ٹکرائے کے دوران اس نے صرف ایک چمکتی ہوئی کار دیکھی تھی۔ اس کے بعد لگا ہوں کے سامنے کوئی نظارہ نہ رہا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جب اسے فوہوش آیا تو اس نے اپنے سر اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی دیکھیں۔ ہانا کا سینہ دکھ رہا تھا۔ ہاتھ بھی زخمی تھے، اور پٹیوں سے بندھی ہوئی اس کی ایک ہانگ بنگرے اٹھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کا نام اور پتہ پوچھا۔ اس نے بڑی تھابت سے بتایا، پھر بے ہوش ہو گیا۔ بستر کے دوسری طرف ایک پولیس انسپکٹر اور ایک ادویہ عمر کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے گہرا کر کہا۔

”ڈاکٹر! یہ تو پھر بے ہوش ہو گیا۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں، یہ خطرے سے باہر ہے۔ آپ اس پتہ پر اس کے عزیزوں کو مطلع کر دیں۔“

دو نام اور پتہ یاد کر کے انسپکٹر کے ساتھ باہر آیا۔ انسپکٹر نے اس کی کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”برکت صاحب! آپ کو نشہ گی حالت میں کار ڈرائیو لیس کرنا چاہئے تھی۔“

برکت نے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بس غلطی ہو گئی۔ میں قیس سے اور اس کے رشتہ داروں سے منٹ لوں گا۔“

آپ مجھے تھانے پکھری کی مصیبتوں سے بچالیں۔“

یہ کہتے ہی اس نے انسپکٹر کے سامنے ویش بوڑ کا خانہ کھول دیا۔ اس خانہ میں سو اسکے فونوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ انسپکٹر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”برکت صاحب! آپ جیسی معزز ہستی کو کون نہیں جانتا ہے اس لئے میں نے

ہائے سادہ میں آپ کا ڈرائیو لگ لائنس طلب نہیں کیا۔ وہاں جو لوگ تھے وہ آپ کے خلاف گواہی دیتے نہیں آئیں گے۔ کیونکہ تھانے پکھری کے چکر لگانے سے سب ہی گھبراتے ہیں۔ ہسپتال دالوں کی رپورٹ میں میرا بیان یہ ہو گا کہ ایک تیز رفتار کار میں کو کچلتی ہوئی چلی گئی۔ اس کا تعاقب کرنے کے لئے مجھے دقت پر کوئی گاڑی نہ ملی۔

اس لئے میرا بھی فائدہ ہوگا۔ مجھے محکمہ سے ایک موٹر سائیکل مل جائے گی۔ میری والدہ والی ڈرائیو ان میں فلم دیکھنے کی بہت ضد کرتی ہے۔ کار نہ سہی وہ موٹر سائیکل پر کر فلمیں دیکھ لیا کرے گی۔“

سیٹھ برکت نے سو مو کے وس نوٹ اس کی بیب میں رکھ دیئے۔ جب دوبارہ کالونی پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ بشری سنگھار کر کے اپنے قیس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دستک ہوتے ہی اس نے دروازہ کھولا تو سیٹھ برکت کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ عوارف اس کی زندگی میں بہت آئی تھیں لیکن ایسا دکھتا ہوا حسن اور دکھتا ہوا شہاب پہلی بار اس کی نظروں میں آیا تھا۔ پھر وہ ہوشیار نظرہ دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس کی رز بھری آواز سنائی دی۔

”کون ہو تم؟ میرے دروازے پر کیا لینے آئے ہو؟“

”میں قیس صاحب کے عزیزوں سے ملنے آیا ہوں۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”کی ہویا اے؟“ وہ ایکسیڈنٹ کے معنی نہ سمجھ سکی۔

اس وقت تک محلے کے لوگ ایک دولت مند اور ایک پولیس انسپکٹر کو بکرا وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے دروازے کے قریب جا کر بڑی سے کہا۔

”یہ کہتے ہیں کہ تمہارے میاں کو کہیں حادثہ پیش آیا ہے۔“

”اللہ خیر.....“ بشری کا کلیجہ کانپنے لگا۔

پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”قیس کو فکر مارنے والا اپنی گاڑی میں فرار ہو گیا۔“

سیٹھ برکت صاحب ہیں۔ نہایت ہی نیک اور شریف انسان ہیں۔ انہوں نے قیس کو ہسپتال پہنچا دیا ہے۔“

دروازے کے پیچھے سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ہسپتال کہاں ہے؟ مجھے وہاں لے چلو۔ میں یہاں کے راستے بھی نہیں جانتی.....“

یہ کہتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ایک سال کے عرصہ میں محلے والوں نے پہلی بار اس دروازے سے بشری کو نکلتے دیکھا تھا۔ پڑوس نے کہا۔

”بیٹی! تم پریشانی میں یونہی نکل آئی ہو۔ اچھا کوئی بات نہیں تم جانتی۔“



روانے پر جالا لگا دوں گی۔“

قیس اسے صرف والے کے پیچھے ہی نہیں، چادر کے پیچھے بھی چھپانا چاہتا تھا لیکن ماں اجڑ رہا ہو تو چادر کا خیال کسے رہتا ہے۔ گلی سے دور سڑک پر کار کھڑی ہوئی۔ محلے والے کار تک اسے چھوڑنے آئے۔ جب وہ چلے گئے اور کار آگے بڑھ گئی۔

اسے گھبراہٹ کے باوجود احساس ہوا کہ وہ دواجنیوں کے درمیان تھارہ گئی ہے۔ آگے جا کر تھانے کے سامنے انسپکٹر رخصت ہونے لگا۔ بشری نے گھبرا کر پوچھا۔

”والدہ صاحب! آپ جا رہے ہیں مگر ہسپتال ابھی تک نہیں آیا۔“

”گھبراؤ نہیں، برکت صاحبہ بہت شریف آدمی ہیں تمہیں ابھی ہسپتال پہنچا دیں گے۔“

سیٹھ برکت نے کہا۔ ”انسپکٹر! اگر یہ پیچھے بیٹھی رہیں گی تو میری نیک نامی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آگے کہیں پولیس والے مجھ پر شبہ کریں گے۔“

دو درست کہہ رہا تھا۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے وقت عیاش گاڑی والے کرائے کی عورتوں کو پچھلی سیٹ پر خرید سے ہوئے سامان کی طرح رکھ کر لے جاتے ہیں۔ عورت اگلی سیٹ پر بیٹھے تو شبہ نہیں ہوتا کیونکہ ساتھ بیٹھنے والی بیوی بیٹی یا بہن ہوتی ہے۔ کچھ نہ سو تو کرن ضرور ہوتی ہے۔

انسپکٹر نے بشری کو آگے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ کبھی یہ بات نہ مانتی مگر پولیس والا کہہ رہا تھا، اس لئے وہ انکار نہ کر سکی۔ کبھی قانون کے محافظ مجبور کرتے ہیں کبھی عادلانہ گھر کے باجیا وروانے کو کھول دیتے ہیں، کبھی غریبی ایک اجنبی کی کار میں ایک اجنبی کے پہلو میں بٹھا دیتی ہے۔

سیٹھ برکت نے اسے چور نظروں سے دیکھا۔ کیسی گلابی گلابی سی تھی۔ معلوم ہوا نواز دانوں کو دودھ کی سفیدی میں گھول کر ایک بھرے ہوئے جام کی طرح سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے ڈرائیونگ کے دوران اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ وہ سہم کر دروازے کی جانب کھسک گئی۔

”گھبراؤ نہیں، میں سگریٹ نکال رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی بشری کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس خانے میں موسو کے نوٹوں کی بے شمار گڈیاں تھیں۔ بے شمار اس

لئے کہ بشری کو سو سے زیادہ گنتی نہیں آتی تھی۔ وہ ان نوٹوں کو گنتے گنتے اٹھنا مارنا جوانی گزار دیتی۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جلد ہی وہ تیار بند ہو جائے لیکن سنہرے خوابوں کی تجوری کھلتی ہے تو خواب دیکھنے والوں کی رہی سے بند نہیں ہوتی۔

سیٹھ برکت نے گاڑی کو ایک جگہ روکتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ رہا تھا کہ اس خانہ میں سگریٹ ہے۔ پتہ نہیں میں نے کب وہ سگریٹ کے بدلے روپے رکھ دیئے تھے۔ مجھے یاد ہی نہ رہا۔ بہر حال تم ذرا جی رہو! میں سگریٹ لے کر ابھی آتا ہوں۔“

وہ کاد کاد وازہ کھول کر چلا گیا۔ ڈیش بورڈ کا خانہ بھی کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ ہر ایک ایک دم سے متاثر ہو کر سوچنے لگی۔

”یہ کتنا دولت مند ہے۔ اتنے سارے روپے یوں چھوڑ گیا۔ جیسے دو چار پم ہوں۔ پتہ نہیں وہ یہاں کب سے روپے رکھ کر بھول گیا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ یہاں سگریٹ رکھے ہوئے ہیں۔ عجیب بے فکر ہے۔ ایسے تو نہ جانے اس کے کتنے روپے چوری ہو جاتے ہوں گے۔ اگر اس میں سے میں کچھ نکال کر چھپالوں تو اسے پتہ ہی نہیں چلے گا..... تو بہ تو بہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں نے تو آج تک کبھی چوری نہیں کی.....“

کوئی چور ہو یا نہ ہو، ایسے وقت چوری کا خیال ضرور آتا ہے۔ کیونکہ اس کا قہر ہسپتال میں تھا۔ ہسپتال کے اخراجات تو ایک طرف رہے۔ کل صبح چولہا جلانے کے لئے ایک پیسہ نہیں تھا۔ پہلے پھل چوری کرتے ہوئے کسی طرح کی بے ایمانی کرتے ہوئے دل دڑتا ہے۔ وہ دڑتی رہی۔ اتنے میں اس نے واپس آکر گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں سیری برانڈ کا سگریٹ نہیں ملا۔ آگے دیکھا جائے گا۔“

”ہسپتال کتنی دور ہے؟“

ہسپتال تو قریب ہی تھا۔ مگر وہ راستے بڑھا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”ہم جلد ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔ ویسے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ وہ جلدی

اچھا ہو جائے گا۔“

وہ چپ رہی، اس نے کہا۔  
 ”تم کہہ رہی تھیں کہ یہاں کے راستے نہیں چاہتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ  
 ہی گھر سے نہیں نکلتی ہو۔ یا اس شہر میں پہلی بار آئی ہو۔“  
 اس نے جواب نہیں دیا۔ سینٹھ پرکت نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا۔  
 ”انسان چپ رہتا ہے تو اس کی تقدیر بھی بیشک کے لئے چپ ہو جاتی ہے۔ کچھ  
 لوہ میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔ میری دولت یونہی ادھر ادھر پڑی رہتی ہے۔  
 ہاں جتنے نوٹ رکھے ہیں وہ سب اپنے دوپٹے میں سمیٹ لو۔ اب یہ تمہارے ہیں۔“  
 بشری کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سانس لیتے ہوئے

پوچھا۔  
 ”تک..... کوئی اپنے سگوں کو بھی ایک روپیہ نہیں دیتا، آپ مجھے اتنے  
 روپے کیوں دینا چاہتے ہیں۔ میں تو آپ کی کوئی نہیں ہوں۔“  
 ”انسان محبت سے ایک دوسرے کے کام آکر سگوں سے بھی بڑھ کر اپنا بن سکتا  
 ہے۔ تم غریب ہو تمہیں دولت کی ضرورت ہے۔ میں امیر ہوں، مجھے محبت کی  
 ضرورت ہے۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں اب تک تمہارے ہی لئے  
 بکھارا ہوں.....“

”آ..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“  
 ”تمہیں شاید میری باتیں بری لگیں گی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے  
 آج تک تمہارے جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔ تمہیں اس بات پر حیرانی ہوگی کہ میں  
 یہ دولت کیوں ضائع کرتا ہوں۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہے کہ تم اپنے حسن و شباب کو  
 غریبی اور محتاجی کے ہاتھوں کیوں لٹا رہی ہو۔ ہم دونوں احمق ہیں۔ تم چاہو تو میری کار  
 کو غنی اور تمام دولت کو سنبھال کر رکھ سکتی ہو۔“  
 ”آپ..... آ..... آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں کسی کی بیوی  
 ہوں۔“

”تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟“  
 ”کام دھندے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اچھی طرح گزارنے کے لئے اچھا کام  
 نہیں ملتا۔“

”شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟“

”دو برس ہو گئے۔“

”ان دو برسوں میں کبھی تم نے ایک شاندار کار میں بیٹھ کر گارڈن، پارک، کلفش اور ہاکس بے وغیرہ کی سیر کی ہے؟“

بشری نے نفی میں سر ہلادیا۔ اسے سبکی محسوس ہوئی کہ وہ شادی کے بعد بھی دنیا جہاں سے رہاں تک نہ دیکھ سکی۔

”کبھی تم نے دل کی گھرائیوں سے قفقہ لگایا ہے؟“

وہ سوچنے لگی۔ اس کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی مسرتیں آئی تھیں لیکن کوئی ایسی خوشی نہیں آئی تھی جو بے اختیار قفقہ لگانے پر مجبور کرتی۔ اگر کوئی ایسا وقت آتا اس قفقہ کو شوہر یہ کہہ کر کچل دیتا کہ عورت کی ہنسی گھر سے باہر نہیں جانی چاہئے۔

”سیٹھ برکت نے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ غیر مرد کو اپنا نام نہیں بتاتی تھی۔ جانتے کیوں وہ غیر نہیں لگا۔ بے اختیار اس نے اپنا نام بتا دیا۔

”کتنا پیارا نام ہے۔ بشری کہتے وقت منہ بھر جاتا ہے۔“

اپنی تعریف سن کر کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی مگر اچھا لگ رہا تھا۔ گھر کی مرلی وال برابر تھی اسے باہر آکر پتہ چل رہا تھا کہ وہ مرغی نہیں، ایک عورت ہے اور اسے اتنا حق حاصل ہے کہ وہ دو مردوں کی زبان سے بھی اپنے متعلق کوئی صحیح رائے سن سکے۔ سیٹھ برکت نے کہا۔

”بشری! یہ کوئی زندگی نہیں ہے کہ کھانے کو مل گیا تو کھالیا دہنہ بھوکے رہ گئے۔ ایسے تو جانور زندگی گزارتے ہیں۔ تم انسان ہو، تمہیں زندگی کی تمام خوشیوں کو حاصل کرنا چاہئے اور اپنی ہر آرزو کی تکمیل کرنی چاہئے۔“

”م..... مگر کیسے؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کچھ سمجھ رہی تھی۔

”تم میرے کام آؤ، میں تمہارے کام آؤں گا۔“

وہ ہسپتال کے احاطہ میں داخل ہو گئے۔ بات دہیں پر ختم ہو گئی لیکن ایسا بانٹا اتنی آسانی سے کب ختم ہوتی ہیں۔ یہ خیال بشری کے دماغ میں پک رہا تھا کہ وہ کس طرح سیٹھ برکت کے کام آسکتی ہے۔ ہسپتال کے کمرے میں پہنچ کر قیس کو دیکھنے لگی۔

برکت کی باتیں بھول گئی۔ اپنے سہاگ کو جگہ جگہ بیٹوں سے بندھا دیکھ کر اسے  
دانا لایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”ہاں آپ ذرا بھی آواز نہ کریں۔ مریض گہری نیند سو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ  
آپ صبح آکر ملاقات کریں۔“

اسے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی دوبارہ کار  
نی آکر بیٹھ گئی۔ سینٹ برکت نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ رونے سے کبھی مشکل آسان نہیں ہوتی۔“  
”میں کیا کروں۔ فیس کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا؟ اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی

بہن ہے۔“  
”میں تسارا ہوں۔ کیا تم مجھ پر بھروسہ نہیں کر دو گی؟ مجھے اپنا نہیں سمجھو گی؟“

”آں؟“ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا پھر آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔  
”آپ مہربان ہیں۔ ایسے وقت جبکہ میرا کوئی نہیں ہے آپ اپنوں سے بڑھ کر

سارا دے رہے ہیں مگر میں دنیا والوں کو کیا جواب دوں گی؟“  
”میں تمہیں جس اونچے مقام پر لے جاؤں گا اتنی اونچائی تک لوگ پتھر نہیں

پھینک سکیں گے۔“  
”میں کبھی اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی۔“

وہ اسے ہورس شووز ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ وہاں مغربی موسیقی کی دھن میں  
موزکس رقص کر رہے تھے۔ ردانی جوڑے اپنی میزوں پر ایک دوسرے کے  
قریب جھکے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ بشری نے ایسے مناظر فلموں میں دیکھے  
تھے۔ ایسے مناظر میں وہ سپنوں کی ڈور تھام کر ہیردس کے روپ میں پہنچ جاتی تھی۔ پھر  
اکاڈو کو قیس نورانی لگام کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

آج وہ بے لگام ہو کر سچ سچ اس رومانی ماحول میں پہنچ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی  
کہ اگر دنیا اتنی خوبصورت ہے تو پھر وہ پہلی بار اس دنیا میں جنم لے رہی ہے۔ وہ بھوک  
نمی مگر پیٹ کی بھوک نہیں تھی۔ سینٹ برکت نے اسے زبردستی کھانے پر مجبور کرتے  
ہوئے کہا۔

”شوہر کے اعتماد کو دھوکا دینا ایک جذباتی فعل ہے۔ محبت صرف جذبات کے

سہارے نہیں ہوتی۔ اگر تم واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہو تو اس کی بھلائی کے لیے سوچو، اور سوچو کہ میرے مشوروں پر عمل کر کے ہی اس کے مستقبل کو خوشگوار بنایا ہو۔ آئندہ وہ ملازمت کے لئے ٹھو کریں نہیں کھائے گا۔

وہ سوچنے لگی۔ جب وہ روحانی ماحول سے نکل کر کار میں آئے تو آدمی دروازے گزرنے کو بھی۔ راستے میں سینٹھ برکت نے کہا۔

”اتنی رات کو تم اپنے محلے میں تہا واپس نہیں جاسکتیں۔ میں تمہارے ہاؤس جاؤں گا تو بدنامی بھی ساتھ جائے گی۔“

”ہاں! یہ میں بہت دیر سے سوچ رہی ہوں۔“

”کل صبح میں تمہیں ہسپتال لے جانے آؤں گا تب بھی لوگ باتیں بنائیں گے۔“

”ہاں! میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ کل صبح ہسپتال کیسے پہنچوں گی۔“

سینٹھ برکت نے اسے ایک کونٹری میں پہنچا دیا۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

”یہ آپ کہاں لے آئے؟“

”بشری جو دولت میں تمہیں دے رہا ہوں اسے حفاظت سے رکھنے کے لئے اور ہی مضبوط کونٹری کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم اسے اندر سے دیکھو! آج سے یہ تمہارا ہے۔“

کونٹری ایک شاہی محل کی طرح آراستہ تھی۔ وہاں آرام و آسائش کا تمام سامان تھا کہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایرانی قالین، فوم کے آرام دہ صوفے، رنگین ٹیلی ویژن، ہفت رنگ فائوس، روشنی پر دے اور ایئر کنڈیشنڈ خواب گاہیں ہاں ہلکی ہلکی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہو جاتے تھے۔ اس نے تو مرنے کے بعد جنت کی توقع کی تھی۔ اب جیتے جی جنت میں پہنچتے ہی وہ خوشی سے چکر اکر برکت دے رہا۔ برکت کے قدموں میں گر پڑی۔

دوسری صبح وہ ہسپتال پہنچی تو قیس نے مہربانی سے پہلے دور کھڑے ہوئے۔ برکت کو دیکھا پھر بشری سے سوال کیا۔

”تجھے ہسپتال کا راستہ کیسے معلوم ہوا؟ یہ میرے ساتھ کون ہے؟“

”یہ بہت شریف آدمی ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے ان کے ساتھ پہنچا دیا۔“

”بمگر تو اس کے ساتھ اکیلی کیوں آئی؟“  
 ”ہمارا کون ہے، جنہیں میں ساتھ لاتی؟ کیا تم چاہتے ہو میں یہاں نہ آؤں؟“  
 وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اگر بشری ہسپتال میں اکیلی نہ آئی تو محلے میں اکیلی  
 بنی۔ اگر خارہ بھی جاتی تو محلے کے نکلے سے گھر کے دروازے تک پانی لاکر کون دیتا؟  
 ہلے دھونے کے لئے صابن اور کھانے کے لئے راشن کہاں سے آتا؟  
 قیس نے پریشان ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ بشری نے کہا۔  
 ”نہیں فضول باتیں نہیں مونی چاہئیں۔ حالات ایسے ہیں کہ مجھے تنہا گھر سے  
 لٹائی ہو گا۔“

اس نے مجبور ہو کر ایک گہری سانس لی۔  
 ”میں ہاتھ پاؤں سے لاچار ہوں، تیرا گزارا کیسے ہو گا؟“  
 ”میں نے تیرے علاج کے لئے اور اپنے گزارے کے لئے سینٹھ صاحب سے کچھ  
 روپے اوجھار لئے ہیں۔“

قیس کو یہ بات بری لگی مگر یہ بھی سوچنا پڑا کہ وہ سینٹھ صاحب سے نہ مانگتی تو محلے  
 والوں سے مانگتی اور کہیں بھی دینے والے کچھ تول اور مول کے بعد ہی دیتے ہیں اور  
 بشری کے پاس تول مول کے لئے کیا ہے؟

یہ سوچتے ہی اس کا سر چکرائے لگا۔ سینٹھ برکت نے آگے بڑھ کر کہا۔  
 ”قیس! تم فکر نہ کرو۔ ہسپتال سے اچھے ہو کر آؤ گے تو میں تمہیں سات سو  
 روپے کی ملازمت دوں گا۔ تمہاری بیوی نے جو قرض لیا ہے اسے تم تھوڑا تھوڑا  
 کر کے ادا کو دینا۔“

قیس کو کچھ اطمینان ہوا۔ وہ سینٹھ برکت کا احسان ماننے لگا کہ ہسپتال سے  
 انکار ہوتے ہی اسے ملازمت مل جائے گی۔ دوسرے دن بشری پھر لئے آئی تو قیس  
 نے کچھ تبدیلی محسوس کی۔ قیس نے کہا۔

”تمہارے لباس سے بہت اچھی خوشبو آرہی ہے۔“  
 پہلے تو وہ گھبرا گئی، پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔  
 ”سینٹھ صاحب کی کار میں اتنی خوشبو ہوتی ہے کہ کپڑوں میں لگ جاتی ہے۔ ان  
 کی گاڑی ایئر کنڈیشنڈ ہے۔“

”اوہ۔“ قیس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مجھے ایئر کنڈیشنڈ بولنا آگیا۔“

”کیا مجھے اس دنیا میں رہ کر سیکھنا نہیں چاہئے۔“

اس نے جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

”آج تیرے ساتھ سیٹھ صاحب یہاں نہیں آئے، کیا گاڑی میں بیٹھے ہیں؟“

بات یہی تھی۔ وہ سیٹھ برکت کو گاڑی میں چھوڑ کر آئی تھی، اس نے کہا۔

”سیٹھ صاحب ہمارے نوکر تو نہیں ہیں کہ روز یہاں آئیں ان کا ڈرائیور لی

لایا ہے۔“

وہ پھر مطمئن ہو گیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ حالات سے مجبور ہو کر انسان اسی طرح مطمئن ہونے کا سبق سیکھتا رہتا ہے۔ وہ روز آتی تھی اور وہ روز طرح طرح کے سوالات کرتا تھا کیونکہ بشری کچھ نہ ظاہر کرنے کے باوجود اپنے اندر کی تبدیلیوں کو بوجھ نہیں سکتی تھی۔ سرے پاؤں تک اس میں عجیب نکھار آگیا تھا۔ پہلے وہ گلانی بنا کر اب رخساروں سے لہو کی سرخی جھلکتی تھی۔ چہرہ ایسا چمکتا اور بال ایسے ملائم تھے بے بہت مہنگی کریم اور شیمپو استعمال کرتی ہو۔ آنکھوں میں خوشحالی کی ایسی چمک تھی کہ قیس کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔

بائیس دن کے بعد وہ ڈسپارچ ہو کر بشری کے ساتھ ہسپتال سے باہر آیا۔ جس کو نے اسے ہسپتال پہنچایا تھا وہی کار اسے لینے آئی تھی۔ دھکا مار لے والے کی ہڈ ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب گاڑی ایک کوٹھی کے دروازے پر رکی تو قیس نے پوچھا۔

”یہ کس کی کوٹھی ہے؟“

بشری نے کہا۔ ”سیٹھ صاحب نے تجھے ملازمت کے سلسلے میں بلایا ہے۔“

وہ اپنی حسین بیوی کے ساتھ کوٹھی کے اندر آیا۔ اس کا سر آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ بشری نے اسے فوم کے ملائم صوفہ پر بٹھایا تو وہ یوں دھنس گیا جیسے دلدل میں چھوڑ دیا ہو۔ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اس قدر حیران اور پریشان تھا کہ ایک شوہر کی کوئی سوال نہ کر سکا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد وہ واپس آئی تو قیس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے سامنے بشری تھی یا اس بڑی کوٹھی کی بڑی بیگم صاحبہ تھی۔ اپنی آنکھوں پر تینیں نہیں آ رہا تھا۔



اس کے بدن کا جو لباس تھا اس کا کپڑا کسی بیرونی ملک سے منگوا یا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر جو مونگا میک اپ تھا وہ انتہائی بد صورت لڑکی کو بھی انتہائی خوبصورت بنا دیتا تھا۔ بیک بشری کا حسن کسی بناؤ سنگھار کا محتاج نہیں تھا۔ اس نے تو میک اپ کا سامان تیار کرنے والوں پر احسان کیا تھا اس کی ریشمی زلفوں کے خم ہمارے تھے کہ وہ بائیس دن کی قلیل مدت میں زندگی کے کتنے ہی خم سے گزر چکی ہے۔ جیسے ساون کا جھولا امہوا کی زلزلہ پر چلتا ہے، ویسے ہی اس کی چال میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک اداسے ناز سے ہونڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہاری بشری مرچکی ہے۔“

وہ خچ کر بولا۔ ”ہاں، مرچکی ہے۔ تم مجھے یہی بے غیرتی دکھانے کے لئے یہاں

لائی ہو؟“

”نہیں، یہ سمجھانے لائی ہوں کہ سالات سے کس طرح سمجھوتہ کیا جاتا ہے۔“

”سمجھوتہ میں نے نہیں تم نے کیا ہے۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ تم بازاری

مردوں سے بھی بدتر ہو۔“

”بدتر تو بنتا ہی تھا۔ محلے کے کتنے ہی لوگوں سے تم قرض لے چکے تھے بن کی

ادائیگی باقی ہے۔ میں جوان ہوں اور مرد کہتے ہیں کہ خوبصورت بھی ہوں۔ میں جس

کے آگے قرض کے لئے ہاتھ پھیلاتی وہ سود کے طور پر میری جوانی کا مطالبہ کرتا۔ کوئی

شریف آدمی کہاں تک شرافت سے میری مدد کرتا۔ ہسپتال کا بل سولہ سو روپے تھا۔

اگر تم نے اس دنیا کو ذرا سا بھی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے تو ایمان سے بتاؤ کہ ایک

فنان عورت کو سولہ سو روپے کی رقم کوئی یونہی دے دیتا ہے؟“

ایسے سوالات کے مقول جواب کبھی نہیں ملتے۔ اس نے غصے سے کہا۔

”تم مجھے مرنے کے لئے ہسپتال میں چھوڑ دیتیں اور خود عزت کی موت

کرتی۔“

”احتجاج کے بغیر اور اپنے زندہ رہنے کا حق مانگے بغیر صرا۔ جانور مرتے ہیں۔

بائیس دنوں میں میں نے سوچ سوچ کر راقمیں گزاری ہیں۔ تب یہ بات میرا سمجھ

نہا آئی ہے کہ غیرت کی بنیاد پر خاندانی منصوبہ بندی کی جائے اور پیدا ہونے والوں کو

اسلے کی بجائے بے غیرتوں کو مارا جائے تو یکلفت دنیا کی آبادی کم ہر جائے گی۔ صرا۔

چند ہی غیرت مند زندہ رہیں گے۔"

"اپنی بے حیائی پر پردہ ڈالنے کے لئے فلسفیانہ باتیں نہ کرو۔"

"نہیں کروں گی۔ ایسے مرحلوں پر ایک انسان کو دوسرے انسان کی مجبوری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر تمہیں صرف اپنی مجبوریاں سمجھ میں آتی ہیں تو اپنے ہی غور کرو کہ میری بے غیرتی نے تمہیں ایک نئی زندگی دی ہے۔"

وہ تلملا کر رو گیا۔ اس نے یہ زندگی نہیں مانگی تھی مگر بے غیرتی سے مانگی تو اب وہ کیا کرے؟ کیا اس زندگی کو ختم کر دے؟ ایسے تو صرف گنتی کے چند لوگ ہوتے ہیں جو غیرت کے جوش میں جان دے دیتے ہیں۔ ورنہ زندگی میں کوئی حصن نہ ہو گا۔ مسرت نہ ہو، تب بھی روتے پٹتے زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ختم نہیں کر سکتا تھا، اس نے کہا۔

"میں جب تک بے غیرتی کے سولہ سو روپے ادا نہیں کروں گا جین سے نمہ بیٹھوں گا۔"

وہ اٹھ کر جانا چاہتا تھا مگر ابھی نقاہت باقی تھی۔ اچانک اٹھنے کے باعث اس کا چکر اگیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھالنے لگا۔ وہ آپ ہی آپ دوبارہ موٹے ٹر دھنس گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بشری کی آواز جیسے بہت دور سے آرہی تھی۔ "جب تم اچھی طرح تندرست ہو جاؤ گے تو ہو سکتا ہے کہ محنت مزدور بن کر بولہ سو روپے ادا کر دو۔ مگر تم میرے اس جذبہ کی قیمت ادا نہیں کر سکو گے جس کے تحت میں نے عورت کے مقام سے گر کر تمہارے لئے یہ رقم حاصل کی۔"

وہ صوفہ کی پشت سے سرٹیک کر بڑی کمزوری آواز میں بولا۔

"تو نہ دولت، یہ کار، یہ کوٹھی اور عیش و عشرت کی خاطر خود کو گرا دیا اور نام میرا لے رہی ہو کہ یہ کچھ میری خاطر کیا ہے تم کیوں مکاری سے بانٹنا رہی ہو؟"

"اگر میں مکاری ہوتی تو تمہیں ہسپتال میں تمہارے حال پر چھوڑ کر اس ایئر کنڈیشنر گاہ میں آرام فرماتی رہتی۔ کسی کی قربانیوں کو اپنے نظریات کے زائید بنانا تو لو۔ تیس؟ جب میں تمہاری دلہن بن کر آئی تھی تو میں مکاری نہیں تھی۔ میں نے اپنا گمراہیوں سے تمہیں اپنی محبت دی۔ تمہیں اپنا جان کر اپنا سب کچھ تمہارے خواب

رہا۔ عورت زیورات کی بھوکی ہوتی ہے۔ میں نے تمہارے مسائل حل کرنے کی طرہ پر تمام زیورات بھی بیچ دیئے اور جب میرے پاس زیورات نہ رہے اور جب کے لئے صرف جوانی رہ گئی تو تم مجھے مکار کہہ رہے ہو۔“

وہ فکرت خور وہ لمبے میں بولا۔

”واقعی تم مجبور تھیں مگر اب میں آگیا ہوں۔ چلو یہاں سے واپس چلو۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”مجھے کہاں لے جاؤ گے۔ میں بائیس ون سے اس محلے میں نہیں جاؤں گا۔ اب وہاں جا کر لوگوں سے کیا کہو گے کہ میں اتنے ونوں کہاں رہی؟ پھر تم اس بات میں کماؤ گے کیا، کھلاؤ گے کیا؟ جنت میں آکر جہنم کی طرف واپس جانا محض ناوانی ہے۔ میں نے عزت کا سب سے بڑا سرمایہ واؤپر لگا کر صرف دولت ہی نہیں تجربات حاصل کئے ہیں۔ ہوس کے بازار میں عزت کا سرمایہ واپس تو نہیں ملتا مگر اس کا فائدہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔ یہ منافع تمہارے سامنے ہے۔ میں ایسی جگہ واشتہ بن کر لی ہوں، جہاں سے تمہاری ملازمت اور تمہاری رہائش وغیرہ کے انتظامات کر سکتی ہوں۔“

”مجھے ایسی ملازمت نہیں چاہئے۔“

اس بار اس کا سر نہیں چکرا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جانے لگا۔

”تم اس حالت میں کہاں جاؤ گے؟“

”جہنم میں۔۔۔۔۔ میں تم سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اب میرا تم سے تعلق ختم نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم غیرت مند ہو۔ سولہ سو کا عرض ادا کرنے کے لئے تمہیں زندہ بچا کی ضرورت ہے اور زندہ رہنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

وہ اپنا پرس تولنے لگی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

”میں تمہارا ایک پیسہ نہیں لوں گا۔“

ایسا کہتے وقت اسے خیال آیا کہ ابھی اپنے گھر جا کر ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنا ہو گا۔ اس کے لئے دواؤں کے لئے، ملازمت تلاش کرنے کے لئے، محلے والوں کا اور ملازمت تلاش کرنے کے لئے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ بشری نے کہا۔

”قرض اتارے بغیر بھوکے مرد گے تو بے غیرتی تمہاری قبر تک جائے گی۔ اگر تم سے تھوڑا قرض اور لے کر اپنی جان بٹاؤ گے اور محنت مزدوری سے قرض ادا کر دے گے تو تمہارا ضمیر تمہیں کبھی بے غیرت نہیں کہے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک ہزار روپے اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ پھر یہ اعتراض سننے سے پہلے ہی وردا زہ بند کر دیا۔ دو ساگن جو ہر شام اپنے شوہر کے لیے وردا زہ کھولتی تھی اس نے ایک داشتہ بن کر وردا زہ بند کر دیا۔ وہ اچانک ہی پورے پھوٹ کر رونے لگی۔ ہمارے ہاں ایسی بے شمار عورتیں ہیں جو شوہر کا زندگی میں ایسا سہاگ کا ماتم کرتی ہیں۔

قیس نے مکان کا کرایہ اور محلے والوں کا قرض ادا کر دیا۔ پڑوسیوں سے کہہ کر اس نے بیوی کو میکے بھیج دیا ہے۔ اس رات فرش پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر سوتے پہلے اس نے خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کیا۔ کیونکہ کرایہ اور تمام قرض ادا کرنے کے بعد محلے میں اس کی عزت رہ گئی تھی۔ اب بشری کی پھر یہ اری کرنے کی فکر نہیں۔ صرف بشری کا قرض ادا کرنے کی فکر تھی۔ اس نے ایک نئے عزم سے سوچا کہ اتنے رست ہوتے ہی یہ قرض بھی ادا ہو جائے گا۔

دو روز بعد وہ اپنے گھر سے نکل کر کام دھندے کی تلاش میں جا رہا تھا کہ دقت ایک خوش پوش ادیب عمر کا آدمی اس کا تعاقب کرنے لگا۔ قیس مین روڈ پر پہنچا۔ صدر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ جب بس چلنے لگی تو وہ شخص اس کے پاس آکر گیا۔ اس نے جیب سے گولڈ لیف کا پیکیٹ نکال کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں ڈال دیا۔

”شکریہ! میں سگریٹ نہیں پتا۔“ قیس نے انکار کیا۔

وہ اپنا سگریٹ سلاگتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

”بڑی مشکل ہے۔ ہم اچھی سے اچھی تنخواہ دیتے ہیں مگر کوئی کام کا آدمی

نہیں۔“

قیس نے چونک کر پوچھا۔

”کیسا کام؟ مناب! میں میٹرک پاس ہوں محنت سے کبھی جی نہیں چراتا۔“

لائق کوئی خدمت ہو تو آپ مجھے آزا کر دیکھ لیں۔“

اس شخص نے قیس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں، تم محنتی نظر آتے ہو۔ میں سینہ علی بھائی دلی بھائی کی کہنی کا براؤچ منیجر  
 بنا۔ کل صبح تم اپنا سرٹیفکیٹ لے کر آ جانا، کلرک کا جاب ہے۔ پانچ سو روپے ماہوار  
 اکریں گے۔“  
 بات طے ہو گئی۔ دوسرے دن براؤچ منیجر نے اپنی میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور  
 اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری طرف سے بشری کی آواز  
 نکل دی۔ منیجر نے کہا۔  
 ”ہیلم صاحبہ! قیس صاحب کی ملازمت ہو چکی ہے.....“

☆-----☆-----☆

تمام ڈاکٹر بے زار ہو کر اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ قیس لنگڑاتا ہوا ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر زبیری نے غصہ سے کہا۔  
”ہم تمہارے نوکر تو نہیں ہیں کہ انتظار میں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں۔ کہاں مرے تھے؟“

قیس نے لنگڑات ہوئے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔  
”جناب! آپ کی گاڑیوں کا ایک پیسہ پنچر سو جائے تو آپ لوگ ایک لدم نہ چسکیں۔ میری ایک نانک پنچر ہو گئی میں پھر بھی لنگڑاتا ہوا دیر سے سہی مگر یہاں تک پہنچ گیا۔“

”بیٹھ جاؤ۔“ ڈاکٹر قرآن علی نے حکم دیا۔  
وہ بڑی سی میز کے قریب ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ تمام ڈاکٹر اسے گہری نزلتی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔  
”تم قسط دار خواب دیکھتے ہو؟“

”جی ہاں۔ یہ میں ڈاکٹر زبیری صاحب کو ہٹا چکا ہوں۔“  
”ہم تم سے پوچھتے ہیں۔ تم براہ راست جواب دو کتنے دنوں سے یہ خواب رہے ہو؟“

”پانچ دنوں سے..... میں ڈاکٹر صاحب کو چار قسطیں سنا چکا ہوں۔“  
”کیا تم کسی فرم میں ملازمت کرتے ہو؟“  
”کرتا تھا گیارہ ماہ پہلے مجھے اس ملازمت سے نکال دیا گیا۔“  
”ادھوری باتیں نہ کرو۔ تفصیل سے بتاؤ تاکہ ہم تمہارے خواب کے بہانے اچھی طرح سمجھ سکیں۔“

دو میز پر دونوں ہاتھ نیک کر کئے لگا۔  
 "پانچ برس پہلے میری زندگی میں ایک حسین عورت آئی تھی۔ میں اسے صرف  
 رات کھوں گا۔ اس کا نام نہیں لوں گا کیونکہ میں اسے گالیاں بھی دیتا ہوں اور اس کی  
 زنت بھی کرتا ہوں۔"

تمام ڈاکٹر اسے حیرانی سے دیکھنے لگے، ایک نے پوچھا۔  
 "یہ کیا بات ہوئی، گالیاں بھی دیتے ہو اور عزت بھی کرتے ہو۔"  
 "اس نے مجھ سے بے وفائی کی، اس لئے منہ سے گالیاں نکلتی ہیں۔ جب یہ دیکھتا  
 ہوں کہ اس نے صرف اپنی خوشی کے لئے نہیں، میری بھی بھلائی کے لئے بے وفائی کی  
 ہے تو دل میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ میری اس دوغلی کیفیت کو یوں سمجھیں کہ کبھی  
 مہربان کام ہو کر اپنی زندگی کو گالیاں دیتے ہیں اور کبھی کامیاب ہو کر اسی زندگی پر فخر  
 کرتے ہیں۔ دراصل ہم پیدا کئی دوغلی ہیں۔"

دو لوگ بوکھلا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ایک نے جگر کر کہا۔  
 "جو اس مت کرو، آگے تیار کیا ہوا؟"

"آگے یہ ہوا کہ وہ ایک دولت مند کا ہاتھ تمام کر مجھ سے بہت آگے نکل گئی۔ اس  
 نے میرا علاج کرانے کے لئے مولہ مورو پے قرض دیے۔ جب میں ہسپتال سے آیا تو اس  
 نے ایک ہزار روپے اور ویسے تاکہ میں زندہ رہ کر قرض ادا کر سکوں۔ وہ جانتی تھی کہ  
 اس کے بعد میں اس کی طرف سے مزید امداد قبول نہیں کروں گا لہذا اس نے دوسروں  
 کے ذریعے مجھے ایک جگہ ملازمت دلادی۔"

پہلے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ملازمت بھی اسی کے طفیل ملی ہے۔ میں نے سوچا ہر ماہ  
 ۲۰ روپے بچا کر اس بے وفا عورت کا قرض ادا کرتا رہوں گا۔ جب پہلی تنخواہ لے کر میں  
 اس کی کوٹھی میں گیا تو وہ وہاں سے کسی دوسری کوٹھی میں منتقل ہو چکی تھی۔ کوٹھی کے  
 پورے کمین اس کا پتہ نہیں جانتے تھے۔ میں ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ۲۰ روپے الگ نکال کر  
 دفعتاً اور اسے تلاش کرتا رہتا تھا مگر وہ مجھے آج تک نظر نہیں آئی۔

گیارہ ماہ پہلے مجھے اچانک ہی ملازمت سے نکال دیا گیا۔ میں نے ہر انچ نیچر سے فریاد  
 کی۔ اس نے کہا۔

"تو مجبور ہوں۔ اوپر سے یہی حکم آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ ”وہ اوپر والا کسی کی رودی چھیننے کا حکم نہیں دیتا۔“

”مسٹر قیس! تم کس اوپر والے کی بات کر رہے ہو؟ ہمارے اوپر تو صرف ایک بڑا صاحب ہوتا ہے۔ اس کے نیچے کرائے کی ایک بیگم صاحبہ ہوتی ہے۔ جس بیگم صاحبہ نے تمہاری سفارش کی تھی۔ اب اس کی جگہ دوسری کرائے کی بیگم صاحبہ آگئی ہے اور اس نے تمہاری بھی چھٹی!“

کرائے کی بیگم کا ذکر آیا تو میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ وہی بے وفا عورت ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا۔

”آپ مجھے اس بیگم صاحبہ کا نام پتہ بتائیں جس نے میری سفارش کی تھی۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نے کسی بیگم کو آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ مرز فون پر گفتگو ہوتی ہے۔ مجھے اس کا نام اور موجودہ پتہ معلوم نہیں ہے۔“

بہر حال میں دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیا گیا۔ وہ سفارش کرنے والی عورت مجھ جہاں تھی وہاں سے بیٹھ صاحب لے اسے باہر تھوک دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ تھوک کس کی ہتھیلی پر گیا ہو گا اور کون اسے چاٹ رہا ہو گا؟ مجھے اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ میں ملازمت کے فریب میں آکر تقریباً تین برس تک اسی عورت کی کمائی کھاتا رہا۔ تب..... تب میں نے غصہ کی حالت میں اسے قتل کر دیا.....“

”قتل کر دیا؟“ وہ جب چونک کر بلکہ سہم کر اسے دیکھنے لگے۔

”نت..... تم قاتل ہو؟“ ایک نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! ایک رات مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں ایک چوڑے پھل کا چاقو جب ہاں رکھ کر اسے ہلاک کرنے کے لئے گھر سے نکل گیا حالانکہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کمال رہتی ہے۔ میں بس غصہ میں نکل آیا تھا۔ اگر وہ اور زندہ رہتی تو آئندہ بھی اسی طرح میرا پیٹ بھرتی رہتی۔ اس لئے میں اس قصہ کو تمام کر دیتا چاہتا تھا۔“

چلتے چلتے میں اس کو ٹھکی کے سامنے پہنچ گیا۔ جہاں ایک بار وہ عورت مجھے ہتھیل سے لے گئی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا! باہر تاریکی تھی مگر اندر روشنی نظر آرہی تھی۔ کوٹھی کے دروازے رات کو احتیاطاً اندر سے بند کر دیے جاتے ہیں لیکن وہاں کے دروازے میرے لئے کھلے ہوئے تھے۔ میں مختلف کردوں اور کاریڈور سے گزرتا ہوا اس کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔





بھاگتے بھاگتے میری سانس پھولنے لگی۔ ٹائٹلس دکھنے لگیں۔ قانون کے خلاف نہیں چھوڑ رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھاگتے بھاگتے دنیا کے ایک سرسے دوسرے سرے تک پہنچ گیا ہوں۔ تب ایک دیران سڑک کے کنارے ایک نو بھروسہ کار نظر آئی۔ چھپنے کے لئے بس وہی ایک جگہ تھی۔ میں اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ میرے قریب اسٹیزر لگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

ہائے! میں جیسے تیز دھوپ میں دوڑتے دوڑتے ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا تھا۔ اتنی حسین تھی جیسے چاندنی ایک دو شیزہ کے روپ میں مجسم ہو گئی ہو۔ وہ مجھے ہلکے نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”ہیلو!“

میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ہیلو! میرا نام قیس ہے۔ وہ لوگ مجھ پر گولیاں برس رہے ہیں۔ جلدی گاڑو۔“

اسٹارٹ کرو۔“

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گیسر بدلے پھر تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی بولی۔  
”پہلے لوگ قیس پر پتھر برساتے تھے اب گولیاں برساتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنا اسٹارٹ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میرا نام لیلیٰ ہے۔“

اتنا کہہ کر قیس خاموش ہو گیا۔ تمام ڈاکٹر بھی خاموشی سے اس کا منہ نہ دیکھتے تھے۔ سب وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولا تو ایک نے پوچھا۔

”آگے کہو۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر میری آنکھ کھل گئی۔“

”کیا؟“ تمام ڈاکٹر چیخ پڑے۔ ایک نے ناگواری سے پوچھا۔

”کیا تم اپنا خواب سن رہے تھے؟“

”جی ہاں! پہلی رات میں نے یہی خواب دیکھا تھا۔ میں نے سلسلہ دار خواب کا قسط سنائی ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قتل خواب میں ہوا تھا؟“

قیس کوئی جواب دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی ڈاکٹر زہری نے کہا۔

”نہیں سینہ برکت کی کوٹھی میں وہ سچے قتل کی گئی ہے۔“

قیس بوکھلا کر ڈاکٹر زہیری کا منہ تکتے لگے۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے خواب میں اسے قتل کیا ہے۔ اس نے پوچھا۔  
 ”ڈاکٹر صاحب! کیا آپ سیٹھ برکت کو جانتے ہیں؟“

”میں اسے نہیں جانتا۔ تم نے آج سے چار دن پہلے مجھے اپنے خواب کی پہلی قسط سنائی تھی۔ اس میں سیٹھ برکت کا ذکر تھا۔ دوسرے دن میں نے اخبار میں اس قتل کی روایت پڑھی۔ اس میں سیٹھ برکت اور اس کی متوفی داشتہ کی پوری ہسٹری بیان کی گئی تھی۔ پہلے میں نے یہی سمجھا کہ تمہیں نیند میں چلنے پھرنے کی عادت ہے۔ تم نیند کی حالت میں اس کی خواب کاہ تک گئے اور اسے قتل کر دیا۔ اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس فرد قاتل کو تلاش کر رہی ہے۔“

قیس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر زہیری نے مسکرا کر کہا۔  
 ”گھبراؤ نہیں، تمہیں نیند میں چلنے کی عادت نہیں ہے۔ تیسرے دن کے اخبار میں لکھا ہوا تھا کہ سیٹھ برکت کے جوان بیٹے نے خود کو قانون کے حوالے کرتے ہوئے بیان دیا کہ اس کا باپ سیٹھ برکت اس کی ماں کے حقوق چھین کر ایک داشتہ کو دے رہا تھا۔ بنا اپنی ماں سے ہونے والی اس نا انصافی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اس داشتہ کو قتل کر دیا۔“

قیس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لینے کے بعد سوچا۔ خواب انسان کو ابھادیتے ہیں۔ میں خواب میں بشری کو قتل کرنے گیا تھا حالانکہ وہ گیارہ ماہ پہلے داشتہ کے عہدے سے ریاست کر دی گئی تھی اور میں کلرک کے عہدے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اخبارات کے مطابق جو عورت قتل کی گئی ہے وہ بشری کے بعد آنے والی داشتہ تھی۔

ایک ڈاکٹر نے بیزار ہو کر کہا۔  
 ”ہم خواہ مخواہ قتل کے کیس پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ہمارا موضوع سلسلہ دار خواب ہے۔“

دوسرے ڈاکٹر نے قیس کو مخاطب کیا۔  
 ”تم ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی سے بتاؤ کہ دوسری رات تم نے خواب میں کیا کیا؟“

قیس کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، پھر اس نے کہا۔

”پہلی صبح جہاں سے خواب کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ دوسری رات ٹھیک وہیں سے خواب کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ میں اس کی کار میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور وہ نیڑے دراز ہو کر بیٹھ رہی تھی۔“

”پسے لوگ قیس پر چہرہ برساتے تھے اب گولیاں برساتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنا محلہ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میرا نام لیلیٰ ہے۔“

اس کا نام سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں زندگی کے صحرا میں ایک مدت سے لپکتے ہوئے بھٹک رہا تھا اور اب اپنی منزل تک پہنچ گیا ہوں۔ اس کے لباس سے بہت ہی کٹی ہوئی سی میٹھی میٹھی سی خوشبو انگڑائی لے رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے بدن کی خوشبو کبھی بگڑاؤ ہوگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم اب تک کہاں تھیں؟“

”میں اب تک تحقیق کے عمل سے گزر رہی تھی۔ قدرت کے آن دیکھے بازو میرے بدن کے سانچے میں پھولوں کا رس نچوڑ رہے تھے، میرے لبوں پر کلیوں کا پلاٹنم اور آنکھوں میں حیا کا ابدی کاجل رچا رہے تھے۔ دھنک کے سارے رنگ لے کر بین اداؤں میں بھرے گئے۔ میرے قد کو انگڑائی کی اٹھان تک لایا گیا۔ میری آرزوؤں کو سامان کے جھونے میں بٹھایا گیا۔ پھر میرے دل کو قیس کے نام کی دھڑکنیں دی گئیں۔ اس کے بعد مجھے آسمان سے اتار آگیا تو میں سیدھی تم سے ملنے چلی آئی۔“

میں نے آلودگی کی ایک طویل سانس کھینچی۔ یہی تو میں چاہتا تھا کہ کوئی میرے آسمان سے اتر کر آئے۔ زمین کی عورتیں بے وفا ہوتی ہیں۔ بے وفائے ہوں تو ہمارے گھر کے کمزور دروازے سے چرائی جاتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

”تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی؟“

”میں تمہارے ساتھ جینے اور تمہارے ساتھ مرنے آئی ہوں۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر سارے ہاں دوسروں کی عورتوں کو چرانے کا دستور ہے۔“

”تم فکر نہ کرو، مجھے کوئی نہیں چرائے گا۔“

”یہ بات تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”ایسے کہ مجھے بھوک نہیں لگتی۔ کوئی مجھے روٹی کا لالچ نہیں دے گا۔ میرا لالچ

بھی پڑایا میلا نہیں ہوتا۔ یہ ہر فیشن کے ساتھ بدلتا جائے گا۔ اس لباس کو کوئی ہوس کی نگاہوں سے نہیں اتار سکے گا۔ روٹی اور کپڑے کے بعد مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اس کی بھی فکر نہیں ہے۔ میرے چھپنے کے لئے تیرنی آغوش ہے۔ سونے کے لئے گل پش دریاں ہیں اور اوڑھنے کے لئے آسمان ہے۔“

میں خوش ہو گیا۔ اس لئے کہ اب میں خوش نصیب ہو گیا تھا۔ اب میرے پاس جو دولت آئی تھی، اسے کوئی چرا نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس کا پرے دار بن کر رہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لئے کہیں ملازمت تلاش کرنا بھی ضروری نہ تھا۔ یوں بھی حق کے معر میں قیس کو ملازمت تلاش کرنے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔“

ایک ڈاکٹر نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔

”تم خواب کا ذکر کم کر رہے ہو اور باتیں زیادہ بتا رہے ہو۔ کام کی باتیں کرو۔“

”عشق میں یہی کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ زلف و رخسار کی باتیں کرتے کرتے ہمارے ناموں نے عرس گزار دیں۔ میرا وہ دوسرا خواب بھی انہی باتوں میں گزر گیا۔ میرا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اتنا حسین خواب گزر جائے۔ مگر مجبوری تھی۔ زندہ رہ کر تیسری قسط لکھنے کے لئے محنت مزدوری کرنا ضروری تھا“ اس لئے میں کام دھندے کی تلاش میں چلا گیا۔“

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہمیں تمہارے اس رومانی خواب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم صرف اس نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں کہ تم سلسلہ دار خواب کیسے دیکھتے ہو؟ بہتر ہے کہ بدلاؤ جلد اس خواب کی قسطیں سناؤ۔“

قیس نے تیسری قسط کا آغاز کیا۔

”میں نے تیسری بار پھر خود کو لیلیٰ کی ایئر کنڈیشنڈ محل میں پایا وہ کار تھی مگر لیلیٰ اسے کی کہتی تھی۔ اس خواب میں ہم نے ایک ساتھ کئی دن گزارے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گلاب پوش وادیں اور مرغزاروں میں لے گئی۔ میں اسے شرکی تفریح گاہوں کی میر کرانا بل بل کر میں اسے ایسی جگہ لے گیا جہاں مقابلہ حسن کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ وہاں لیلیٰ کو دیکھتے ٹامب کی آنکھیں اس پر لگ گئیں۔ میں اسے تماشا دکھانے لے گیا تھا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود تماشا بنے“ میں نے کہا۔

”لیلیٰ! یہاں سے چلو، میں تمہارے جس کی نمائش نہیں کرانا چاہتا“

”ٹھیک ہے۔ میرا حسن صرف تمہارے لئے ہے۔ یہاں سے چلو۔“

ہم وہاں سے پلٹ کر جانے لگے۔ لوگوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ فوٹو گرافرز کی تصویریں اتارنے لگے۔ شر کے بڑے بڑے دولت مند اس کے آگے پیچھے بڑھے تھے۔ انہوں نے مقابلہ حسن میں شریک ہونے کے لئے لیلیٰ سے التجائیں کیں لیکن لیلیٰ نے ٹکاسا جواب دے دیا۔ یہی کہ اس کا حسن صرف قیس کے لئے ہے۔

کتنے ہی دولت مندوں نے ہیرے جواہرات کا تحفہ پیش کیا۔ سادے چمک پر دست کر کے اس کے آگے رکھ دیئے کہ وہ جتنی رقم چاہے ان پر لکھ لے لیکن وہ تمام دولت ٹھکرا کر میرے ساتھ چلی آئی۔ میں واقعی دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تھا۔ تمام دولت مند اپنی تمام دولت کا زور لگا کر بھی میری محبوبہ کو نہیں خرید سکتے تھے۔ وہاں سے ہم ایک بہت ہی شاندار ریستورنٹ میں آئے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور لیلیٰ کو کبھی بھوک نہیں لگتی تھی۔ میں نے کہا۔

”میں کھانے کے دور ان تیارہ جاتا ہوں اس لئے کہ تم ساتھ نہیں دیتیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیا کروں مجھے بھوک نہیں لگتی۔ دیے ان کھانوں سے اتنی اچھی منک آتی ہے کہ پچھنے کو جی چاہتا ہے۔“

”تو پھر میرا ساتھ دینے کے لئے ذرا کچھ لیا کرو، بشرطیکہ تمہارا معدہ ان کھانوں قبول کر سکے۔“

”میرے جسم کے باہر اور اندر کوئی خرابی یا کمزوری نہیں ہے اس دنیا کی کوئی تیارہ مجھے چھو نہیں سکتی۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ آؤ بسم اللہ کرو۔“ وہ پہلی بار میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئی۔ اسے کھانا بہت پسند آیا۔ وہ بہت آخری لقمہ تک میرا ساتھ دیتی رہی۔ جب ہم ریستورنٹ سے باہر آئے تو اس پر عجیب نشہ طاری تھا۔ وہ میرا سارا لئے مستی میں لڑکھڑاتی ہوئی ہنستی بولتی جا رہی تھی۔ چہ لیں ہماری کار کہاں رہ گئی تھی۔ خوابوں میں اکثر اس بات کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہم ایک سے دو مری جگہ کیسے پہنچ گئے؟

ہم اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ اب سے پہلے ہم کسی خواب گاہ میں نہیں تھے۔ ہمارے دل ایک تھے مگر جسموں کے درمیان فاصلہ تھا۔ یعنی ہم ایک دوسرے

لی پکڑتے تھے لیکن پہنچے تک نہیں پہنچتے تھے۔ اس رات وہ بے اختیار میری طرف کھنچی لی آئی۔ میری گردن میں اپنی مرمریں بائیں ڈال کر کہا۔ ”پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔“  
 بادشاہ میں ایک مرد سا چھایا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تم سے چپک باؤں۔ تمہارے  
 درمیاں جاؤں۔ تم نے مجھے کہا کھلا دیا ہے؟“  
 تب مجھے اپنا غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے گندم کی روٹیاں کھلائی

”تمام ڈاکٹر گم سم بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر ان کے اندر چٹھی چٹھی سی بے چینی تھی۔ وہ  
 ایام کے نتائج معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ایک ڈاکٹر لے پوچھا۔  
 ”پھر کیا ہوا؟“

”پھر میری آنکھ کھل گئی۔“  
 تمام لوگ اسے جھٹا کر دیکھنے لگے۔ قیس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اکثر قسطنطین ایلے  
 ہم پر ختم ہوتی ہیں جہاں سے ایک نئے سپنس کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے بڑے  
 قلم سے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ خواب کا سلسلہ جہاں ختم ہوا ہے، چوتھی قسط میں ٹھیک دیں سے  
 شروع ہو گا۔ ہاں تو قیس چوتھی قسط سناؤ۔“

قیس نے کہا۔ ”چوتھی قسط میں واقعات نے چھلانگ لگائی۔ اب ہم خواب گاہ میں  
 نہیں تھے۔ یعنی بعض اوقات خوابوں میں پتہ نہیں چلتا کہ ہم کہاں وقت گزار رہے ہیں۔  
 برہنہ اب لیل کے بدن پر آسانی لباس نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے دامن پر گندم کے چھینٹے  
 پڑ گئے تھے۔ اب وہ موجودہ فیشن کی تراش کے مطابق چست لباس پہنے ہوئے تھی اور  
 ہم اردو اور انگریزی رسالے دیکھ رہی تھی، بن کے مرد رقص پر اس کی رنگین تصویریں  
 فون کی جلی تھیں۔“

وہ رنگین تصویروں میں پہلی بار خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی تعریف  
 لکھا جو کالم لکھے گئے تھے، انہیں پڑھ پڑھ کر خوشی سے جھوم رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا  
 کہ عمارتے چاروں طرف ٹیلیفون کی گھنٹیاں جینگ رہی ہیں۔ لیل باری باری ہر فون کار ایسور  
 لکھ رہی تھیں کرتی تھی۔ تمام غلی فون اس کے حسن کے قصیدے گنگتا رہے تھے۔ میں نے  
 مبرا کر کہا۔

”یہ آدڑیں نہ سنو، یہ سب تمہیں بھکا رہے ہیں۔“

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”تم ناحق پریشان ہو جاتے ہو۔ اگر میں تھوڑا سا کھانا کھا کر  
لباس بدل لیتی ہوں اور اپنی تعریفیں سن کر ذرا خوش ہو جاتی ہوں تو اس میں برا کیا ہے؟“  
میں جواب نہ دے سکا اس لئے کہ ہر انسان کو خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔  
خواب کا منظر بدل گیا۔ میں نے دیکھا لیلیٰ کو نت نئے فیشن کے لباس اور نئے  
کے زیورات پہننے سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ بڑی بڑی تقریبات میں چلی آ رہی  
انٹل اور مووی کیمرے اس کے آگے پیچھے گھومتے رہتے تھے۔ روشنیوں کے سلسلے  
اس کا حسن نئے نئے روپ میں اجاگر ہو رہا تھا۔

میں نے اسے آواز دی۔ ”لیلیٰ! تم گرداب میں پھنس رہی ہو۔ واپس آ جاؤ۔“  
آرکسٹرا کے شور اور رقص کی مستی میں وہ میری آواز سن نہ سکی۔ میں نے  
سے چیخ کر آواز دی تو میری آنکھ کھل گئی۔

ایک ڈاکٹر نے کہہ ”رکنے کی ضرورت نہیں ہے غوراً ہی پانچویں قسط سناؤ۔“  
”پانچویں قسط یہ ہے کہ تعریفوں کے ہجوم میں لیلیٰ نظر نہیں آئی۔ میں نے اس  
تلاش کیا تو پتہ چلا کہ چیرس کی ایک بہت بڑی پرفیومری کمپنی نے اسے عصرانہ جاب  
دوسری بار خبر ملی کہ لندن کے ایک بہت بڑے ٹائٹ کلب میں اس کے لئے ڈز کاٹھ  
کیا گیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ ہالی ووڈ کے تمام کیمرے اس کے لئے آنکھ کھولنے کا انتظار  
رہے ہیں۔

یہ کیا ہو گیا؟ میری لیلیٰ میرے ہاتھ سے کیسے نکل گئی؟ وہ دوسری عورتوں کی طرح  
روٹی، کپڑے اور مکان کی محتاج نہیں تھی وہ دنیا کی ساری دولت کو ٹھکرا دیتی تھی۔  
اس دنیا کے بازار میں کیسے بیک گئی؟

کافی سوچ بچار کے بعد یہ گیان حاصل ہوا کہ عورت ہل و زر کی بھوک نہیں  
وہ محض تعریف کے ایک فقرے سے کھل جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے اور اپنی اولاد  
بلاشبہ محبت کرتی ہے۔ مگر اس کے اندر جو سب سے مضبوط اور مستحکم محبت ہوتی ہے  
اپنی ذات سے ہوتی ہے۔ اپنی تصویروں سے ہوتی ہے اور اپنے گھر کے آئینے سے۔

مرد ایک آئینہ ہے جس کی آنکھوں میں عورت اپنے حسن کا عکس دیکھتی ہے۔



ایک کا سرخ لگاتی ہے۔ جو مرد آئینہ بن کر تعریف نہیں کرتا، اسے گھر کی مرغی وال برابر سمجھتا ہے، اس کی عورت بے خبری میں آہستہ آہستہ دوسرے آئینوں میں اپنی ذات کا پتہ ڈھنڈھتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے جو عودت میرے پاس تھی، میں بڑی کنجوسی سے بھی سمجھی اس کی تعریف کرتا تھا۔ دوسری لیلیٰ تھی وہ غریب نہیں تھی، مجبور نہیں تھی۔ دو مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتی اگر میں تعریف کے کرنسی نوٹ اس پر لٹاتا رہتا۔

بت کچھ لٹانے کے بعد عقل آتی ہے۔ مجھے بھی عقل آگئی ہے۔ اب میں ایک نہیں لیلیٰ کا خواب نہیں دیکھوں گا۔ یوں بھی لیلیٰ کالی تھی۔ اب میرے خواب میں ایک کالی کھوٹی اور بد صورت محبوبہ آیا کرے گی۔ وہ دہلی پتلی بیمار ہوگی۔ اسے کوئی مجھ سے جھین کر نہیں لے جائے گا.....“

”غصہ۔“ ایک ڈاکٹر نے کہا۔ ”تم کہتے ہو کہ اپنی مرضی سے کسی تیسری محبوبہ کو خواب میں دیکھو گے جبکہ یہ ناممکن ہے۔ خواب اپنے حالات اور ماحول کے مطابق خود بخود آتے ہیں۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنی مرضی کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔“

”ضرور دیکھ سکتا ہے۔“ قیس نے کہا۔ ”جیسا کہ میں دیکھتا ہوں۔“

”تم پاگل ہو، ہمارا وقت ضائع کرنے آئے ہو۔“

”میں پاگل نہیں ہوں۔ آپ جیسے تمام ماہر نفسیات کو سمجھانے اور سکھانے آیا ہوں۔ آپ انسانی نفسیات کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ جو لوگ اپنی مرضی سے روٹی حاصل نہیں کر سکتے، اپنی مرضی سے اپنی آمدنی نہیں بڑھا سکتے وہ اپنی مرضی سے خوابوں میں آمدنی بڑھا لیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کے لئے شیش محل بنا لیتے ہیں اور اس دنیا کے ہنگے بازار سے اپنی ضروریات کی ہر چیز خرید لیتے ہیں۔“

ڈاکٹر زبیری نے ڈانٹ کر کہا۔

”کیوں است کرو۔ تم سلسلہ وار خواب قسطوں میں نہیں دیکھتے ہو۔ تم جو بٹ کر رہے تھے۔“

قیس نے کہا۔ ”وہ خدا جو واحد ہے، لاشریک ہے اور ہماری طرح خوابوں کا محتاج نہیں ہے، میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک نقطہ بھی جھوٹا نہیں کہا۔“

میں خدا کو حاضر و ناظر نہان کر کہتا ہوں کہ میں اور مجھ جیسے دنیا کے تمام غریب، دین

رات قسطوں میں خوشحالی کے خواب دیکھتے ہیں۔

جب زندگی کی ضرورتیں ڈانٹنے لگتی ہیں تو خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک ٹکڑا ہو جاتی ہے اور جب محنت مزدوری سے فرصت ملتی ہے تو پھر اسی خواب کی دوسری طرف شروع ہو جاتی ہے۔

آپ لوگوں نے انسانوں کو سمجھنے کا علم حاصل کیا ہے تو آپ کو یہ علم ہو گا کہ ہمارے زندگی میں کوئی خوشی تسلسل سے نہیں آتی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے آتی ہے اور زیادہ دیر کے لئے جاتی ہے۔ یہ امید لگا کر کہ وہ آئندہ قسطوں میں آیا کرے گی۔

اس دنیا کی کوئی نعمت ہم اپنی مرضی سے حاصل نہیں کر سکتے۔ صرف یہ کہ خواب ایسے ہیں جنہیں ہم اپنی مرضی سے اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق دیکھتے ہیں۔ اور نہ دیکھیں تو دوسرے ہی لمحے پھر پھرا کر مرجائیں۔

تمام ڈاکٹر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے دوسرے جھٹکے سے وہ اس کے فہرے آئے پھر اس کی پٹائی کرنے لگے۔

”الو کا چٹھا! نچلے طبقے کا فلسفی ہے اے مارو اور دھکے دے کر نکال دو۔“

اے دھکے دے کر عمارت سے باہر پھینک دیا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سڑک کے کنارے کچرے کی طرح پڑا رہا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ ماکے اور پاجاموں سے لمبوس رہا تھا۔ واڑھی بو بھی ہوئی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ بہت غور سے دیکھ کر وہ تھوڑا تھوڑا سا انسان نظر آتا تھا۔

رات تاریک تھی۔ رات تو تاریک ہوتی ہی ہے مگر حالات کے جوئے کھلنے کے بعد آنکھوں کے سامنے اندھیرا کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر انگڑاٹا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے سہرا پر اب اپنا خواب کسی کو نہیں سنائے گا۔ اپنے خواب کا حسن خصل اپنے آپ کو ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کراہتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کی جیب میں روک ٹوک کی سی پیسے نہیں تھے مگر وہ بالکل خالی نہیں تھا۔ بس میں بیٹھ کر آرام سے بہا رہا تھا۔ پہنچ سکا تھا لیکر، بہار کالونی کے مکان میں وہی قید تھائی ہوتی اور بشری یاد آتی رہتی۔

سے بھلائے کے لئے ہی وہ کسی لیلیٰ کو پکارتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ارادہ تھا۔ مڑک کے کنارے چلتا رہے گا اور ایک نئے خواب کی پہلی قسط دیکھتا رہے گا۔ چلے چلے ناظم آباو کے پل پر آگیا۔ پل پر کہیں لیپ پوسٹ روشن تھے اور کہیں اندھے ہوئے تھے۔



”کون ہو تم؟“

پھر وہی آواز، وہی لہجہ..... قیس کو تسلیم کرنا پڑا کہ بشریٰ مل گئی ہے۔ تمام زندگی بھاگتے بھاگتے جس طرح انجام کار بڑھا پے کی جھریاں ملتی ہیں، اسی طرح بشریٰ مل گئی ہے۔ اس نے کہا۔

”ہمارے چہرے بگڑ گئے ہیں۔ میں نے تمہیں آواز سے پہچانا ہے۔ تم بھی مجھے آواز سے پہچان سکتی ہو تو پہچان لو۔“

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ آواز سے پہچانتے ہی پھر رہی وہ شروع ہو گیا۔ بیٹ کا درو بھی تھا، دل کا درو بھی تھا، ماضی کے تمام زخم ہرے ہو گئے تھے۔ ”بشریٰ! تو کہاں کھو گئی تھی۔ میں تجھے گالیاں دیتا تھا اور تیرلی تلاش میں بھٹکا کھ رہتا تھا۔ مجھے بتا، یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے؟“

دو درو سے ترپتی رہی۔ اس اندھیرے میں یوں لگ رہا تھا جیسے تاریکی ایک زخمی چٹیل کی طرح کراہ رہی ہے اور اپنی کالی زبان سے اپنا فسانہ بنا رہی ہے۔

”میں وقت سے پہلے بوڑھی اور بے کار ہو گئی۔ یہ تو کل ہی کی بات ہے کہ میرے حسین بھی تھی اور جوان بھی۔ پانچ برس پہلے تمہاری ولسن بن کر آئی۔ میں اپنی بولنی کے لحاظ کو انگلیوں پر گن سکتی ہوں ایک برس دس ماہ کے بعد میں سہاگن کے بجائے دائہ بن گئی۔ سیٹھ برکت دو برس دو ماہ تک میرے قدموں میں لوٹا رہا۔ پھر ایک دن میں غا میں مبتلا ہو گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بچک کے آثار ہیں۔ مجھے فوراً ہی شہر سے دور ترانہ بند بھیج دیا گیا۔ میں چھٹی چلائی رہی کہ وہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ مگر چھوٹ کی بیماری لکھا ہوتی ہے۔ ایسے وقت جوانی کے خریدار رشتہ توڑ لیتے ہیں۔“

تقریباً بیس دن بعد میں نے صحت یاب ہو کر آئینہ دیکھا تو مارے وہشت کے پڑی۔ زندگی میں پہلی بار آئینے نے میرے مثالی حسن کا مذاق اڑایا۔ مجھ سے میرے چہرے کو چھپا لیا اور یہ موجود چہرہ دکھا کر ڈرانے لگا۔ اس روز میں بہت روٹی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بشریٰ جیسی حسین عورت کی موت پر مجھے ماتم کرنا پڑے گا۔ دوسرے دن سیٹھ برکت آیا تو وہ بھی مجھے دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے منہ پھیرا جلدی سے سو سو کے نوٹ نکالے۔ پھر ان نوٹوں کو میری گود میں پھینک کر کہا۔

”مجھے ضروری کام ہے تم ٹیکسی میں چلی آنا.....“

”میرا جواب سنے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اسے آواز دی۔ جواب میں نے کار کے اشارت ہونے کی آواز سنائی دلی۔ اس رات میں کسی طرح اس شہر میں واپس آئے۔ سیٹھ برکت کی کوٹھی میں گئی۔ وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ کوٹھی کے چوکیدار نے مجھے پہنچنے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا۔

”میں اس کوٹھی کی بیگم صاحبہ ہوں۔“

اس نے مجھے دھکا دے کر کہا ”ہاں صرف دھکے کھانے والی بیگمات آتی ہیں۔“

انہی دن میں سیٹھ برکت کے دفتر گئی۔ وہاں مجھے کسی نے عمارت میں داخل ہونے میں دیا۔ آؤ نہ میں کوٹھی کی رہی، نہ جھگی کی، نہ دین کی رہی، نہ دنیا کی.....“

دو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ درو پھر کروٹیں بدلنے لگا۔ قیس نے پوچھا۔

”یہ بچہ کس کا ہے؟“

”حق باتھ کے رہنے والوں کا ہے۔ کوٹھی ے جو بچا کھچا پھینکا جاتا ہے اسے فٹ فٹ والے ہی کھاتے ہیں۔ قیس میں تمہیں حد دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”دیے تو میں بھی حد دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میرے بازو مضبوط ہوتے، اگر تمہارے تحفظ کا سامان کر سکتا تو تم یہاں تک نہ پہنچتی۔ تم بے وفا بن کر بھی مجھ سے ٹالو ٹالو رہی۔ میں تمہارا قرضدار ہوں۔ اب سارا قرض ادا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اٹھو میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ بدنامی بن کر نہیں جاؤں گی۔“

”بدنامی کیسی؟ تم میری بیوی ہو۔ میکے سے واپس آگئی ہو۔ دنیا والوں کے سامنے نہ کی باتیں بنا کر جاسکتی ہیں، اور سب میں تمہارا شوہر ہوں تو یہ ہونے والا بچہ بھی میرا ہے۔ بڑی میری بات مان لو۔ مجھے قرض کا بوجھ اتار دے۔“

”محبت سے اور ندامت سے ٹوٹ گئی۔ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ قیس نے اسے ذرا دیر رونے کی مہلت دی۔ پھر اچانک ہی قہقہہ لگانے لگا۔ بشری نے چومک کر ہنسنے لگا۔

”تم کیوں ہنس رہے ہو؟ کیا مجھ پر ہنس رہے ہو؟“

”تم پر نہیں، دنیا والوں پر ہنس رہا ہوں۔“

اس نے بات ادھر ہی چھوڑ کر دیا سلائی کی ایک تیلی روشن کی۔ اس روشنی میں  
 لیلیٰ کو دیکھا۔ پھر مطمئن ہو کر بولا۔  
 ”اب کوئی خریدار تجھے چھیننے کے لئے نہیں آئے گا.....“

☆-----☆=====☆

# بوڑھی جوانی

بوڑھے کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے ایک بوڑھے کی دلچسپ کہانی۔  
مذرت نے ایک نکل کے عوض اس کی جوانی واپس کر دی تھی۔  
الٹاناک انجام کی فکر انگیز کہانی۔

بڑھاپا ایسا ہوتا ہے۔ ایک جگہ چوٹ لگے تو دوس جگہ سے ٹیسس اٹھتی ہیں۔ بڑھاپے نے پیچھے دھکا دیا تھا اور بیٹے نے آگے بڑھ کر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ طمانچہ گال پر لگاؤ نہ کرے۔ بوڑھے باپ کو ایسا لگا تھا جیسے مرے پاؤں تک اس کے جسم پر ہتھوڑے برسائے گئے ہوں۔ وہ چکر کر فرش پر گر پڑا۔

جس زمین پر وہ گرا وہ زمین اس کی اپنی تھی۔ چاروں شانے چت ہو کر وہ جس کو تھکی کی چھت کو دیکھ رہا تھا دو کو تھکی بھی اس کی ملکیت تھی اور جس بیٹے نے اسے طمانچہ مارا تھا وہ بیٹا بھی اس کے اپنے خون کے ایک قطرے سے تخلیق ہوا تھا۔ اس نے بڑھاپے کے باعث دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

”تو نے مجھے نہیں مارا، میرے بڑھاپے نے مجھے مارا ہے۔ اگر میں تیری طرح جوان ہوتا تو ایک ہی گھونسلے میں تجھے ٹھنڈا کر دیتا۔ کیا تو بھول گیا کہ میں اپنی جوانی میں اپنے وقت کا ایک ناقابل شکست باکسر تھا؟“

بیٹے نے شراب کے نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تو جب تک زندہ رہے گا پاپا جوانی کو یاد کر کے بڑبڑاتا رہے گا۔ صبح سے رات گئے تک تیری بکواس سن سن کر ہمارا کان پک گئے ہیں۔ میرے بے وقوف ڈیڑی! تیری جوانی اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تجھے تو اب مرجانا چاہیے۔ مگر تو ہے کہ مرنے کا نام تک نہیں لیتا ہے۔“

”ہر چیز اپنے مقررہ وقت پر فنا ہوتی ہے۔ مگر مجھے وقت سے پہلے مارنے کے لئے بڑھاپا نے آج میرے دودھ میں زہر طاردیا۔“ وہ کراہتے ہوئے فرش پر سے اٹھنے لگا۔ ”آداب بڑھاپا!..... بسو کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ضرور دودھ کچھ کالا ہے۔ جو بسو سوکھی روٹی اور باسی سالن کھلاتی آئی ہے وہ آج دودھ سے بھرا ہوا گلاس نے کر آئی تھی۔ میں میں بوڑھا ضرور ہوں، مگر میرا دماغ بوڑھا نہیں ہے۔ یہ بوڑھے جوانوں سے زیادہ سوچتا ہے اور سمجھتا ہے۔ بسو گلاس رکھ کر گئی تو میں نے وہ دودھ لیا تو



رہا۔ آہ! بے چاری کیسے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اری او عالم ہوا! میرے سینے میں دل نہیں  
 پھر ہے۔ ارے او شرابی بیٹے! جو عورت دولت اور جائیداد کے لالچ میں تیرے باپ کو زہر  
 دے سکتی ہے، وہ ایک دن اسی لالچ میں تجھے بھی زہر دے کر ہلاک کر دے گی۔“  
 وہ پلٹ کر باہر جاتے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ انکار کی صورت میں ہلاتے ہوئے

بولے۔ ”نہیں نہیں۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ اس گھر میں گزرنے والا ایک  
 ایک لمحہ زہر ملا ہے۔ کوئی بھی لمحہ میری لاعلمی میں مجھے دس نے گا۔“  
 بیٹے کا ایک طمانچہ کھا کر اس کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ وہ جھکے جھکے ڈنگاتے  
 ہوئے قدموں سے کونٹھی سے باہر آگیا۔ باہر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی عالی شان  
 کونٹھی کو دیکھتے ہوئے حسرت سے کہا۔ ”میں نے باکسنگ میں بڑی بڑی رقبیں جیت کر یہ  
 عالی شان کونٹھی بنائی تھی اور بڑھاپے میں آرام سے زندگی گزارنے کے لئے بہت سی  
 دولت جمع کی تھی۔ مگر یہ بھول گیا تھا کہ بیٹا جوان ہو کر مجھے ایک ہی طمانچے میں ناک  
 آڑے کر دے گا۔ اے دولت مند لوگو! میری نصیحت کو غور سے سنو۔ اپنی ساری دولت  
 اپنی جوانی میں ہی خرچ کر ڈالو۔ ڈاکو تمہیں لوٹنے آئیں تو قانون تمہاری حفاظت کرتا ہے  
 لیکن اولاد بونٹے پر آئے تو وہی قانون منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ میرے بیٹے اور ہونے بھی  
 یہی کیا۔ پہلے بڑی محبت سے تمام دولت اور جائیداد اپنے نام لکھوائی۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے  
 بوڑھا جھپٹی اور پاگل ثابت کرنے لگے۔ اب میں کسی سے کہوں گا کہ میری ہونے مجھے  
 زہر دینے کی کوشش کی تھی تو لوگ مجھے بوڑھا جھپٹی کہیں گے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا  
 کہ اتنی خدمت گزار ہو کبھی ایسی خالماں حرکت کر سکتی ہے، اور میں کسی سے طمانچہ  
 کھانے کا ذکر نہیں کر سکتا۔ اس میں میری ہی تو ہین ہے، میرا ہی قصور ہے۔ میں نے طمانچہ  
 مارنے والا بیٹا کیوں پیدا کیا تھا؟“

یہ کہہ کر اس نے سر دھو آہ بھری اور بڑبڑاتے ہوئے بیچ سڑک پر آہستہ آہستہ چلے  
 گئے۔

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں پھر سے جوان ہو جاؤں اور بیٹے کو طمانچے کا جواب ایک  
 گونے سے دوں۔ میری واپس آنے والی جوانی کا ایک گھونسا اس ستر دست اور توانا بیٹے  
 کو چاروں تک ہسپتال میں سلا کر رکھے گا۔“

صد افسوس کہ انسان کے تمام اصول اور قانون بدل سکتے ہیں لیکن قدرت کا قانون نہیں بدل سکتا۔ میں بڑھاپے سے جوانی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔

وہ سوچتا ہوا اور زیر لب بڑبڑاتا ہوا اتنی دور تک چلا گیا کہ اس کا پردہ پلا تھک کر بانپے لگا۔ وہ ایک پارک کے بیچ پر اپنی سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ پارک میں اچھی خاصی چمپل پھل تھی۔ حسین عورتیں اور خوبو سرو ہر شو ہنستے بولتے نظر آرہے تھے۔ پارک کے مختلف گوشوں میں نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے جوانی کی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ ماحول اتنا رنگین اور پُر کیف تھا کہ اسے پھر اپنی جوانی یاد آئے گی۔

جوانی نے جوان گلابو کی یاد دلائی۔ گلابو ایک گلابی رنگت کی تیز طرار حسین عورت تھی۔ پھلچھڑی جیسی چنگاریاں بکھیرتی جوانی کو جب وہ سجا ہٹا کر مجرا پیش کرتی تو تماش بین لوٹ پوٹ ہو کر نوٹوں کی بارش کرتے تھے۔ وہ بھی اپنے بڑھاپے کی کمزور لاش کو اٹھائے کوٹھے پر جاتا تھا مجرا ختم ہونے کے بعد وہ گلابو کے جوان گد رائے ہوئے زانو پر سر رکھ کر تمام رات سوتا تھا (صرف سوتا تھا) صبح اٹھ کر سو مو کے پندرہ نوٹ اس کی گود میں رکھ کر چلا جاتا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بوڑھا عیاش تھا۔ نہیں یہ دنیا والے غلط سوچتے ہیں۔ ان دولت مند بوڑھوں کے سلسلے میں سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بڑھاپے کا دکھ بھلانے جاتے ہیں۔ جب ساری دنیا کے نوجوان انہیں بوڑھا بے کار اور ناکارہ سمجھنے لگتے ہیں تو زمین کے اس سرے سے اس سرے تک صرف طوائف ہی ایک ہستی ہوتی ہے جو چند نوٹوں کے عوض اپنی جوانی کا تھوڑا سا حصہ انہیں سر رکھ کر سونے کے لئے دیتی ہے۔

بوڑھے نے دور اٹھلا کر چلنے والی حسین عورتوں کو دیکھا۔ پھر بوڑھوں کی حالت کے مطابق بڑبڑانے لگا۔ ”اب مجھے اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ جب سے میں بوڑھا ہوا ہوں تب سے جوانی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور ہانپتی ہوئی آواز سے اپنی جوانی کو واپس بلا رہا ہوں۔ میں گلابو کے زانو پر سر رکھتا تھا کہ اس کے شبابی بدن کی حرارت مجھ تک پہنچتی تھی۔ اگرچہ میرا جسم بوڑھا ہی رہتا تھا مگر نیلا لات بڑبڑا کر جوان ہو جلتے تھے۔ ارے دنیا والو! ہم بوڑھوں کو اتنا تو جینے کا حق دو کہ ہم خیالوں کی دنیا میں جوان ہو کر زندہ

راہیں۔  
 کاش! اس وقت میری جیب میں سو سو روپے کے پندرہ نوٹ ہوتے، میں گلابوں کے پاس چلا جاتا۔ وہ تمام نوجوانوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ پسند کرتی۔ کیونکہ میں ایسا گاہک ہوں جو اس کی جوانی کو نہیں چھیڑتا۔ اس کے بدن کو میلا نہیں کرتا۔ میں صرف اس کے زانو پر سر رکھ کر سوتا ہوں اور اس کے عوض ایک بھاری رقم دیتا ہوں۔ دوسرے نوجوان جو گلابوں تک نہیں پہنچ سکتے، وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتے ہیں۔ اس طرح میری انانیت کی تسکین ہوتی ہے کہ وہ مجھے بھی جوان سمجھتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنا رقیب کیوں سمجھتے؟“  
 اس کی بڑبڑاہٹ اچانک ہی ختم گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک قوی بیکل جوان کھڑا تھا۔ جوان نے بوڑھے سے کہا۔

”میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ کیا تم مشہور زمانہ باکسر نہیں ہو؟ تمہارا نام مراد علی ہے۔“  
 مراد علی یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگا کہ اس کا کوئی قدر دان اس مصیبت کے وقت اس کی مدد کرنے آپہنچا ہے۔ اس نے بوڑھی اور کمزور آواز میں کہا۔  
 ”ہاں بیٹا! میں مراد علی ہوں اور کبھی ایک ناقابل شکست باکسر تھا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی نوجوان پینتڑا بدل کر اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھ کر ہانگ لڑنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پھر اسے للکارتے ہوئے بولا۔

”میرے پرانے دشمن! پی ریڈی! آج میں تجھے ناک آؤٹ کروں گا۔“  
 مراد علی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ٹھہرو رک باؤ! تم میرے بچے کے برابر ہو۔ بھلا میری تمہاری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

نوجوان نے کہا۔ ”ہماری دشمنی براہ راست نہیں ہے۔ یا کرو! تمہارے عروج کے نالے میں ایک اور رستم نامی بہت ہی ناسور باکسر تھا۔“

”ہاں مجھے یاد آگیا۔ رستم واقعی ایک زیروست باکسر تھا لیکن میں نے تیسرے ہی راؤنڈ میں اسے زمین دکھا دی تھی۔“

”گو، اس بہت کرو۔“ نوجوان نے دھاڑ کر کہا۔ ”وہ میرا باپ تھا۔ اپنی شکست اور نوین برداشت نہ کر سکا، چند ہی دنوں بعد مر گیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کی توہین اور اس کی موت کا بدلہ تجھ سے لوں گا، لیکن اس وقت میں بارہ تیرہ برس کا تھا، تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں بھی بیوی و بچہ باکسر ہوں۔“

”مگر اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ پہلے تو میرے مقابلے کے قابل نہیں تھا۔ اب میرا  
تیرے مقابلے کے قابل نہیں ہوں۔ کیا تجھے دکھائی نہیں دیتا کہ میری کمر جھک گئی ہے۔  
میرے ہاتھ پاؤں بظاہر مضبوط نظر آتے ہیں، مگر یہ اندر سے کھوکھلے اور کمزور ہیں۔“

”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ دقت نے تجھے کھوکھلا اور کمزور بنا دیا ہے اور تم  
میرے نام لکھ دی ہے۔ لی ریڈی۔“

مراد نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ جوڑ توڑ کا مقابلہ نہیں ہے۔ میں تجھ سے مقابلہ نہیں کروں گا۔ میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔ اگر انصاف سے انتقام لینا چاہتا ہے تو میرے مقابل کسی بوڑھے کو لا کر کھڑا کر دے۔“

”بوڑھے باکسر۔ اقسام کبھی انصاف سے نہیں لیا جاتا۔ لے منجھال میرا گھونسہ.....“

نوجوان نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹاک پر گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ مراد نے بڑھاپے کے باوجود عادتاً اس سے زیادہ پھرتی دکھائی۔ اس کا سر آپ ہی آپ اوپر اٹھ گیا اور نوجوان کا گھونسا اس کی ٹھوری کے نیچے سے گزر گیا۔

نوجوان سمجھ گیا کہ وہ بوڑھا بالکل ہی گیا گزرا نہیں ہے۔ قدرتی طور سے کمزور ہو گیا ہے لیکن ایک باکسر کی حادث کے مطابق ذہنی طور پر اب بھی پھرتیلا پن موجود ہے۔ اس نے سنبھل کر پینچنگ شروع کی۔ مراد اس کے ہر پینچ کو رد کیا گیا لیکن نوجوان پر بار بارانہ حملے نہ کر سکا۔ اگرچہ وہ دونوں قدم کے لحاظ سے برابر تھے مگر مراد کی کمر بڑھاپے سے ایسی جھکی ہوئی تھی کہ اس کا مکانو نوجوان کے چہرے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ایک رائیڈ تین منٹ کا ہوتا ہے۔ تین منٹ ہو چکے ہیں۔ اب ذرا درستی کرنے کا وقفہ دو۔"

وہ یہی سمجھ کر سست پڑ گیا کہ بانگ کے قاعدے کے مطابق وقفہ ہو گا کہ بوجہ احوال نے ایک زبردست گھونٹہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ بوڑھے کی جیسے سانس رک گئی۔ آنکھوں کے سامنے اچانک ہی دنیا تاریک ہو گئی پھر وہ چکر اکر گر پڑا۔

نوجوان ایک سے دس تک گھنٹے لگا دس کے بعد بھی وہ نہ اٹھ سکا تو اس نے جبکہ  
 کر اسے دیکھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے حقارت سے اسے ٹھوکر مار کر کہا۔  
 ”اڈنہ۔“ ماسٹے نے جی بھر کر انتقام لینے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ ایک ہی گھونٹے سا

مدا ہو گیا۔ اچھی بات ہے۔ اگر یہ زندہ رہ گیا تو پھر کسی دن اس کی مرمت کروں گا۔ یہ دعا میرے گھونے کھا کر ہی مرے گا۔“

یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ بوڑھا تقریباً دس پندرہ منٹ تک بے حس و حرکت پڑا۔ اس کی آدمی موت واقع ہو چکی تھی۔ پھر وہ رفتہ رفتہ لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا اور پٹے سے کراہنے لگا۔ ذرا دیر بعد وہ اس بحال ہوئے تو آنکھیں کھول کر اپنے اطراف بے غما کر دیکھنے لگا۔

اسے یاد آ گیا کہ یہ دنیا صرف مغرور نوجوانوں کی ہے اور اس دنیا میں اسے صرف بڑا اور گھونے مل رہے ہیں۔ اپنے بڑھاپے اور اپنی توہین پر اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ اس نے زمین پر لیٹے ہی لیٹے کھلے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”خدا یا! یہ کیسا ظلم ہے؟ تو انسان کو بوڑھا کیوں کر دیتا ہے۔ تیرے پاس انسانوں کے لئے جوانی کا ذخیرہ ہے وہ خالی تو نہیں ہو گیا ہو گا۔ میں تیری رحمت کو بکارتا ہوں۔ اس زمانے سے تھوڑی سی جوانی مجھے دے دے۔ میں بڑھاپے کی ذلیل موت مرنا نہیں چاہتا۔ بری یہ آرزو پوری کر دے میرے رحمان درحیم۔ اس کے بعد میں کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ آہ! ایک جوان بیٹے کا طمانچہ بوڑھے باپ کے گل پر ابھی تک سلگ رہا ہے۔ کہیں میں احساس توہین کی شدت سے مرنے جاؤں۔“

دو پھونٹ پھونٹ کر رونے لگا۔ پارک میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی سسکیوں کی آوازیں ابھرتی تھیں۔ خاموش آسمان چاند کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت پر ستاروں کے آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ اس نے ایسی خواہش کی تھی جو توہین قدرت کے خلاف تھی صرف ایک خدا ہی تھا جو اپنے قانون کو بدل کر اس کی آرزو پوری کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ بھی چپ تھا۔ بوڑھا روتے روتے دیں مو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہسپتال کے بستر پر تھا۔ اسے اپنا بدن بخار میں پھٹکتا ہوا لگس ہوا۔ اس نے نیم دا آنکھوں سے اس ماحول کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ کسی خیراتی ہسپتال میں ہے۔ ایک بوڑھے سے ڈاکٹر نے قریب آکر اس کا معائنہ کیا۔ اسے ایک انجکشن لگایا۔ ڈاکٹر بوائے نے اسے کچھ دوائیں کھلائیں۔ وہ پھر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو پورا صحنہ ان گزور چکا تھا۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ بوڑھے ڈاکٹر نے پوچھا۔

”تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بوڑھوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ زندگی ٹھوکر مارتی جاتی ہے اور ہم لڑھکتے جاتے ہیں۔“

بوڑھے ڈاکٹر نے سرو آہ بھر کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، بڑھاپا انسان کو بہت ڈنٹا ہے۔ کاش کہ انسان کبھی بوڑھا نہ ہوتا۔ ہم نے طبی سائنس میں اتنی ترقی کر لی ہے بڑھاپے کو دور کرنے کا اب تک کوئی نسخہ تیار نہ کر سکے۔“

مراو علی نے کہا۔ ”یہ ہماری کوتاہی ہے۔ اگر دنیا کے تمام دولت مند بوڑھے ہو کر اور اپنی تمام دولت ایک جگہ جمع کر کے سائنسدانوں کو صرف اسی کام پر بٹھادیں کہ بڑھاپے کو دور کرنے کی زود اثر دوا ایجاد کریں تو یقیناً کامیابی ہوگی۔ انسان کے ہر مرض علاج دریافت کیا جا رہا ہے۔ بڑھاپا بھی ایک ادلی مرض ہے۔ پھر اس کا علاج کیوں نہ دریافت ہو سکے گا؟“

”تمہارا خیال درحست ہے۔ مگر یہ خیال ابھی صرف ایک خیال ہے۔ دنیا کے بوڑھے اسی انداز میں سوچتے ہیں اور سوچتے سوچتے مر جاتے ہیں۔“

مراو نے سوچا تھا کہ بوڑھا ڈاکٹر اس تدبیر پر مزید کچھ روشنی ڈالنے کا مگر بوڑھا سوچ کا مذاق اڑا کر چلا گیا تھا۔

دو دن کے بعد وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر باہر آیا۔ باہر آخر شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ یہ رونق ان لوگوں کے دم سے تھی، بو دولت مند۔ یا پھر جوان تھے اور جوان حسینوں کو شاپنگ کر رہے تھے۔ اسی بھیر میں اس نے گلاب دیکھا۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ کار سے اتر رہی تھی۔ مراو بوڑھے قدموں سے جلد جلدی اس کی طرف بڑھنے لگا۔ گلابو اپنے نئے گاہک کے ساتھ شاپنگ کے ارادے۔ ایک دکان میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے پیچھے سے آواز دی۔

”گلابو!“

وہ ٹھٹھکی گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بیماری کے بعد ہسپتال سے اٹھ کر آ تھا۔ اس لئے پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ زندگی کے طمانچے اور گھونے کا کر میں گرفتار رہا تھا اس لئے کپڑے گرو آلود تھے۔ گلابو نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہارے جیسا ریش اعظم اس حالت میں؟ تعجب ہے۔“

”اب میں ریش اعظم نہیں ہوں۔ میرے بیٹے اور بہو نے محبت کا فریب دیا۔“

پری دولت اور جائیداد چھین لی ہے۔ دنیا والے مجھے بوڑھا اور کمزور سمجھ کر مجھ سے شک کرتے ہیں اور مجھے ناک آؤٹ کر دیتے ہیں ایسی صورت میں صرف تمہاری جیسی اہل حق مجھے اپنے زانو پر سلا کر میرے داغ سے بڑھاپے کا دکھ مٹا سکتی ہے۔“

گلابو نے ایک بار پھر اس کے حلیے کو ناگواری سے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا تم بالکل ہی کنگال ہو گئے ہو؟“

”ہاں، میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔“

”کیا تمہاری تمام دولت تمہارے بیٹے کے ہاتھ آگئی ہے؟“

”ہاں۔ اب میری تجوری کی چابی میرے بیٹے کے پاس ہے۔“

گلابو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”تو پھر تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اب اپنے بیٹے کو براہِ تبادلو۔ تمہیں والی کا کمیشن مل جائے گا۔“

وہ ”اونہ“ کہتی ہوئی پلٹ کر دکان میں داخل ہو گئی۔ اس بوڑھے پر چند لمحوں تک مٹھاری رہا۔ اتنا زبردست طمانچہ بیٹے نے بھی نہیں مارا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے سارے کھڑا ہو گیا۔ اتنی زہریلی چٹنگ اس نوجوان باکسر نے بھی نہیں کی تھی۔ گلابو کی ”اونہ“ کا مکا اس کے داغ پر پڑا تھا۔ وہ پاگل پن کی حد تک جھلا گیا اور وہاں سے بے فکر بھاگے لگا۔

نوجوان عورت ہر رات اس سے مفت کے پندرہ سو لیا کرتی تھی، وہ اسے ولال باری کہتے۔ وہ بھاگتے بھاگتے اپنے سر کے بال نوچتے لگا۔ اس کی سمجھ میں اب یہی آرہا تھا کہ رہائے۔ ایسی دولت کی زندگی سے سوت بہتر ہے۔

وہ جگلی جگلی کمرے کبھی بھاگتا رہا کبھی چلتا رہا۔ دولت کے شدید احساس سے وہ تھکتا اور ہاتھ بھول گیا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ شرکی حدود سے باہر جا رہا ہے۔ اسے احساس نہیں تھا کہ بارش شروع ہو گئی ہے اور بادل گرج گرج کر بجلی کی شمعیں جلا کر اسے سیاڑی دانت دکھا رہے ہیں۔

”میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں سرے جا رہا ہوں۔ پہاڑی کی بلندی پر باکر سمندر میں بونگ لگاؤں گا اور بے حس اور مطلبی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رشتہ توڑ دوں گا۔ ایسے پہاڑ پر لعنت ہے جس کے مقابلے میں موت بہتر نظر آتی ہے۔“

وہ پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے رک گیا۔ وہاں کسی بزرگ کا مزار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ

مزار کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کہ مرنے سے پہلے ایک بار اس بزرگ کے دل سے بھی اپنی گزری ہوئی جوانی کی بھیک مانگے گا۔ کیا حرج ہے اگر اپنی بے رونا دہا بزرگ کے روحانی وسیلے سے آزمایا جائے۔

مزار کے قریب ایک نوئی ہوئی جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت سکڑی مٹی جیم تھی۔ اس کے قریب چھت سے پانی دھار کی صورت میں ٹپک رہا تھا اور وہ سردی سے فر تھر کلپ رہی تھی۔ بوڑھے مراد نے اسے دیکھ کر سوچا، اگر دعا قبول نہ ہوئی تو مجھے تو بڑی کتنی ہی ہوگی۔ میرے لئے یہ کوٹ بے کار ہو جائے گا۔ لہذا یہ بڑھیا کے کام آئے تو ہر ہے۔

اس نے اپنا لانگ کوٹ اتار کر بڑھیا کے اوپر ڈال دیا۔ وہ تھر تھراتی ہوئی آواز میں اسے دعائیں دینے لگی۔

”خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم نے سردی سے مجھے بچایا ہے۔ خدا تمہیں ہر آن سے بچائے اور تمہارے دل کی مراد پوری کرے۔“

وہ دعائیں سنتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی ہاتھ اٹھا کر گز گزاتے لگا۔

”اے بزرگ! میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں لیکن آپ ضرور کرامات والا بزرگ رہے ہوں گے۔ شاید اسی لئے لوگوں نے آپ کو اتنی بلندی پر دفن کیا ہے۔ ہمارا کی اس بلندی سے آسمان بہت قریب ہے۔ آپ اگر میرے لئے دعا کریں تو وہ دعا آسمان تک پہنچ جائے گی۔“

اے بابا کرامات والے! آپ نے بھی اس دنیا میں بڑھاپا گزارا ہوگا۔ آپ بچے ہوں گے کہ بڑھاپا دنیا کا سب سے اذیت ناک اور ذلیل ترین مرض ہے۔ تو حضور دعا میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھے اس مرض سے نجات ملے۔ بڑھاپے سے نجات ماہ کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو خدا مجھے موت دے دے یا پھر میری جوانی مجھے دے۔“

دعا مانگنے کے دوران بجلی زور سے گز گزائی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی دوسری آ سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”موت کی دعا پوری نہیں ہوگی کیونکہ موت کا ایک دن معین ہے اور تمہارے ابھی پورے نہیں ہوئے۔“



بوزھے مراد نے حیرانی سے مزار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ آواز اسی مزار سے ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔  
”اے بیا کرامت والے! اگر مجھے موت نہیں آسکتی تو مجھ پر جوانی ہی آجائے۔“  
پھر وہی آواز مزار سے ابھرنے لگی۔ ”کوئی ایسی آرزو نہ کرو جو قانونِ قدرت کے

خلاف نہ ہوگی۔“  
مراد نے کہا۔ ”خدا کی مرضی ہو تو کوئی آرزو قانونِ قدرت کے خلاف نہ ہوگی۔  
کم چاہے تو دریا الٹا بہہ سکتا ہے اور میں بھی پلٹ کر بڑھاپے سے جوانی کی طرف

ہوں۔“  
”بوزھے! ابھی تو نے ایک نیکی کی ہے ایک غریب بڑھیا کو ہسروی سے محفوظ رکھنے  
لے اپنے بدن کا کپڑا اتار کر دے دیا ہے تیری یہ نیکی ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم  
کام آئیں۔ اس نیکی کے عوض کبھی نہ پورنی ہونے والی آرزو بھی پوری ہو سکتی ہے  
ہم تجھے سمجھا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا پریشانیوں کا گھر ہے جوان ہو کر بھی تو  
پریشان رہے گا۔ جوانی تجھے سکون نہیں پہنچائے گی۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے جوانی میں اتنا زور ہوتا ہے کہ مصائب سے لڑتے وقت  
میں نہیں ہوتی بلکہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنی آرزو سے باز نہیں آؤں گا۔ میں  
خبر کر لیا ہے کہ جوان بن کر زندگی گزاروں گا۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا اور  
اپنی بیوی جو حسرتیں باقی رہ گئی تھیں انہیں پورا کروں گا۔ خدا کے لئے میری یہ  
ذاتی کرامت کے ذریعے پوری کر دیجئے۔“

”ہوں۔ ہم سمجھ گئے۔ تو اپنی ضد سے باز نہیں آئے گا اور ہم تجھے تیری نیکی کا صلہ  
باجبجور دیں گے۔ یہ لے تیری خواہش پوری ہو جائے گی۔“

مراد کے پیچھے سے ایک ہاتھ آگے بڑھ کر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس اجنبی ہاتھ کی  
پہلی ہتھیلی پر سرخ رنگ کی ایک گولی تھی۔ گولی اتنی بڑی تھی کہ اسے گولہ کہنا  
بہتر ہے کہ وہی آواز سنائی دی۔

”اے اسے نگل جا“ تیرا بھلا ہوگا۔“

مراد نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ایک سفید پوش بزرگ ایک ہاتھ میں تسبیح، دوسری  
ہاتھ میں گولہ لے کھڑے تھے۔ اس کا صاف ستھرا عمامہ اور سفید لمبی داڑھی سنائی دے رہی تھی۔

جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔ انہوں نے تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے کہا۔

”ہم بھی بوڑھے ہیں لیکن ہم نے جوانی کی یہ گولی کبھی نہیں کھائی۔ کیونکہ ہم کی رہنمائی پر راضی ہیں۔ اس نے ہمیں بوڑھا کر دیا ہم اس کی مرضی کے خلاف نہیں جانتے۔ تو جوان بن کر دیکھ لے تجھے دلی سکون حاصل نہیں ہوگا۔“

بوڑھا سردان کی ہاتھیں ایک کان سے سن رہا تھا، دوسرے کان سے نکال رہا تھا۔ اس کی لپٹائی ہوئی نظریں سرخ گولی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بوڑھا کر اس کو لیا تو بزرگ نے کہا۔

”اس گولی کو ننگے کے بعد تو سردا جوان رہے گا۔ قدرتی طور سے نہ بھی بوڑھا اور نہ ہی طبعی موت مرے گا۔ تیری عمر ایک کتے کی عمر کی طرح لمبی ہوگی۔ کتے کسی کتے کو طبعی موت مرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ یا تو کسی شکاری کی گولی یا غلیل سے بنتے ہیں یا بجلی کے تاروں سے الٹھ کر مرتے ہیں یا پھر آندھی طوفان کی زوئیں سے ہو جاتے ہیں۔ تو بھی ان کی طرح قدرتی موت نہیں مرے گا بلکہ کسی حادثے کا شکار کسی کی سازش کا شکار ہو کر پھر بوڑھا ہو جائے گا۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا ”کیا میں پھر بوڑھا ہو جاؤں گا۔“  
 ”ہاں اگر کوئی تجھے خنجر یا کسی آتشیں اسلحہ سے ہلاک کرنا چاہے تو تو مرے بجائے پھر بوڑھا ہو جائے گا۔ تیری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہے کہ تجھے جوانی میں بڑھاپے میں موت آئے گی۔ دوبارہ بوڑھا ہونے کے بعد تو پھر اپنی طبعی عمر گزار۔ بڑھاپے کی ذلتیں برداشت کرے گا۔ پھر ایک دن اپنے مقررہ وقت پر مر جائے گا۔“  
 ”نہیں، اب میں اس بڑھاپے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جوانی حاصل کرنے میں بڑے... کچھ پسند نہیں کروں گا۔ میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بناؤں گا نہ کوئی ہوگا اور نہ ہی کوئی خنجر سے کسی آتشیں اسلحہ سے یا کسی بھی دنیاوی ہتھیار سے مارا جاسکے گا۔ اس طرح کبھی مجھ پر بڑھاپا نہیں آئے گا۔ موت کا مجھے غم نہیں ہے، وہ کہ بڑھاپا نہیں آئے گا تو موت کیسے آئے گی؟“

”تو جوان موت سے ڈرتے ہیں۔ تو جوان ہو کر موت کے بجائے بڑھاپے میں رہے گا۔ یہ درست ہے کہ بڑھاپے سے بچنے کے لئے تجھے سب کو دوست بنا ہوگا۔ اس دنیا میں تیرا ایک بھی دشمن نہ ہو لیکن کیا پتہ کہ تجھے کیسے حالات پیش

بہت دوست بھی بڑے خلوص سے نادانگی میں دشمنی کر جاتے ہیں۔ جاتیرا خدا

”کہ کردہ بزرگ اپنے حجرے کی طرف چلے گئے۔ بوڑھا مراد تیارہ گیا۔ مزار پر  
 بنی لائین کی زرد روشنی میں اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا، وہیں سرخ گولی رکھی ہوئی  
 اسی وقت بجلی کڑک دار آواز سے چمکی۔ اس کی لمبائی روشنی میں اس نے گولی منہ  
 لائی اور اسے ٹھننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گولی تھی یا گولہ؟ حلق میں جا کر پھنس  
 سانس کی آمد و رفت کا راستہ رک گیا۔ وہ بوکھلا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے حلق سے  
 نکلنے والی پانی کی ضرورت تھی۔ اس نے مزار کی چھت سے گرنے والے پانی کو چلو  
 لے کر پی لیکن پانی حلق تک پہنچ کر باہر آ گیا۔ کیونکہ جوانی کے گولے نے پانی ٹھننے کا  
 زور رکھا تھا۔

وہی حالت میں موت سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ جب پانی بھی نہ پی سکے اور سانس  
 بڑے سستے تو زندگی سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ جہاں وہ گرا  
 ہوا سے دور تک ڈھلان تھی۔ اندھیرے میں اس کی پستی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ  
 کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک  
 دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بعد اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔

پتہ کے کسی ہموار چٹانی میدان میں اس کا لڑھکتا ہوا جسم تھم گیا۔ موسلا دھار  
 رات سے جھک رہی تھی۔ وہ ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ لڑھکنے کے دوران جھٹکنے  
 منہ کے بائیں وہ جوانی کا گولہ حلق سے بیچے اتر گیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ سانس آ رہی  
 ہواں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف موسلا دھار  
 کے ٹپکے ٹپکے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے چت لیئے لیئے آسمان کی طرف دیکھا۔  
 لگے بادل جو آسمان مٹا مٹا سا نظر آ رہا تھا۔ دو سیاہ بادل مخالف سمتوں سے آ کر گڑ گڑاتے  
 گئے تو ایک قیامت کا شور بلند ہوا۔ ایک بجلی کان پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ  
 ٹپکے ٹپکے آواز پر آگر گری۔ مگر نہیں یہ محض اس کا دہم تھا کہ بجلی اس پر ٹوٹ  
 نہ لڑھکا کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے ذرا دور ایک چٹان بجلی کی زد میں آ کر ٹکڑے  
 ہو گئی تھی لیکن اس کی حرارت بوڑھے مراد کے جسم میں سما گئی تھی۔

بجلی کرکھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن میں بجلی

بھرنی ہے اور وہ سیدھا کھڑا ہوا ہے۔ اب اس کی کمر جھکی ہوئی نہیں ہے۔ بدن اٹھنے کے لئے ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے انگڑائی لی تو دل چھلنے لگا کہ دنیا کی ہر چیز پر بجلی کی طرح پڑے۔ کہتے ہیں نوجوانوں کے بدن میں بجلی بھری ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اوجھڑا لہراتے اور چھلنے رہتے ہیں۔ بجلی تو مراد کے جسم میں اتر گئی تھی۔ وہ سب اعتبار اور ادھر اچھلنے لگا۔

اچھلنے کے دوران پتہ چلا کہ اس کا وزن کتنی گنا بڑھ گیا ہے کیونکہ اس کے ذہن وہمک سے چٹان لرزتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ کاش کہ وہاں روشنی ہوتی تو دوسرے کو دیکھ سکتا کہ اس کے وجود کے اندر اور باہر کیا انقلاب آگیا ہے۔

وہ تیزی سے ایک طرف بڑھنے لگا۔ اب اسے روشنی کی تلاش تھی۔ وہ اپنے کو دیکھنا چاہتا تھا اس خیال سے وہ دوڑنے لگا، دوڑتے ہوئے اسے حیرانی ہوئی کہ سانس نہیں پھول رہی ہے اور تھکن کا دور دور تک نام نہیں ہے۔ اس کے اندر بھری ہوئی تھی وہ ایک انسانی رفتار سے زیادہ، ایک ہارس پاور کی رفتار سے بڑھ کر جاری تھی۔

مزار سے شہر تک ایک گھوڑے کی رفتار سے پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ جب منٹ میں شہر پہنچا تو گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا، لیکن اس کے ہانپنے میں بڑھ تھکن نہیں تھی بلکہ سینے میں جوان سانسوں کی وہمک ہو رہی تھی۔ اس نے آگے ہوئے دیکھا، تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں۔ تمام ٹر تھا۔ وہ اسٹریٹ لیمپ کے نیچے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔

پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی تھیں، مگر اب ان ہاتھ گوشت بھرا ہوا تھا اور رگیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ جلد کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا اس کی اجلی سرخی بالکل رگت سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے بدن میں جوانی کا گڑبگڑ رہا ہے۔ اس نے خوشی سے جھوم کر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں باندھیں، پاکستان کا پھر جوش جوانی میں ایک زور دار بڑھک لگا کر بجلی کے کھمبے کو ایک گھونٹہ مینہ رات کے سناتے میں ”ٹھن“ کی آواز ابھری اور بجلی کا کھمبا ایک طرف سے چمک اس نے حیرانی سے اپنے کئے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کو بجلی سی ٹکلیف تھی اور وہ لوہے کی تقریباً سولہ گینچ کی موٹی چاور کا کھمبا چمک گیا تھا۔ اس نے

رف دیکھ کر سرت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہلا۔  
 ”باغداد! میں نے اپنی پچھل جوانی مانگی تھی مگر واقعی تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ تو نے مجھے ہر کوئس کی جوانی دے دی۔ میں تیری اس مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا۔“  
 خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ کمر سیدھی ہو جانے کے باعث اب وہ ہوا چھٹ کا قد آور بھوت نظر آ رہا تھا۔ بھوت اس لئے کہ مر سے پاؤں تک کیچڑ سے نودہ ہو رہا تھا۔ پہاڑی سے لڑھکنے کے دوران کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس حالت میں اسے گھر نہیں جانا چاہیے۔ بیٹا اور بیویوں بھی اسے پاگل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس حالت میں وہ سچ پچ پاگل نظر آئے گا۔ وہ اچھے چلے میں بیٹے کے پاس پہنچ کر اچھی طرح اس کی مرمت کرنا چاہتا تھا۔

یہ سوچ کر وہ ایک ایسی دکان کے سامنے رک گیا، جہاں ضرورت کا سارا سامان فروخت ہوتا تھا۔ دکان کے دروازے پر آہنی شکر کی دیوار تھی اور تین مضبوط بڑے بڑے آلے بڑے نوئے تھے۔ اس نے ایک تالے کو پکڑ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ پھر اسے ٹھکی میں بھیج کر ایک زور کا جھکا دیا۔ چشم زون میں ایک کھٹکے کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔

اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس نے دوسرے تالے کو بھی یک جھکے سے کھول لیا۔ اسی دقت سینی کی آواز سنائی دی۔ گلی کے ایک موٹر پر ٹائٹ اکیڈار اچانک ہی سامنے آ گیا۔

”غیر دار!“ اس نے لکار کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

مرانے تالے کو ایک طرف پھینک کر جواب دیا۔

”میں ایک ضرورت سند ہوں اور اپنی ضرورت کے لئے اس دکان کے تالے کو توڑ رہا ہوں۔“

”پورے بد معاش!“ چوکیدار نے لاشی کا ایک بھرپور وار کیا۔ مرانے نے لاشی کو لکھا تھا کہ روک کر اپنی طرف کھینچا۔ لاشی کے ساتھ چوکیدار بھی کھینچا چلا آیا۔ اس نے سمجھ کر ایک ہلکا سا گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ سوچنے سمجھنے کے باوجود وہ اپنی پہلی کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ وہ ہلکا سا گھونسہ بھی زبردست ثابت ہوا چوکیدار کے لئے بغیر ہی دروازے کے قریب گر پڑا۔ اس نے جلدی سے تیسرے تالے کو ایک

جھٹکا دے کر الگ کیا۔ شر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ چوکیدار کو گھسیٹ کر اندر لایا۔ پھر اندر سے شر کو گرا دیا۔ چوکیدار کان بے حس جسم فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی کمرے ایک نارچ لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے نارچ لے کر اسے ردشن کیا اور وہاں اپنی ضرورت کی چیزیں تلاش کر لے لگا۔

اس بڑی سی دکان کے کئی حصے تھے۔ کوئی حصہ ریڈی میڈ ملبوسات کے لئے مخصوص تھا، کوئی ڈرائی فوڈ اور میک اپ کے سامان کے لئے وقف تھا۔ دکان کے ایک دور افتاد گوشے میں ایک دفتر نما کمرہ تھا۔ مراد نے پہلے اس کمرے کے ہاتھ روم میں اچھی طرح غسل کیا۔ اس مقصد کے لئے دکان سے صابن کی ٹکیہ اور تولیہ لے کر استعمال کیا۔ اس نے دکان کے اس حصے میں بلب ردشن کر لیا تھا کیونکہ وہاں سے ردشنی سڑک تک نہیں جاسکتی تھی۔ اس ردشنی میں اس نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ پہلے خود کو پہچان نہ سکا۔ آئینے میں وہ اس قدر خوبردنوجوان نظر آ رہا تھا کہ آنکھوں سے دیکھ کر بھی اپنی نوجوانی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک باڈی بلڈر کی طرح اپنے جسم کو ہر زاویے سے توڑ سوڑ کر دیکھا۔ دو بلاشبہ ہر کوئیس کی کاربن کاپی نظر آ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اپنی اس جوانی کی حفاظت کا ہمیشہ خیال رکھے گا۔ حفاظت کے خیال سے یاد آیا کہ اسے کسی کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے۔ مگر دو جوان ہوتے ہی دشمنی سول لے رہا تھا۔ اس نے چوکیدار کو ایک گھونسنے میں ٹھنڈا کر دیا تھا۔ دکان کے مالے توڑ کر مالک دکان اور قاتون کو اپنا دشمن بنا رہا تھا۔ اس طرح تو دو ایک دو دن سے زیادہ جوانا نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی دشمن نے اگر اسے ہلاک کر دیا یا عدالت سے سزائے موت مل گئی تو وہ مرنے سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے گا۔

اس نے جلدی سے اپنے کان پکڑ لئے اور آئینے کے سامنے اپنے آپ کو گواہ بنا کر دعدہ کیا کہ آئندہ غلط مقاصد کے لئے اپنی بے پناہ قوتوں کو استعمال نہیں کرے گا اور ہم اسے فوراً ہی وہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جائے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد وہ ایک لباس نکال کر پہننے لگا۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ اگر اس نے اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لیا تو پھر جوانی کی یہ قوتیں کس کام آئیں گی؟ اپنی توہین اور ذلت کا بدلہ لینے کے لئے ہی جوانی کی دسائیں مانگتا رہا تھا۔ اب دشمنوں کی عبرت آموز سبق دیے بغیر اسے ذہنی سکون نصیب نہیں ہو گا۔ قوتوں کا استعمال ہو گا۔

جوانی محض ایک کھوکھلی سی نمائش بن کر رہ جائے گی۔ وہ ادھر سے ادھر ٹھٹھلے لگا اور سوچنے لگا کہ اپنے دل کو کیسے سمجھائے دشمنوں کو کیسے حاف کرے؟ دل کسی طرح نہیں مانتا تھا کہ دشمنوں کو معاف کیا جائے۔ بدلہ تو لینا ہی ہوگا۔ خواہ چھپ کر خواہ بھیں بدل کر۔ بھیں بدلنے کے خیال سے وہ آئینے کے سامنے ٹپک گیا۔ مگر اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور وہ میک اپ کا سامان نکال کر اس تدبیر میں لگنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد وہ دکان سے باہر آیا تو اس کا حلیہ اور اس کی عمر بدل چکی تھی۔ اس کے سر کے بال پیلے کی طرح سفید تھے بدن کی ابکی سرفی مائل رنگت ٹیالی ہو گئی تھی اور اس کی کمر جھک گئی تھی اور وہ سوچتا جا رہا تھا۔

”یہ مرد اپ ٹھیک ہے۔ میں اپنے دشمنوں سے ایک بوڑھے کے روپ میں انتقام لیا کہلا گا۔ پھر میک اپ اتار کر نوجوان کے اصلی روپ میں آجایا کروں گا۔ میرے دشمن ہڈے مراد کو تلاش کرتے رہیں گے۔ کوئی مجھے دیکھ کر یہ یقین نہیں کرے گا کہ بوڑھا لڑا ہر کوئیس کی طرح جوان ہو گیا ہے۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔ انسان اسے ناممکن سمجھتے ہیں اور ناممکن ہی بات کا وہ کبھی یقین نہیں کریں گے۔ مجھے کوئی دوسری ہستی سمجھ کر نظر لگاؤ کریں گے۔“

اب چونکہ میری شکل بدل چکی ہے لہذا میرا نام بھی بدل جانا چاہئے۔ ایک نوجوان کے روپ میں میرا نام کیا ہونا چاہئے میرا نام؟ ہوں اول اول ہاں! اب میرا نام یوسف لگاؤں گا۔ یوسف اس لئے کہ جوان ہو کر مجھے حسن یوسف ملا ہے اور رازی اس لئے کہ میرا بڑھاپا اور میری جوانی ایک ایسا راز ہے جس کی تم تک کسی انسان کا دماغ نہیں پہنچتا۔“

لاحقہ ہوا اپنی اسی شاندار کوٹھی کی طرف جا رہا تھا جس پر اب بیٹے اور بہو کا قبضہ

”مری صبح بیٹا اور بہو ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے سامنے سنٹر ٹیبل پر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس رکھا ہوا تھا اور وہ چائے کی چسکیاں پیتے ہوئے مزید دولت کمانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور بریف کیس کے ان نوٹوں کو نگاہ میں لگا نا چاہتے تھے کہ اتنے میں زیتے پر قدموں کی دھک سنائی دی۔ دونوں

نے سراٹھا کر دیکھا تو وہ بوڑھا اپنے بیڈ روم سے نکل کر زینے سے اترتا ہوا ذرا گھبراہٹ میں آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہونے غصے سے کہا۔

”ارے یہ بوڑھا پھر مصیبت بن کر آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسی گرم رات ہسٹری کی ہے اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔“

”ڈیڈی!“ بیٹے نے بھی غصے سے پوچھا۔ ”تم کس طرح گھر میں داخل ہوئے تھے دروازے اور کھڑکیاں تو اندر سے بند تھیں۔“

”بیٹے! یہ میرا گھر ہے۔ اس گھر کے در و دیوار مجھے پہچانتے ہیں لہذا میرے لئے خود بخود کھل جاتے ہیں۔“

ہونے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”یہ گھر تمہارا نہیں، ہمارا ہے۔ نکل جاؤ۔“

وہ دھکا دینے کے لئے پیچھے آگئی۔ بیٹا آگے آکر کھڑا ہو گیا۔..... ایسا کی بار بار تھا۔ ہو پیچھے سے دھکا دیتی تھی اور بیٹا آگے سے مارتا تھا لیکن اس بار ہونے پوری فوج سے دھکا دیا تو وہ اپنی جگہ بوڑھے برگد کی طرح مضبوطی سے جما رہا۔ بیٹے نے آگے مارا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”میں ایک شرط پر اس گھر سے جاؤں گا۔ تم اپنے باکس باپ کو صرف ایک گھڑ مارنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اگر تم نے ایک پوائنٹ بتایا تو میں بیشک کے لئے بہاؤں جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے بیٹے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بیٹے نے باپ کی جھکی ہوئی کردیکھی۔ کی ضعیفی کو نگاہوں میں تولد۔ پھر اس پر تابد توڑ گھونے مارنے لگا۔ تقریباً تیس سیکنڈ مسلسل حملے کرتا رہا۔ مگر ایک پوائنٹ بھی حاصل نہ کر سکا۔ پھر زور اور کے لئے رک ہانپنے لگا۔

”برخوردار! بوڑھے باپ کے سامنے جوان ہو کر ہانپ رہے ہو چلو پوائنٹ پانچ اس نے بیٹے کے سر پر ایک ہلکی سی چپت ماری۔ اس کی کھوپڑی جھنجھٹا کر وہ آنکھوں کے سامنے تارے مچنے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر پیٹھ پر دوڑتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس پہنچی اور اس کے سر کو سہلاتی ہوئی بولی۔

”خبیث بوڑھے! کیا تو میرے ساگ کا دشمن ہے۔“



اس نے جواب دیا۔ ”دشمنی کی ابتدا تم دونوں نے کی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بوڑھا باپ جوان بیٹے کا طمانچہ برداشت کر لیتا ہے لیکن جوان بیٹا بوڑھے باپ کی ایک ہلکی سی چپت کھا کر گر جاتا ہے۔ یہ آج کل کے نوجوان ہیں..... افسوس۔“

چٹا کراہتے ہوئے اٹھنے لگا۔ باپ نے کہا۔ ”تم ایک بھی پوائنٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر بھی میں اس گھر سے چلا جاؤں گا مگر خالی ہاتھ نہیں، یہ بریف کیس لے کر.....“

بریف کیس کی بات آنے ہی بیٹے نے جلدی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مراد نے اس سے زیادہ بھرتی دکھائی۔ اس نے بیٹے کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کو بریف کیس کے نیچے دبایا۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیختے لگا۔

”بیٹے! اگر تم اپنی انگلیاں بریف کیس کے نیچے سے نکال لو تو اس کی ساری رقم ہماری ورنہ میری.....“

اس نے دو مرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنی انگلیوں کو آزاد کرانا چاہا جبکہ مراد نے بریف کیس پر صرف ایک انگوٹھے کا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ ہولے حیرانی سے سوچا۔ ”نہیں۔ اس بوڑھے کے انگوٹھے میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی کہ اس کا جوان صحت مند خاوند بریف کیس کو اس جگہ سے ہٹا نہ سکے۔“

وہ آگے بڑھ کر سر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہٹانے لگی۔ مگر وہ بگولھا بریف کیس میں جیسے پیوست ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ سے ہٹنے کا کام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے نیچے بیٹے کی انگلیاں پس جا رہی تھیں اس نے پھر تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے کہا۔

”اوو ڈیڈی! سدا کے لئے چھوڑ دو۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے۔ میں نے جوانی کے نشے نرم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔“

مراد بریف کیس اٹھا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹے کی انگلیاں ایسے نظر آ رہی تھیں جیسے جھوڑے سے کچل دی گئی ہوں۔ وہ تکلیف سے کراہتا رہا اور روتا رہا۔ ہوا بڑبڑاتی رہی اور اس کی مزہم پٹی کرتی رہی۔ پھر وہ بریف کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”لاؤ۔ یہ بریف کیس مجھے دو۔“

”ہوا! اگر تم نے اس بریف کیس کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔“

”ال کھنت کا شہرہ دیکھ لو، پھر مطالبہ کرو۔“

وہ سہم کر اپنے خاندان کے پاس چلی گئی۔ پھر اس نے ڈرتے ہوئے دھمکی دی۔ اس بریف کیس میں پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔ اگر تم نے واپس نہ کیا تو میں ابھی تھانے میں فون کروں گی۔“

بیٹے نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”بیگم! تم خاموش رہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ میں نے تمہاری باتوں میں آکر ڈیڈی کے ساتھ جت زیادتی کی تھی۔ جب تک باپ اپنے بچے کے کان پکڑ کر اسے سزا نہیں دیتا اس وقت تک بچے کو عقل نہیں آتی۔ اب مجھے عقل آگئی ہے۔ ڈیڈی! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ یہ ساری دولت اور جائیداد آپ کی ہے۔ آپ واپس لے لیں۔“

مراد نے کہا۔ ”شباباش بیٹے! تم نے سعادت مندی کا اظہار کر کے دل خوش کر دیا ہے۔ میں تمہیں صرف یہ سبق سکھانے آیا تھا کہ بوڑھے والدین کو چھٹے پرانے کپڑے سمجھ کر باہر نہ پھینکو۔ ان کا بروہا دولت اور جائیداد کا نہیں، صرف تمہاری محبت اور توجہ کا محتاج رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تمہارا محتاج نہیں ہوں اور نہ ہی یہاں رہنے کے لئے آیا ہوں۔“

بیٹا ضد م کرنے لگا کہ باپ کو اب اسی گھر میں رہنا چاہئے۔ ہونے بھی رسمی طور پر معافی مانگ کر اسے ساتھ رہنے کے لئے کہا لیکن اس نے جواب دیا۔

”میں یہاں کسی سورت سے رہنا نہیں چاہتا۔ بیٹے! میں تم سے صرف ایک کام لے چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے ڈیڈی! میں ایک نہیں آپ کے ایک ہزار کام کرنے کو تیار ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”میری جوانی کے زمانے میں رستم نامی ایک مشہور باکسر تھا۔ وہ مہکا ہے۔ اب اس کا ایک بیٹا بیوی و بیٹ باکسر ہے۔ تم کسی باکسنگ کلب کے ذریعے اسے پہنچا کرو کہ مراد علی ریٹائرڈ باکسر اس سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ جیت جائے گا تو میری طرف سے اسے ایک لاکھ روپے انعام میں دیئے جائیں گے۔ اگر وہ ہار جائے گا تو اس کی طرف سے شرط لگانے والوں کی رقم مجھے ملے گی۔“

”ڈیڈی! اس لوجوان باکسر کی طرف سے کتنے ہی لوگ یہ سوچ کر بڑی بڑی رہیں لگائیں گے کہ آپ اس کے مقابلے میں بوڑھے ہیں اور کمزور ہیں۔ پہلے ہی راتوں میں شکست کھا جائیں گے۔“

”ہاں۔ انہیں یہی سوچنے دو۔ ان کی لگائی ہوئی تمام رقیں ہماری جیب میں آئیں گی۔ ان کے اطمینان کے لئے اگر تمہیں ایک لاکھ سے بھی زیادہ رقم بڑھانی پڑے تو تم بلا جہل رقم بڑھا دیتا۔ تمہارا بوڑھا باپ اس رقم کو ڈبے نہیں دے گا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ شکست کھائیں گے۔ کیا ابھی میں نے آپ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا ہے؟“

مراد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مقابلہ ہونے تک مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ دس ہزار بھی تمہیں واپس مل جائیں گے۔“

بیٹے نے بریف کیس سے مطلوبہ رقم نکال کر دی۔ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے کہہ

”اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ جب بھی ضرورت ہوئی تم سے فون پر رابطہ قائم کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ کمر جھکائے آہستہ آہستہ باہر نکل آیا۔ باہر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس باڑی کی طرف جانے لگا جہاں اسے از سر نو جوانی نصیب ہوئی تھی۔ جب ٹیکسی اس دکان سے گزرنے لگی جس کے مالے اس نے توڑے تھے تو ڈرائیور نے اسے بتایا کہ پچھلی رات ایک چور اس دکان میں داخل ہوا تھا اور اس نے ایک چوکیدار کو ہلاک کر دیا ہے۔

یہ سن کر مراد کی آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا نظر آنے لگا۔ خیریت ہوئی کہ پچھلی رات چوکیدار کے سوا کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا ورنہ اب تک جیل میں ہوتا۔ وہ اپنے آپ پر صدمہ لانے لگا کہ اس نے چوکیدار کو گھونٹہ کیوں مارا تھا۔ حالانکہ وہ نہایت ہی بگسا گھونٹہ تھا لیکن خود اسے اپنی بے پناہ قوت کا اندازہ نہیں تھا۔

جوانی کی گونی دینے والے بزرگ نے کہا تھا کہ بڑھاپے سے بچنا چاہیے ہو تو کسی کو اپنا دشمن نہ بناؤ اور اس نے چوکیدار کو ہلاک کر کے قانون کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ اپنے گھر جا کر بیٹے اور بہو کو بھی پریشان کیا تھا اور وہاں بھی ایک انگوٹھے سے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ حال تو بات بن گئی کہ بیٹے کو عقل آگئی اب وہ باپ کا فراموش راہ بن گیا اگر وہ دونوں بھی قانون کے دروازے پر دستک دیتا چاہے اور وہ انہیں روکتے سستے بیٹے یا بہو میں سے کسی کو ہلاک کر دیتا تو پھر وہی پھانسی کا پھندا اس کا مقدر بن جاتا۔ وہ پھانسی کے پھندے سے لٹک کر مرتا نہیں۔ جب ابے پھندے سے اتارا جاتا تو زندہ ہی رہتا۔ مگر اس

کی جوانی بڑھاپے میں بدل چکی ہوتی۔ اور وہ موت سے نہیں بڑھاپے سے ڈرتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آئندہ کبھی اپنی طاقت کا مظاہر نہیں کرے گا اور کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ اب رستم کے بیٹے سے بھی باکسنگ کا مقابلہ نہیں کرے گا۔ کیونکہ مقابلے میں اس نوجوان باکسر کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ اور اس کے ساتھی سب ہی دشمن بن جائیں گے لہذا فی الحال اس دشمن سے انتقام لینے کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے یہ سوچ کر اس نے ایک ٹیلیفون بوتھ کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ پھر وہاں سے فون پر بیٹھے سے کہہ دیا کہ ابھی وہ کسی باکسنگ کلب سے رابطہ قائم نہ کرے۔ اس نے کچھ عرصے کے لئے مقابلے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔

وہ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کر پہاڑی کی طرف روانہ ہوا تو اس وقت وہ مطمئن تھا کہ اب کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت نہیں آئے گی لیکن تقدیر کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ پہاڑی کے واسن میں پہنچتے ہی رستم کے بیٹے سے سامنا ہو گیا وہ اپنی کار سے اتر کر مزار کی طرف پہاڑی کی بلندی پر جانا چاہتا تھا۔ مراو کر ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر وہ رک گیا۔ جب ٹیکسی واپس چلی گئی تو نوجوان باکسر نے مراو سے کہا۔

”گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف جاتا ہے مگر تم جنگل کی طرف آئے ہو۔ یہ اچھا ہوا۔ میں یہاں تمہاری لاش گرا دوں گا تو قانون میرا ہاتھ پکڑنے نہیں آئے گا۔“  
مراو نے جھکی ہوئی کمر کر دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ ”میں تم سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم بھی اس مزار پر دعا مانگنے آؤ گے۔“

نوجوان نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اوپر جو قبر بنی ہوئی ہے۔ دوسرے باپ کی ہے۔ یہاں سے گزرنے والے اسے کسی بزرگ کا مزار سمجھ کر دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ میرے والد نے اپنی زندگی میں پہاڑی کا وہ حصہ خرید لیا تھا اور وہاں ایک عالیشان کونٹھی بنانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی تم نے انہیں شکست دی۔ یہ ان کے غرور کی شکست تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ ان کی لاش کے سامنے کھرب ہو کر میں نے وہ باتوں کا عہد کیا تھا کہ اپنے والد کی طرح نامور باکسر بنوں گا۔ باکسنگ کے ذریعے دولت کماتاں اس پہاڑی پر اپنے مرحوم والد کی خواہش کے مطابق ایک عالی شان کونٹھی تعمیر کراؤں گا۔ دو مرا عہد یہ تھا کہ تمہیں گھونسنے مار مار کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔“

میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میری خواہش پوری کرنے کے لئے تم میرے والد کی زر کے پاس چلے آئے ہو اور آج ہی میں دس ہزار روپے کوٹھی کی بنیاد ڈالنے کے لئے جا چکا ہوں۔ کوٹھی کی بنیاد میں اب تمہارے لمو کے قطرے بھی ٹپکائے جاسکیں گے۔

مراونے پوچھا۔ ”کیا ہمارے درمیان صلح نہیں ہو سکتی۔ میں لڑائی جھگڑا کرنا اور مزید کسی کو دشمن بنانا نہیں چاہتا۔ تمہارے والد رستم علی ہاکسری یہ خواہش تھی کہ اس پاڑی ایک کوٹھی تعمیر کی جائے۔ میں ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی طرف سے اس کی بنیاد ڈالنے کے لئے دس ہزار روپے ابھی دیتا ہوں اور آئندہ بھی مجھ سے جو کچھ ہوگا، تمہاری تعمیر کے لئے کچھ نہ کچھ دیتا رہوں گا۔“

”بڑھے! تو اپنی جان بچانے کے لئے مجھے رشوت دینا چاہتا ہے یہوقوف! تیری جیب میں دس ہزار روپے ہیں۔ انہیں تو میں ابھی تجھے ہلاک کر کے حاصل کر لوں گا۔“  
 یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا مارا۔ مراونے بائیں ہاتھ سے اس گھونے کو روک کر

”تو اپنی جوانی پر غور نہ کر۔ تیری جیب میں بھی دس ہزار ہیں۔ کیا پتہ کہ وہ دس ہزار مجھے مل جائیں۔“

نوجوان ہاکسری نے زور وار قہقہہ لگایا۔ پھر اپنی جیب سے دس ہزار کے نوٹ نکال کر زمین پر ایک پتھر کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔  
 ”یہ دس ہزار..... اگر تو نے ایک پواکٹ بھی بنا لیا تو میں یہ رقم تجھے دے دیتا ہوں۔“

مراونے اپنی جیب سے رقم نکال کر ای پتھر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ پورے دس ہزار نہیں ہیں۔ چند روپے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیئے تھے۔ میں بھی یہی کہہ رہا تھا کہ صرف ایک پواکٹ بنالے اور یہ رقم لے جا۔“

”دھمک کر پتھر کے نیچے روپے رکھ رہا تھا۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر اسے لات مار دی۔ مراونے اس کے پاؤں کے ٹکڑے کو اپنی ہتھیلی پر روک کر اسے پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔ نوجوان ہاکسری میں ایسے بلند ہوا جیسے سکے کی طرح ٹاس کیا گیا ہو۔ پھر وہ زمین پر گر کر چھت پر گرا اور وہاں سے پھسلتا ہوا دوہری طرف پتھر کی زمین پر دھپ

سے آڑا۔ تھوڑی دیر تک وہ زمین پر پڑا سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کس طرح فضا میں اڑتا تھا اتنی دور آڑا ہے۔ پھر ملی زمین کے باعث جو چوٹیں آئی تھیں وہ بھی حیرانی کی شدت سے یاد نہ رہیں۔ پھر وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اس کمزور بوڑھے میں اس طرح اچھال پھینکنے کی قوت ہے۔

وہ کار سے گھوم کر اس کے سامنے آیا۔ چند لمحات تک اس بوڑھے کو حیرانی سے دیکھا پھر دل ہی دل میں کہا۔ ”یہ ناممکن ہی بات ہے کہ ایک بوڑھا مجھ جیسے قوی ہو سکے جو ان کو سکے کی طرح اچھال دے۔ مجھے ذرا سنبھل کر گھونٹوں سے اس کی مرمت کرنا چاہئے۔“

یہ سوچ کر وہ باقاعدگی سے اس پر گھونٹے برساتے لگا۔ مراد نے بڑی سہولت سے اس کے حملوں کو روکتے ہوئے نصیحت کی۔ ”برخوردار اتنی فاسٹ بلونگ نہ کرو تم لائٹ پیچنگ سے بھی پوائنٹ حاصل کر سکتے ہو۔“

اس نے جھٹا کر کہا۔ ”بوڑھے خبیث! تو پوائنٹ حاصل کرنے کی بات کرتا ہے میں تجھے موت کی نیند سلا کر ہی دم لوں گا۔“

”نوجوان! تو اپنی غند سے باز نہیں آئے گا۔ لے سیرا ایک فینچ سنبھال.....“

یہ کہہ کر اس نے بائیں کمرے سے فینچ کیا۔ نوجوان نے اسے ایک ہاتھ سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ مکا ہاتھ کی ڈھال سے گزرتا ہوا اس کے منہ پر آیا اور اس کا منہ گھوم گیا۔ اس نے دوسرا گھونٹہ رسید کیا۔ اس بار گردن گھوم کر پھر سیدھی ہو گئی۔ مگر سیدھا زمین پر ہمیشہ کے لئے لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ ایسے پچک گیا تھا کہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ مراد نے اس کی جیب ٹٹول کر شناختی کارڈ نکال لیا تاکہ اس کی لاش پہچانی نہ جاسکے۔ پھر اس نے پتھر کے پیچے سے وہ تمام روپے نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ اس کے بعد نوجوان باکس کی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہاں سے دس میل دور اس نے سمندر کے ساحل پر کار روکی۔ وہ ساحل ویران تھا۔ دور دور تک ایک بھی متفنس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کپڑے اتار کر غسل کرنے اور بڑھاپے کا میک اپ اتارتے لگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا شہر کی طرف جا رہا تھا تو اس کی کمر سیدھی ہو گئی تھی سر کے بال سیاہ ہو گئے تھے اور اب اس نوجوان کا نام یوسف رازی تھا۔

شر کی ایک ویران سڑک پر اس نے کار چھوڑ دی اور پیدل چلنے لگا۔ اس نے سب سے پہلے ایک پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے شر کے ایک خوبصورت علاقے میں ایک خوبصورت مکان کھنچی کرانے پر حاصل کی۔ پھر اس کے ایک کمرے میں تنہا بیٹھ کر اس نوجوان باکسر کی موت پہنچانے لگا۔ ہر انسان غلطی کے بعد ہی پچھتااتا ہے۔ اس نے پھر ایک قتل کر کے اپنا کوہنہ دشمن بنانے کی غلطی کی تھی۔

وہ بہت دیر تک اپنے جرم کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ کسی نے اسے نوجوان باکسر سے لڑکے دیکھا ہو گا تب بھی اس کی شناخت نہیں کر سکے گا۔ یہ کہ اس وقت وہ بوڑھا مراد علی تھا..... اب جوان یوسف رازی بن گیا ہے۔

پھر بھی اس نے سوچا کہ کمرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن اسے قصائی کی بھری تلے آنا ہی پڑتا ہے۔ لہذا اب اسے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔ یوسف رازی کے روپ میں کسی انسان کے بچے کو بھی اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے۔ سوچنے کو تو وہ بہت بوجھتا ہو کر موچ لیتا تھا لیکن بعد میں یہ بھی سوچنے لگا کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اگر بولے سے کبھی جوانی کے غرور میں کسی ایک سے لڑ بیٹھا تو ایک کے پیچھے ایک سو دشمن پرا ہو جائیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغرور نہ بنے اور مغرور نہ بننے کے لئے لازمی ہے کہ جس طرح انسان زندہ رہ کر موت کو یاد رکھتا ہے اسی طرح وہ جوان ہو کر بڑھاپے کو یاد رکھے۔ اگر اس کا گزرا ہوا بڑھاپا پیش نظر رہے گا تو اس کی جوانی کبھی لو کر نہیں کھائے گی۔

اس رات وہ خند آنے تک اسی ایک نکتے پر غور کرتا رہا کہ کسی طرح ہمیشہ بڑھاپے کو یاد رکھ کر خوف کھاتا رہے۔ کینجٹ ایسی جوانی ملی تھی کہ وہ موت سے نہیں ڈراتی تھی۔ صرف بوڑھا کر دینے کی دھمکی دیتی رہتی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ انسان کھانے کے لئے بھوکے ہو اور جوانی کی موجودگی میں بڑھاپے کو بھول جاتا ہے۔ لہذا ہر دم بڑھاپے کو اپنے سامنے رکھ کر اسے یاد کرتے رہنا ضروری تھا۔

دوسری صبح جب وہ بہترین سوٹ پہن کر اور رنگین شیشوں کی عینک لگا کر سپر مارکیٹ میں پہنچا تو کتنی ہی لڑکیوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی جانب اٹھتی رہیں۔ وہ اتنا فخر اور امارت تھا کہ اسے ایک بار دیکھنے والے بار بار دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ ایک دکان میں داخل ہوا تو اس کا بیٹا اور سو وہاں شاہنگ میں مصروف تھے۔ سو کی نظر

اس پر ہنسی تو اس نے اپنے خاوند کو کہنی سے ٹھوکا مار کر آہستگی سے کہا۔  
 ”ذرا اس نوجوان کو دیکھئے۔ اس کی شکل آپ کے ڈیڈی سے کتنی ملتی ہے۔“  
 بیٹے نے اسے دیکھا پھر حیرانی سے کہا۔ ”واقعی بالکل ڈیڈی کی جوانی کی تصویر ہے۔“  
 دوسرے کاناٹر کے پیچھے بہت سی گڑیاں اور گڈے نظر آ رہے تھے۔ یوسف رازی  
 سبزین سے پوچھ رہا تھا۔

”یہاں صرف جوان گڈے اور گڑیاں ہیں۔ کیا کسی بوڑھے آدمی کا پتلا نہیں ہے؟“  
 سبزین نے ایک بوڑھے کا پتلا نکال کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس بوڑھے  
 ایک ہاتھ جھکی ہوئی کمر پہ تھا اور دوسرے ہاتھ سے جھکے جھکے سلام کر رہا تھا۔ یوسف رازی  
 نے پوچھا۔

”یہ بوڑھا کسے سلام کر رہا ہے؟“  
 سبزین نے جواب دیا۔ ”یہ بوڑھا اپنی خاموش ادا سے کہہ رہا ہے کہ بڑھاپے  
 دور سے سات سلام..... اور اس سلام کی قیمت ہے پچیس روپے.....“  
 ”مجھے ایسے ہی ایک بوڑھے کی ضرورت تھی جو بڑھاپے کو دور سے سلام کرتا ہو۔“  
 آپ اسے پیک کر دیں۔“

اس نے جیب سے قیمت نکال کر کاناٹر پر رکھ دی۔ بیٹے نے قریب آکر اسے مخاطب  
 کیا۔

”مستر! میرا نام شمشاد علی ہے۔ میں مشہور و معروف باکسر مراد علی کالڑکا ہوں اور۔۔  
 میری وائف ہیں۔“

اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں سے مل کر بری خوشی ہوئی۔ میرا نام  
 یوسف رازی ہے۔“

اس کے بیٹے شمشاد علی نے کہا۔ ”مجھے آپ سے مل کر اس لئے خوشی ہو رہی ہے  
 کہ آپ میرے والد کے ہم شکل ہیں۔ میرے والد اپنی جوانی میں ہی ہو آپ کی تصویر  
 تھے۔“

”اچھا آپ کے والد کہاں ہیں؟ میں ان سے ضرور ملوں گا۔“  
 ”میرے ڈیڈی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے کبھی ان کا جی چاہتا ہے تو وہ آکر ہم سے ملاقات  
 کر لیتے ہیں۔ وہ کچھ عجیب قسم کے انسان ہیں۔ نہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور نہ ہی اپنا



”جانتے ہیں۔“  
 ”پھر نو واقعی عجیب قسم کے انسان ہیں۔ اگر میں بوڑھا ہوتا تو آپ سے کتنا کہ آپ  
 ہی ایڈی کہہ کر ان کی کمی پوری کر لیں۔“  
 ان بات پر وہ سب ہنسنے لگے۔ ہونے سراد علی عرف یوسف رازی کو تعریفی نظروں  
 سے دیکھتے ہوئے کہلا۔

”خدا نہ کرے کہ آپ بوڑھے ہوں۔ آپ اتنے پیڑھ سم ہیں کہ آپ کے بوڑھاپے کا  
 یہی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا آپ ہمارے ہاں آنا پسند کریں گے؟“  
 شمشاد علی نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ”بیگم! یہ ہمارے ہاں  
 پہنچتے ہیں؟ ہم آج شام کی ٹرین سے احمد آباد جا رہے ہیں۔ ایک ماہ کے بعد واپس  
 آئیں گے۔ اس کے بعد ہم انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیں گے۔“  
 یہ کہتے ہی وہ اپنی جوان بیوی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگا اس نے ہاتھ چھڑاتے  
 کہلا۔

”ذرا ٹھہر تو جایے۔ ہمیں ایک دوسرے کا ایڈریس معلوم کرنا چاہیے۔ ورنہ اتنے  
 بے خبر میں ہم انہیں کہاں تلاش کریں گے۔ مسٹر یوسف رازی۔ میرا نام شہناز ہے۔  
 فون نمبر دو پانچ سات صفر سات سات ہے۔“

شمشاد علی اپنی حسین بیوی کو سمجھنے کرنے جانے لگا۔ مراد نے ہنسنے ہوئے کہلا۔  
 ”شہناز صاحبہ! فون نمبر کافی ہے۔ میں آپ سے ضرور ملاقات کروں گا۔“  
 شمشاد نے گھور کر مراد علی کو دیکھا لیکن اس کے ذیل ڈول اور کسرتی بدن کو دیکھ کر  
 اسے الجھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ شہناز کو جبراً وکان سے باہر لاتے ہوئے بولا۔  
 ”مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ تمہیں اس سے بے تکلف ہونے کی  
 ضرورت تھی؟“

”ڈول پنچتی ہوئی بولی۔“ میں اپنی ضرورت کو تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ میں  
 اسے جیسے ہے حس اور بے ضرر مرد کے ساتھ کب تک زندگی گزارتی رہوں گی؟“  
 شمشاد نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ”آہستہ بولو! کیا تم مجھے بدنام کرنا  
 چاہتی ہو؟ کیا تم بھول گئی کہ تم نے میرے ساتھ غریبہ کیلہ کیا ہے۔ انرا معاہدے کی  
 قسم کسی بھی مرد سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھو گی۔ ورنہ میری درست اور جائیداد



اگے بڑھ کر اسے مخاطب کیا۔

”بچہ! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

لڑکی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو چند لمحوں تک بے اختیار اسے دیکھتی رہ گئی۔ اب پہلے کبھی ایسا مردانہ حسن اور پُرکشش شخصیت اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نور آئی اپنی نگاہیں جھکا لیں اور کسی نامعلوم جذبے سے اندر ہی اندر کانپنے لگی۔ وہ بیدمی سادی سی لڑکی تھی اور یہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ ایک خوب رو جوان کو دیکھ کر بدل آپ ہی آپ کیوں دھڑکنے لگا ہے۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا آپ کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہے؟“

وہ جھپکتی ہوئی بولی۔ ”جی..... جی ہاں۔“

”آپ کیا کام کر سکتی ہیں؟“

”میں..... میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ پر جانا لکھنا نہیں آتا۔ میں کسی کے گھر میں جھاڑو دے سکتی ہوں، برتن مانجھ سکتی ہوں، کھانا کھا سکتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ کل صبح آپ گلبرگ کی کوٹھی نمبر سات بی، میں چلی جائیں، وہاں پر اچھی تنخواہ پر فوکرسی مل جائے گی۔“

”آپ کی بڑی سرمائی ہے۔ میں کل صبح ضرور وہاں جاؤں گی۔“

”اچھی آپ اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں آپ دونوں کے پیچھے کھڑا ہوا ہا تھا۔ اگر آپ کو کچھ روپے کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لیجئے۔ مجھے آپ کے کام رفتاری ہوگی۔“

”آپ کی اتنی ہی مدد کافی ہے کہ آپ کے ذریعے مجھے ملازمت مل جائے گی۔ میں پہنچتی کہ آپ روپے پیسے سے مدد کریں اور میری غربت کا مذاق اڑائیں۔“

مرد کو کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ بس آکر رک گئی تھی۔ لڑکی آگے بڑھ گئی۔ جب چلے گی تو اس نے بس کے پائیدان پر کھڑے ہو کر اسے دیکھا۔ مراد سے نگاہیں بندھی پھر اس نے پلکیں جھکا لیں۔ وہ ذرا دیر کی بات تھی۔ اس کے بعد بس اسے لے لے کر چلی گئی۔

وہ ایک جیسی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ اس نے شہناز کی طرف

سے اپنے خیالات موڑ لئے تھے۔ اب وہ سانولی سلونی دوشیزہ اس کی سوچ پر حاوی ہو گئی تھی۔ جوانی بھی کیا چیز ہوتی ہے آپ ہی آپ حوا کی بیٹیوں پر مائل ہو گئی رہتی ہے بڑھاپے میں اس نے صرف دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے جوانی کی تمنا کی تھی۔ غرض کہ اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ جوان ہوتے ہی حسینوں کے لئے دل چھلنے لگے گا اور نئے بیزردم میں آکر پیکٹ کو کھولا اور اس میں سے بوڑھے آدمی کا جسم نکال کر آگ دان میں رکھ دیا۔ اس آتش دان میں آگ نہیں جلائی جاتی تھی۔ وہ محض دیکھ بھال کے طور پر بنایا گیا تھا۔ وہ پتلے کے سامنے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا جھکی ہوئی کمر ہاتھ رکھے دوسرے ہاتھ سے سلام کر رہا تھا۔ مراد نے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے بڑے سے کہا۔

”باباجی! بڑھاپے کو سات سلام..... میں روزانہ صبح و شام تمہارے پاس آ کر بیٹھوں گا۔ تمہیں دیکھ کر اپنے اس بڑھاپے کو یاد کروں گا جو سیریا کسی غلطی سے بچ کر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں گا اور موت سے بھی زیادہ بھیاں بڑھاپے یاد کرتا رہوں گا۔ اس جوانی میں کسی کو اپنا دشمن نہیں بننا پڑے گا۔ کوئی سیرا دشمن نہیں رہا تو پھر کوئی بھی مجھے خنجر سے یا کسی آتشیں اسلحے سے یا زہر دے کر ہلاک نہیں کرے گا اس طرح میں سدا جوان رہوں گا۔ اس لئے اسے بڑھاپے! تجھے سات سلام.....“

وہ دیر تک بوڑھے پتلے کے سامنے بیٹھا بڑھاپے سے ڈرتا رہا اور موجودہ جوانی کو کوئی غلطی نہ کرنے کا عہد کرتا رہا۔ پھر اس کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں ایک ایک کمرے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کیا حسین عورتوں سے دوستی کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہاں، حسین عورتیں بھی خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ وہ اگر کسی حسینہ کو اس کی مرضی کے خلاف حاصل کرنے لگتا ہے تو نقصان پہنچائے گا تب وہ اس کی دشمن بن جائے گی اور اگر دونوں طرف سے نکاح کے بغیر ہی ”قبول ہے“ کی رضامندی ہوگی تو پھر دوشیزہ کا وہاں پیدا نہیں ہوتا۔“

سوچتے وقت وہ سانولی سلونی لڑکی نیا لوں میں آگئی۔ اس نے اپنی ہی کوٹھی پر اسے دیا تھا۔ ارادہ تھا کہ اسے اپنے گھر کی دیکھ بھال اور کھانے پکانے کے لئے ملازمہ رکھنے لگا۔ ملازمت کے دوران اگر وہ اس کی طرف مائل ہو گئی تو اچھی بات ہے۔ ورنہ

ابا کمزور سی لڑکی کو بھی دشمن نہیں بنائے گا۔ بڑی شرافت سے اس کے کام آتا رہے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس لڑکی کی موجودگی میں بوزھے پتنے کے سامنے بیٹھ کر اس طرح بڑھاپے کو یاد کرے گا؟ یاد نہیں کرے گا تو پھر جوانی کے غرور میں جھٹکا ہو جائے گا اور اگر لڑکی نے اسے دیکھ لیا تو اسے پتنے کے سامنے بیٹھنے اور بڑھانے والا پاگل سمجھے گی لہذا اس پتنے اور اپنی یادداشت تازہ رکھنے کے اس عمل کو اس لڑکی سے چھپانا ہو گا لیکن کس طرح؟

دو تدبیر سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد یہی سمجھ میں آیا کہ لڑکی کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دے گا جہاں بوزھے کا پتلا رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف کھانا پکائے گی اور دوسرے کمروں کو صاف ستھرا رکھے گی مگر اس کمرے میں نہیں جائے گی۔ وہ کمرے کے دروازے کو ہمیشہ مقفل رکھے گا۔

لیکن ایک قبست تھی۔ انسان کو کہیں جانے سے روکا جائے یا اس سے کچھ چھپایا جائے تو اس کے دل میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔ وہ لڑکی بھی پوچھے گی کہ کمرہ بند کیوں رہتا ہے۔ اگر نہیں پوچھے گی تو اس کے دماغ میں یہ سوال پکنا رہے گا۔ وہ اپنی سہیلی سے تذکرہ کرے گی پھر اس کی سہیلی اپنے ملنے والوں سے اس کا ذکر کرے گی۔ بات پھیلتی جائے گی اور وہ بند کمرہ دنیا والوں کے لئے پُر اصرار بن جائے گا۔

بڑی مشکل آپڑی تھی۔ اس کی نئی جوانی کا تقاضا تھا کہ وہ سانونی تیکھے نقوش والی "ٹیزو آنش" میں آئے اور بڑھاپا کہتا تھا "اے نادان! جوانی کی مستیوں میں بڑھاپے کو نہ بھول..... اس بوزھے پتنے کو صبح و شام سامنے رکھا کر اور یہ سوچتا رہ کہ تو بند کمرے میں عبادت کر رہا ہے۔ ایک ایسی عبادت کر رہا ہے جو تجھے بڑھاپے سے ڈراتی ہے اور خالی کی لغزشوں سے بچاتی ہے۔ اپنی موجودہ جوانی کو پائیدار بنانے کے لئے بند کمرے کی ہولت دغا کے تمام کاموں سے زیادہ ضروری ہے۔

"ہاں" یہ عبادت اتنی ضروری ہے کہ اس کی اہمیت کے پیش نظر دنیا کی تمام لڑکیوں کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ وہ لڑکی میرے ہاں کام کرنے نہ آئے بلکہ کوئی اس کو خفیہ مقرر نہ رکھے۔ تب ہی میں اطمینان سے اپنے بڑھاپے کو یاد کرتا رہوں گا۔"

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی کو خفیہ میں کسی کو نہیں آئے دے گا۔ اس نے مطمئن ہو کر ایک سنگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ اس کے کش لگانے لگا۔ کو خفیہ کے احاسلے کے باہر

لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ان میں جوان اور حسین عورتیں بھی تھیں۔ ان کے چلتے پھرتے اور پچلتے بدن دیکھ کر اس کے اندر پھر انگڑائی ابھرنے لگی۔ جوانی کے نقائص اٹھانے لگے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے لگی کہ وقت اور جوانی کے تقاضے پورے نہ کیے بغیر زندگی سکون سے نہیں گزر سکتی لیکن ان کی تکمیل اس طرح ہو کہ اس نئی جوانی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ایسی حسین عورت کا ساتھ ہو کہ دو وقتی طور پر آئے اور پھر کوئی احسان جتائے بغیر اس کی زندگی سے نکل جائے۔ محبت کا لہا کھیل نہ کھیلے۔ ایسی عورت تو دنیا ہوتی ہے جو اپنی قیمت وصول کرتی اور صبح چلی جاتی ہے..... تب اسے گلابو یاوا آتی۔ وہ تمام دن موچنے سمجھنے..... اور بڑھاپے کے اندیشوں میں گزر گیا۔

رات آئی تو گناہ کا بازار سجے لگا۔ گھنگھروں کی جھنکار سے تمام کوٹھوں کے در و دیوار گونجنے لگے۔ تماشا بین اپنی اپنی جیب کا وزن دیکھ کر سستی اور مٹکی طوائفوں کے در تک پہنچ رہے تھے۔ وہ بوڑھا اپنی کمر جھکائے اس بازار کی رونق دیکھتا ہوا گلابو کے کٹھے کی طرف جارہا تھا۔

اُسی رات کے بعد جب نوٹ اچھالنے والے تماش بینوں کی جیسیں غلطی ہو گئیں تو گلابو نے پاؤں کے گھنگھرو کھول دیئے۔ تماش بین ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف ایک گاہک وہ گیا۔ وہ گلابو کی ماں کے سامنے ایک ہزار روپیہ پیش کرتے ہوئے اس کی بیٹی کی ایک رات خریدنا چاہتا تھا۔ اسی وقت گلابو کی نظر دروازے پر گئی۔ وہاں وہ بوڑھا کر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ جو صرف اس کے زانو پر سر رکھ کر مومن کی قیمت چند روپے دے رہا تھا۔ چند روز پہلے گلابو نے اسے بھیک منگوں کی حالت میں دیکھا تھا اور اسے دھکا کر آگے بڑھ گئی تھی لیکن اس وقت وہ بوڑھا نہایت ہی قیمتی موٹ میں نظر آ رہا تھا۔ گلابو کو اس لئے چپ لگ گئی کہ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک بھاری گڈی بھی نظر آ رہی تھی وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”گلابو! اگر تمہاری یادداشت اچھی ہے تو مجھے پہچانو۔ میں تمہارا وہی پرانا حاشق ہوں جس نے تمہاری جوانی کا کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔ صرف تمہارے زانو پر سر رکھ کر اپنی جوانی کی یاد تازہ کیا کرتا تھا۔“

گلابو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک قاتل ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آجے مرلا صاحب! آپ تو ایسے مہربان ہیں گد میں آپ کو کبھی بھلا نہیں سکتی۔ میں آپ کی سبزی ہوں۔“

آئیے تشریف لائیے۔“

گلابو کی ماں نے کہا۔ ”بیٹی! تم مراو صاحب کو خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ میں نے تو ہاں صاحب سے ہزار روپے لئے ہیں۔“

”آپ خان صاحب کے پیسے واپس کر دیں۔“ گلابو نے جواب دیا۔ ”میں مراو صاحب کی خاطر ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔“

وجہ پتلے سے خان صاحب نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”گلابو! تم میری توہین کر رہی ہو۔ اس بوڑھے کے ہاتھوں میں نوٹوں کی بھاری گڈی دیکھ کر تم میری رقم واپس کر رہی ہو۔ میں اس سے دو گنی رقم تمہیں دوں گا۔“

گلابو نے اشارے سے ماں کو ایک طرف بلا دیا اور سرگوشی میں کہا۔

”ماں جی! کیا تجھے یاد نہیں رہتا۔ میں بتا چکی ہوں کہ یہ بوڑھا واقعی بوڑھا ہے یہ صرف میرے زانو پر سر رکھ کر موتا ہے اور اس کے بدلے چند روپے دیتا ہے۔ اب تم ہی سوچو جب بھی یہ آتا ہے میری جوانی خرچ نہیں ہوتی اور مفت میں اتنی بڑی رقم ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسا صورت میں کوئی جوان گاہک دو گنی رقم ادا کرے، تب بھی میں اس بوڑھے سے سودا کروں گی۔“

بیٹی کی بات ماں کی سمجھ میں آگئی۔ دو خاں صاحب کے پاس آکر بولی۔ ”معاف کیجئے گا خاں صاحب! میری بیٹی مراو صاحب کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے۔ میری بات ہی نہیں آتی اور میں اس سوے پر زبردستی اسے راضی نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔“

تھوڑی دیر کی بحث و تکرار کے بعد خاں صاحب کو واپس جانا پڑا۔ اس کے جانے کے بعد گلابو نے مرنے والے انداز میں مسکراتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اس کی اکڑ پائیں فضا میں بلند ہو کر کمان بن گئیں۔ بدن ایسے کھینچ گیا کہ تمام نشیب و فراز گلابو کو پکارتے لگے۔ مراو کے سارے قیامت انگڑائی نے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی خواب گاہ کی طرف ہانے لگی۔ خواب گاہ میں پہنچ کر گئے ہوئے انداز میں بستر پر گرتی ہوئی بولی۔

”ہائے میرا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اگر آپ جیسے صرف مرنے والے عاشق ملتے ہیں تو میں یہ کھنگھڑا باندھ کر ناپنے والا دھندہ کبھی نہ کروں۔“

وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے بدن کو توڑنے موڑنے لگی۔ مراد کی نگاہوں کے سامنے ہر بل کھا رہی تھی۔ شباب کی چڑھتی ہوئی ندی لہ لہا بھر رہی تھی اور لہ لہا ڈوب رہی تھی۔ اس نے بوڑھے مراد کو دیکھ کر ہنستے اور کھکھکاتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔ آپ جب بھی آتے ہیں لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جو میری جوانی ہے اور جوانی کی حرکتیں ہیں، یہ سب ہاتھی کے وانت ہیں۔ آپ کو دکھانے کے لئے ہیں، کھانے کے لئے نہیں۔ آج میں بہت تھک گئی ہوں آپ میرے زانو پر سر رکھیں۔ یہاں آکر میرے بازو پر سر رکھ کے بہ جائیں میں آپ کو تھپک تھپک کر سلا دوں گی۔“

وہ جھکی جھکی کمر سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پاس آکر اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ تب گلابو کو احساس ہوا کہ بوڑھے میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ پہلے اس کا بوڑھا بدن سرو ہوتا تھا مگر اب اس کے جسم سے ایسی حرارت پھوٹ رہی تھی جو جوان لبو میں بوڑھی ہے اور سروی کی راتوں میں دوسروں کو بھی گرما دیتی ہے۔

چونکہ وہ موسم سرما کی رات تھی لہذا گلابو کو پہلی بار ایک بوڑھے کی قیمت ناگوار نہیں گزری۔ اس نے بالکل قریب ہو کر مذاق اڑانے کے انداز میں پوچھا۔

”کیا آج کل آپ معجون وغیرہ کھاتے ہیں یا انگارے چباتے ہیں؟“

مراد نے جواب دیا۔ ”اگر مردہ گوشت کو برابر آگ پر رکھا جائے تو وہ پک جاتا ہے۔ میرا بڑھاپا بھی تمہارے زانو پر سر رکھتے رکھتے پک گیا ہے۔ یہ تمہارا ہی پکا ہوا بھل ہے تم ہی کھاؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے پہلی بار اس دیکھتے ہوئے شباب کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ گلابو ایک دم سے بوکھلا گئی۔ لوگ تو زمانہ شناس ہوتے ہیں، وہ مرد شناس تھی لیکن ایسی مردانہ اور مضبوط گرفت میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ میں سمجھ نہ سکی کہ اس بوڑھے میں کیسا انقلاب آیا ہے اور وہ تھا کہ انقلاب لائے جا رہا تھا۔ ایک زبردست ہاکر کی طرح لڑنے کا انداز بدل کر ہونٹوں پر ہونٹوں سے چیچنگ کر رہا تھا۔ جذبات کے لطف کے برسا رہا تھا۔ گلابو بھی آپ ہی آپ خارم میں آگئی۔ وہ بے اختیار مقابلے پر ڈٹ گئی۔ پہلے راؤنڈ میں بڑی ثابت قدمی سے جی رہی۔ دوسرے راؤنڈ میں وہ گھبرا کر بولی۔

”آپ تو صرف زانو پر سر رکھ کر سونے کے لئے آئے ہیں؟“



”وہ زانو پر سر رکھ کر سونے والا بوڑھا اسی دن مر گیا تھا جس دن تم نے اسے دلال مانتا تھا۔ وہ دلال بن کر تمہارے کتنے کے مطابق اپنے بیٹے کو تو نہ لاسکا مگر اس کی جوانی لے آیا ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے اور مجھے اس دلالی کا کمیشن ملنا چاہئے۔“

تیسرا رازنڈ ختم ہوتے ہی وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ مراد نے کہا۔

”چند روز پہلے میں ایک خستہ حال بوڑھا تھا۔ میری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ مائے تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر صرف ایک ہار تمہارے زانو پر سر رکھ کر سونے کی ہتھی تھی۔ کیا میرے ہاتھ جوڑنے سے تمہیں رحم آگیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کہے رحم آسکا ہے۔ میں نے پورے پندرہ سو روپے دیئے ہیں کم از کم پندرہ رازنڈ تو ہونے پائیں۔“

وہ پندرہ کی گنتی سنتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ وہ بڑی بہانے باز تھی۔ بے ہوش ہونے کی بڑی کامیاب ایکننگ کی تھی کیونکہ اسی میں اس کی سلامتی تھی۔ اس کا تجربہ تھا کہ یہ دنیا کی داحد باکسنگ ہے جس میں مولزٹے لڑتے خووی تاک آؤٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بوڑھے باکسر کا انداز ہتار ہا تھا کہ وہ کبھی تاک آؤٹ نہیں ہوگا خواہ کتنے ہی رازنڈ ہو جائیں لہذا اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر بیچھا چھڑا لیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی چیخ سن کر اس کے دلال اور غنڈے خواب گاہ کے دروازے پر آکر دستک دینے لگے۔

مراد چاہتا تو ایک ایک غنڈے کو مار کر وہاں سلا دیتا مگر اس کے باغ میں خطرے کی گھنٹی بجے لگی۔ نئے وٹمن پیدا ہونے کے آثار نظر آ گئے تھے۔ اسے اپنی جوانی عزیز تھی۔ دھاپے کو دور سے سات سلام کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرے۔ اس نے گلابو کو جھنجھوڑ کر کہا۔

”اٹھو! میں جانتا ہوں کہ تم بے ہوش نہیں ہو۔ چلو اب اٹھ جاؤ اپنے غنڈوں کو گڈو میں خاموشی سے پہلا جاؤں گا اور آئندہ کبھی اوھر کا رخ نہیں کروں گا۔“

گڈو اٹھ گئی۔ اس نے لباس پہن کر دروازہ کھولا اور اپنے غنڈوں کو سمجھا دیا کہ نالوڑھے سے کچھ نہ کہیں۔ اسے چپ چاپ جانے کی اجازت دے دیں۔ بڑی آسانی سے اس کا راستہ صاف ہو گیا۔ وہاں سے سر جھکا کر آتے دقت اسے اپنی توہین کا احساس دے گا کہ ایسی جوانی کا کیا فائدہ؟ ہر کوئیس جیسی قوت رکھنے کے باوجود وہ دو کوڑی کے تھلے سے خوفزدہ ہو کر چلا آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے دل کو سمجھایا کہ مجبوری

ہے بڑی مجبوری ہے وہ اسی طرح بڑھا ہے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہی کیا کم تھا کہ اپنے دشمنوں سے حتیٰ کہ گلابو سے کسی نہ کسی طرح انتقام لے چکا تھا۔ دوسری صبح وہ اب تک سوتا رہا۔ کل بیل کی مسلسل آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیڑیوں سے باہر آکر بیرونی دروازے کو کھولا تو سامنے وہ سانولی سلونی سی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ بجیل رات سے وہ اسے بھول چکا تھا۔ اس نے تو فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس گھر میں کسی کو داخل نہیں ہونے دے گا لیکن اچانک ہی اسے سامنے دیکھ کر اس کی غمت اور مجبوریوں پر آگئیں۔ وہ بڑی امیدیں لے کر اور ایک اچھی تنخواہ ایک بہتر مستقبل کے خواب سے رہاں آئی تھی۔ وہ انکار نہ کر سکا۔ اسے اندر بلا لیا۔

لڑکی نے کونھی میں گہری خاموشی دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا آپ یہاں تنہا رہتے ہیں۔“  
 ”ہاں۔ تنہا ہی سمجھو۔ میں چاہتا ہوں تم میرے لئے کھانا پکاؤ اور میرے گھر کی دیکو بھال کرو۔ صبح نو دس بجے آیا کرو اور شام کو چلی جایا کرو۔“  
 وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں تنہا کیسے کام کر سکتی ہوں۔ یہاں تو آپ کی فیملی نہیں ہے۔“

”تمہیں میری فیملی کی ضرورت ہے یا ملازمت کی؟“  
 لڑکی نے بڑی بڑی کٹورہ جیسی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا لیکن اس سے نظریں نہ ملا سکی۔ مراد نے اس کی ہچکچاہٹ کو سمجھتے ہوئے کہا۔  
 ”دوینا دالوں سے ڈر کر اس ملازمت کو ٹھکراؤ گی تو اس سے بہتر ملازمت اور کمزور نہیں ملے گی۔ میں تمہیں کھانے پینے کے علاوہ چھ سو روپے ماہوار دیا کروں گا۔“  
 لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا اور حیرانی اور بے یقینی سے اس مہربان کامنہ سننے لگی۔  
 ”تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چولے ہانڈی کے کام میں چھ سو روپے ماہوار مل سکتے ہیں۔“

مراد اسے بڑی لگن سے دیکھ رہا تھا۔ اس سانولی لڑکی کے چہرے کے نقوش اتنے دلکش تھے اور اس کا سراپا اتنا جاذب نظر تھا کہ اب وہ اسے ہاتھ سے نہیں جالے دینا چاہتا تھا۔ اس کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اپنی سہیلی سے قرض لے کر کس طرح زندگی گزار رہی ہو۔ پتہ نہیں تم کس قدر قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہو لہذا اب تک وہ قرض نہ اتر جائے۔“

میں ہمیں ایک ہزار روپے ماہوار دیا کروں گا۔“  
 لڑکی کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی ایک ہزار روپے  
 من کر نہیں دیکھے تھے۔ وہ فوراً ہی اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر بولی۔  
 ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ میں دن رات آپ کی خدمت  
 کروں گی۔ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“  
 ”کل تمہارے حالات سن کر مجھے تم سے گہری ہمدردی بلکہ گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ تم  
 میرا کام کیا کرو، میں تمہارے کام آیا کروں گا۔ اب تم باورچی خانے میں باؤ۔ کچان کے  
 لئے جتنی چیزوں کی ضرورت ہے، ان کی فہرست تیار کرو اور بازار سے جا کر لے آؤ۔ میں  
 اپنی منزل کے اس کمرے سے ابھی آتا ہوں۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“  
 ”زیلخا۔“ لڑکی نے اپنا نام بتایا۔

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”عجیب اتفاق ہے۔ تمہارا نام زیلخا ہے اور میرا نام یوسف۔ یہ  
 ہم مدیوں سے ایک ساتھ سنے جاتے ہیں۔“  
 بات ایسی معنی خیز تھی کہ لڑکی کا دل اچانک ہی دھڑکنے لگا۔ نظریں حیا سے جھک  
 گئیں۔ پہلے اس نے دوپٹے کو سنبھالا، پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی باورچی خانے کی  
 طرف چلی گئی۔

مراد زینے طے کرتا ہوا اس کمرے میں آیا جہاں اس بوڑھے کا پتلا رکھا ہوا تھا۔  
 دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد وہ پتلے کے سامنے فرش پر پاتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر  
 ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”باباجی! بڑھاپے کو سات سلام۔ کل میں نے دوبار تمہارے سامنے آکر بڑھاپے کو  
 ادا کیا جس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ میں جوانی کے غرور میں مبتلا نہیں ہوا اور نہایت ہی  
 ناشتہ سے کام لے کر میں نے گلابو کے غنڈوں سے جھگڑا نہیں کیا۔ اس طرح میں نے  
 سن و شن نہیں بنائے۔ واقعی یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ اب میں صبح و شام بلاناغہ تمہارے  
 بن کر بیٹھوں گا اور تمہیں دیکھ کر اپنے بڑھاپے کو یاد کرتا رہوں گا۔“

لیکن باباجی! ابھی پھر مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ میری یہ جوانی اتنی نادان ہے کہ  
 اب زیلخا کے لئے چل رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھے تمہارے پاس بیٹھے دیکھ کر اور  
 ممکنہ یہ باتیں سن کر میرے متعلق کیسا سوچے گی۔ میں اسے اپنا رازدار بنا کر یہ نہیں بتا سکتا

کہ میری اس جوانی کی کسی گہری تہ میں میرا بڑھاپا چھپا ہوا ہے اور میں معجزانہ طور پر جوان ہو گیا ہوں۔ کسی کی بھی دشمنی مجھے بوڑھا بنا سکتی ہے۔ لہذا دنیا والوں کی دشمنی سے بچنے کے لئے دوسرے لفظوں میں جوانی کے غرور سے توبہ کرنے کے لئے میں تمہارے سامنے آکر بڑھاپے کو یاد کرتا ہوں۔

یہ باتیں میں زلیخا کو نہیں بتا سکتا اور نہ ہی یہ باتیں اس کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ پھر یہ کہ زلیخا جیسی کتنی ہی طرح دار لڑکیاں میری زندگی میں آئیں گی۔ میں سب کو اپنا راز دار نہیں بنا سکتا۔ بہتر ہے کہ میں زلیخا کو اس کمرے سے دور رکھوں۔.....

اس کی باتیں ادھوری رہ گئیں۔ دروازے پر دستک کے ساتھ زلیخا کی آواز نہ

دی۔

”یوسف صاحب! کیا آپ اس کمرے میں ہیں؟“

یوسف نے پتلے سے کہا۔ ”باباجی! زلیخا اس کمرے کے دروازے تک آگئی ہے۔ اب مجھے باہر جا کر کوئی بات بھانا ہوگی۔“ پھر اس نے ادھنی آواز میں کہا۔ ”زلیخا! تم نیچے جاؤ میں ابھی آ رہا ہوں۔“

وہ بند دروازے کے پاس آکر اور دروازے سے کان لگا کر..... آہٹ محسوس کوشش کرنے لگا۔ قدموں کی آواز سے پتہ چلا کہ وہ زینے سے اترتی ہوئی نیچے جا رہی ہے۔ وہ..... تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ ایسی کیا بات بنائے کہ زلیخا اس کمرے سے دور رہا کرے۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد وہ باہر آیا اور دروازے کو مقفل کر کے نیچے اترنے لگا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں زلیخانے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”آپ کمرے میں کس سے باتیں کر رہے تھے۔ کیا آپ کے علاوہ کوئی اور صاحب بھی یہاں رہتے ہیں؟“

مراد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک سرو آہ بھر کر جواب دیا۔

”ہاں۔ اس کمرے میں میرا بوڑھا باپ ہے۔ وہ میرے علاوہ کسی سے بہت نیر کر تکہ اپنے کمرے میں نہ کسی کو آنے کی اجازت دیتا ہے نہ کسی کی موجودگی میں کمرے سے باہر آتا ہے۔“

زلیخانے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ کے والد ایسی تما ز زندگی کیوں گزارتے ہیں؟“

”اس لئے کہ وہ بد مزاج بھی ہیں اور بد صورت بھی۔ ان کا چہرہ اتنا بھیانک ہے

شیطان کا بھی کیا ہو گا۔“

”عجب ہے کہ آپ اپنے والد کو شیطان کہہ رہے ہیں۔“

”شیطان اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ بوڑھا میرا سوتیلا باپ ہے۔ وہ بیمار پڑا ہوا ہے

اور میں سچا وں رات اس کی خدمت کرتا رہتا ہوں۔“

زیلخانے کہا۔ ”پھر تو آپ قابل تعریف ہیں۔ آج کل گئے بیٹے بھی بوڑھے باپ کی خدمت نہیں کرتے اور آپ تو ایسے بوڑھے کی خدمت کر رہے ہیں جو رشتے میں سوتیلا ہونے کے علاوہ بد مزاج اور بد صورت بھی ہے۔“

”مجبوری ہے۔ میں وسا مانگتا ہوں کہ مرحائے لیکن وہ مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بہر حال میں ابھی غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔ پھر ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے تہمارے ساتھ بازار جاؤں گا۔ تم اس بوڑھے کے کمرے کی طرف مت جانا۔ وہ دروازہ قفل ہے۔ پھر یہ کہ وہ بوڑھا تمہاری آواز سن کر ناراض ہو رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس گھر میں کوئی آئے مگر تم ہی سوچو مجھے بھی تو آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی لڑکی ہو جو مجھ سے باتیں کرے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلائے اور میرے آرام کا خیال رکھے۔ تم یہ کی پوری کرنے آگئی ہو۔ کیا میں تمہاری توجہ کا مستحق نہیں ہوں؟“

”ہاں۔ میں پوری توجہ سے آپ کے آرام کا خیال رکھوں گی۔ مجھے اس بوڑھے سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ آپ میرے محسن ہیں۔ جو آپ کو پریشان کرے گا میں اسے دشمن سمجھوں گی۔“

مراد نے اسے مسکرا کر کر دیکھا۔ پھر غسل کرنے چلا گیا اور زیلخانہ صوفے پر بیٹھی اس کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ اتنی ہی دیر میں مراد کے دکھ سکھ کی شریک ہو گئی تھی اور مراد کا خواہش کے مطابق اس کے بوڑھے باپ کی موت کی دعا مانگ رہی تھی۔

پھر اسی طرح مراد سے ہمدردی کرنے میں دن گزرنے لگے۔ اس نے کونسی کا سارا ام مصل لیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح چلی آتی تھی اور تینوں وقت کا کھانا پکاتی تھی۔ مراد اسے اپنے ساتھ بیٹھ کر کھانے پر مجبور کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان بے تکلفی بڑھتی آ رہی تھی۔ وہ زیلخانہ کو محض دکھانے کے لئے اپنے بوڑھے سوتیلے باپ کے پاس تینوں وقت کھانے کی ٹرے لے جاتا تھا۔ دروازے کو اندر سے بند کرتا تھا۔ پھر بوڑھے پتلے کے

سامنے ٹرے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ واپسی پر زلیخا کو یہ بھی دکھانا لازمی تھا کہ بوڑھے نے کھانا کھالیا ہے۔ لہذا وہ پتلے کے سامنے بیٹھ کر سوتیلے باپ کے جیسے کا کھانا کھاتا تھا اور پڑھنے کو یاد کرتا تھا چونکہ ہر کوئیس کی جوانی تھی اس لئے ذہل خوراک ہضم کر لیتا تھا۔

اب زلیخا کے بدن پر عمدہ لباس نظر آتے۔ وہ اپنے یوسف کے لئے بنے سنورے لگی تھی۔ مراد نے اسے اتنی رقم دی تھی کہ اس کے تمام قرضے ادا ہو گئے تھے۔ یوسف سے اچھا سا تھی اسے اور کہاں ملے۔ اس لئے اب وہ محض اپنی اور یوسف کی مسرتوں کے لئے سوچتی رہتی تھی۔ ایسے وقت اس کا بوڑھا سوتیلادشمن باپ یاد آ جاتا تو اس کا پی پٹا کہ اس بند کمرے میں جائے اور اس بوڑھے کا گلا ابا ڈالے۔

ایک شام سرادلے چار محبت کی باتیں کرتے کرتے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ زلیخا نے اعتراض نہیں کیا۔ بہت دنوں کے بعد مراد کی مرادیں پوری ہوئی نظر آئیں تو اس نے ساولی سلوٹی کنواری محبوبہ کے کنوارے لبوں کو چوم کر کہا۔

”آج رات یہاں رہ جاؤ۔ ہم ٹائٹ شو دیکھنے جائیں گے۔“

زلیخا نے کہا۔ ”تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ پھر مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

مراد نے جواب دیا۔ ”میرا وہ بوڑھا باپ..... مجھے اپنی زندگی میں شادی نہیں کرنے دے گا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میری مرحوم ماں کی جائیداد کے تمام کاغذات اس کے نام ہیں وہ مرے گا تو تمام جائیداد میری ہو جائے گی۔ اگر میں نے اس کی زندگی میں مخالفت کی اور تم سے شادی کر لی تو وہ کسی دوسرے کو جائیداد کا حقدار بنا دے گا۔ انا لئے ذرا صبر کرو۔ اللہ نے چاہا تو بوڑھا جلد ہی مرے گا۔“

زلیخا نے چڑ کر کہا۔ ”وہ خبیث کبھی نہیں مرے گا۔ میرا مشورہ مانو اسے دوان نک بھوکا رکھو۔ وہ بڑی آسانی سے مر جائے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”تم اس بوڑھے کو اچھی طرح نہیں جانتی ہو۔ اگر اسے ایک دن بھی کھانا نہ ملا تو وہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالے گا۔ آس پاس کی کوٹیوں والے دانہ چلنے والے جمع ہو جائیں گے۔ یہ اچھی بات نہیں۔ ذرا صبر سے کام لو۔ یہ بوڑھا جلد ہی مرے گا۔ تم نورانی کھانا تیار کرو۔ ہم کھانا کھاتے ہی تفریح کے لئے باہر جائیں گے۔“

زلیخا باورچی خانے میں آکر کھانا تیار کرنے لگی۔ جب اپنی شادی اور ازدواجی زندگی کی خوشیاں بالکل سامنے ہوں تو عورت سے صبر نہیں ہوتا اور مراد نے اس سے کہا تھا۔

تو لیکن آج وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے والی تھی اور اس سے پہلے اپنی ازدواجی سروسوں کی ضمانت چاہتی تھی۔

کھانا تیار ہوا تو مراد نے بند کمرے کی طرف کھانے کی ٹرے لے جاتے ہوئے کہا۔  
”وقت کم ہے۔ ہم پچھر باؤس سے واپس آکر کھانا کھائیں گے لیکن اس بوڑھے کو

کھانا ضروری ہے۔ تم جب تک تیار ہو کر باہر نکلو میں آدھ گھنٹے کے اندر آ جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بند کمرے میں چلا گیا۔ زلیخا پندرہ منٹ کے بعد باہر سڑک پر آکر ٹیسی  
بیس کا انتظار کرنے لگی اور سوچنے لگی۔ ”عامانگنے سے یا کونے سے کوئی نہیں مرے گا۔

اس بوڑھے کی عمر شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔ میں اپنے آپ کو یوسف کے حوالے  
کر کے ایک طویل مدت تک اس بوڑھے کی موت کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ آج وہ

زہرلا کھانا اے ہمیشہ کے لئے ملا دے گا۔“

وہ سوچتی رہی اور انتظار کرتی رہی۔ بہت دیر تک نہ تو کوئی خالی ٹیکسی آئی اور نہ ہی

اس کا یوسف آیا۔ ہاں مگر ذرا دور فٹ پاتھ پر اندھیرے میں ایک بوڑھا کر جھکائے اور

کڑی زلیخا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ وہ اس نازک سی لڑکی کا

گل نہیں گھونٹ سکتا تھا اور اس کے بازو اتنے مضبوط نہیں تھے کہ وہ جوان محبوبہ کو آغوش

میں لے سکتا۔ اس لئے وہ حسرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور زلیخا انتظار کر رہی تھی۔

☆=====ختم شد=====☆